محمد اِدریس زُبیر

ایک تعارف، ایک تجزیہ

محمد اِدریس زُبیر

الہدیٰ

پبلی کیشنز

AL-HUDA PUBLICATIONS

نام کتاب ------------ فقہ اسلامی

مؤلف ------------ ڈاکٹر محمد ادریس زبیر

ناشر ------------ الھدیٰ پبلی کیشنز، اسلام آباد

ایڈیشن ------------ دوم

ISBN ------------ 978-969-8665-24-1

تعداد ------------ چھ ہزار

قیمت ------------

تاریخ طبع ------------ 11 شوال 1432ھ / 10 ستمبر 2011ء

ملنے کے پتے

اسلام آباد: 7 اے کے بروہی روڈ H-11/4 اسلام آباد پاکستان

فون: +92-51-4434615 +92-51-4436140-3

Email: salesoffice.isb@alhudapk.com

www.alhudapk.com www.farhathashmi.com

کراچی: 30 اے سندھی مسلم کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی پاکستان

فون: +92-21-34528548 +92-21-34528547

امریکہ: PO Box 2256 Keller TX 762 44

Ph: (817)-285-9450 (480)-234-8918

Email: alhudaonlinebooks@ymail.com

کینیڈا: 5671 McAdam Rd Mississauga Ontario L4Z IN9 Canada

Ph:(905)-624-2030 (647)-869-6679

www.alhudainstitute.ca

پبلی کیشنز

AL-HUDA PUBLICATIONS

فہرست مضامین

دوسرا باب تاریخ ومصادر

تیسرا باب فقہاء اربعہ

چوتھا باب فقھی تقسیم اور تناؤ

انتساب

اپنی شریک حیات کے نام
جنہوں نے اپنے فہم دین کی روش کو بغیر کسی تعصب یا تعلّی کے
قرآن اور سنت رسول ﷺ کے ساتھ وابستہ کرلیا۔

قال ابن سيرين رحمه اللّٰه:

إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ.

امام ابن سیرینؒ فرماتے ہیں:

بلاشبہ یہ علم، دین ہے پس دیکھا کرو کہ دین تم کس سے لے رہے ہو۔

عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ:
وَعَظَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مَوْعِظَةً ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُونُ، وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوبُ، قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ، إِنَّ هٰذِهِ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَمَا تَعْهَدُ إِلَيْنَا؟ فَقَالَ: قَدْ تَرَكْتُكُمْ عَلَى الْبَيْضَاءِ، لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا، لَا يَزِيغُ عَنْهَا بَعْدِي إِلَّا هَالِكٌ، وَمَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِي فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيرًا، فَعَلَيْكُمْ بِمَا عَرَفْتُمْ مِنْ سُنَّتِي، وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ، وَعَلَيْكُمْ بِالطَّاعَةِ وَإِنَّ عَبْدًا حَبَشِيًّا، وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ فَإِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ. اخرجه احمد: ۴/۱۲۶ سیدنا عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے: جناب رسالت مآب ﷺ نے ہمیں ایک ایسا وعظ ارشاد فرمایا کہ ہماری آنکھیں نم ہوگئیں اور دل پسیج سے گئے۔ ہم نے عرض کی: اللہ کے رسول! آپ ﷺ کا یہ وعظ الوداعی سا وعظ لگتا ہے۔ آپ ہم سے کیا توقع کر سکتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے تمہیں روشن شاہراہ پہ چلا دیا ہے جس کی تاریکی بھی اس کی روشنی کی مانند ہے۔ میرے بعد اگر کوئی اس راہ سے بھٹکا تو وہ خود ہی تباہ ہوگا۔ سنو! میرے بعد جو زندہ رہا وہ بہت سے اختلافات کو اپنے درمیان دیکھے گا۔ اس وقت تم لوگ میری اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی معروف سنت کو تھام لینا۔ اپنے آپ کو اطاعت امیر کا خوگر بنانا خواہ تمہارا وہ امیر حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ اطاعت کو اپنی ڈاڑھوں سے پکڑ لینا۔ اور ہاں اپنے آپ کو نئی نئی گھڑی نیکیوں سے بھی باز رکھنا اس لئے کہ ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے۔

پیش لفظ

فقہ اسلامی۔ فرقہ واریت سے پاک ایک ایسی فکر سلیم کا نام ہے جو قرآن وسنت رسول کی خالص تعلیمات میں سینچی گئی۔ جس نے زندہ مسائل کے استدلال، استنباط اور اجتہاد میں قرآن وسنتِ رسول کو اپنایا اور شرعی احکام کی تشریح وتعبیر میں ان دونوں کو ہی ہر حال میں ترجیح دی۔ یہ تعلیمات اللہ تعالیٰ کا ایسا عطیہ ہیں جو اپنے لطف وکرم سے کسی بھی بندے کو خیر کثیر کے طور پر وہ عطا کر دیتا ہے۔

فقہ اسلامی۔ اس علم کا نام ہے جو کتاب وسنت رسول سے سچی وابستگی کے بعد تقرب الٰہی کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔ یہ علم دھول وغبار کو اڑا کر ماحول کو صاف وشفاف بناتا ہے۔ اور بعض ایسے مبہم خیالات کا صفایا کرتا ہے جہاں بظاہر کچھ ہوتا ہے اور اندرون خانہ کچھ۔ روشنی کے ایسے در وبام کھولتا ہے جن میں ظلمت چھٹ جاتی ہے۔ جس کے ادراک کے بعد ضلالت یا نزاع کی کوئی شکل باقی نہیں رہتی۔

فقہ اسلامی۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی کے مباحث پر مشتمل ہے۔ اس کے فہم کے بعض نابغہ روزگار متخصصین ایسے بھی ہیں جن کے علم وفضل اور اجتہادات سے ایک دنیا مستفید ہوئی اور ہو رہی ہے۔ فقہ اسلامی ایک ایسا بہاؤ ہے جو زمان ومکان کی علمی وشرعی ضرورتوں کو پورا کرتا اور ذہنی تشویش کو دھوتا اور پاکیزہ کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے بہاؤ میں ٹھہراؤ نہیں اس لئے کہ ٹھہراؤ میں زندگی ہے نہ تازگی۔ یہ ایسا باغ ہے جو ہر موسم میں اپنے اشجار کو اگاتا اور اپنے لذیذ پھلوں سے اپنے چاہنے والوں کو لذت سے آشنا کرتا ہے۔ **عجب چیز ہے لذت آشنائی**۔ ہمارے ان فقہاء پر اللہ تعالیٰ اپنی خیر وبرکت نازل فرمائے جنھوں نے امت کو اس خیر سے آشنا کرایا اور خود بہت کچھ نوازا۔

مذہبی وفرقہ وارانہ رجحانات زندگی کے ہر سٹیج پر نمایاں ہیں۔ بلاشبہ ان میں تعصب وتشدد کے عناصر ہیں مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ ان بندگان خدا میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی کی گئی مخلصانہ کوششوں پر سوال کناں ہیں کہ یہ سب محنت، تحریک، دعوت وتحریر اور تعلیم وتدریس کے زاویے وحلقے کس مقصد کے لئے چلائے اور منعقد کئے جا رہے ہیں؟ کیا اپنی جماعت، اپنے گروہ یا شخصیت کے لئے؟ یا اللہ کے لئے؟ منصف ضمیر کے اس سوال پر جہاں یہ لوگ لڑکھڑاتے ہیں وہاں ان کے پاس ان سوالوں کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ خاموشی اختیار کی جائے یا اپنی ذہنی اڑان پر مزید پابندی لگا دی جائے۔

ہماری **فقہی تاریخ** میں سمرقند وبخارا اور بغداد کی خونیں تاریخ بھی ہے۔ کچھ تلخ حقائق بھی اپنے اندر یہ سموئے ہوئے

ہے اور جس کی کڑواہٹ ابھی تک بانٹی جاتی ہے۔ گو ان کی بنیادیں صدیوں پرانی ہیں مگر ماضی کی اٹھان نے اسے اب ایسا درخت بنا دیا ہے جو سوائے کڑوے کسیلے پھل دینے کے یا اپنے سائے سے دوسروں کو محروم کرنے کے یا اپنے بیج سے اپنی نسل کو باقی رکھنے کے کچھ نہیں کر پا رہا۔ یہ ایسی فضا ہے جس میں اپنوں کو ہی مخصوص تربیت دی جاتی ہے اور مخصوص سوچ کے ساتھ انہیں مارکیٹ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح علمی بحث وتحقیق غیر جانب داری اور حقیقت پسندی کی متقاضی ہوتی ہے لیکن اس موضوع میں بے شمار مثالیں ایسی موجود ہیں کہ علم وتحقیق کا قلم پاکیزگی سے ہٹ کر کسی اور جانب مڑ جاتا ہے جس میں معروضی شکل سے کم اور خاص غرض کے ساتھ وابستگی زیادہ نظر آتی ہے۔ اس تاریخ کو پڑھ کر ہم اپنے پیداشدہ حالات کا مخلصانہ جائزہ لے سکتے ہیں۔ جو متقاضی ہیں کہ مسلکی تعصبات کو خیر باد کہا جائے۔ امت مسلمہ بہت زخمی ہو چکی اپنے ہی اس پر کرم کر لیں تو اس پر بڑا احسان ہوگا۔ ہم اس دور کے تقاضوں کو سمجھیں۔ ہم اگر اپنے علمی سوتوں کو بند کریں گے تو ماضی پر رشک کرنا بے وقوفی ہوگا۔ اس لئے کہ حال، ماضی سے جڑ کر مستقبل بناتا ہے اگر حال ہی بدحال ہو تو ماضی پر فخر کاہے کا؟

رائج تاریخ فقہ کو اس کتاب میں بیان کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ آج کے معروضی حالات میں طالب علم کو جس فقہی منہج کی ضرورت ہے وہ وہی ہے جو جناب رسالت مآب ﷺ نے چھوڑا اور جس کے وارثوں نے اس منہج کو بحفاظت سنبھالا اور اس کی آبیاری کی۔ وہ منہج کیا تھا؟ سب جانتے ہیں آپ ﷺ کا چھوڑا ہوا منہج:

> تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِي۔ الحدیث۔ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ جب تک تم نے ان دونوں کو تھامے رکھا کبھی گمراہ نہیں ہو گے: ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری سنت۔

کتاب ہذا میں کوشش کی گئی ہے کہ رائج معنی سے ہٹ کر فقہ وتاریخ فقہ کا صحیح معنی ومفہوم متعین کیا جائے۔ اور وہ اثرات زائل کئے جائیں جو کسی بھی صورت میں فقہ کے معنی کو محدود کرتے یا مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں۔

اس میدان کے شہسوار کون ہیں؟ ان کی خصوصیات کیا ہیں؟ زبان رسالت نے علم اور اس کے درجات جس طرح واضح کئے ہیں ان کے بعد مزید کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

یہی وہ اسلامی فقہ ہے جس کی تلاش آج ہمارے لئے بھول بھلیوں کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اس کے برعکس رواجی فقہ اور اس کی تاریخ بظاہر واضح اور روشن ہے مگر اس کے حقائق دبیز پردوں میں مستور۔ جنہیں بغور پڑھنے

سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ دراصل مسالک و مذاہب کی تاریخ ہے اپنے فضائل اور ترجیحات کی تاریخ ہے۔ مسلک کی خدمت ومحنت تو اس تاریخ میں نظر آتی ہے مگر دین کی خدمت کہاں؟ لگتا یہی ہے کہ چوتھی صدی کے وقوف کے بعد ہم سعی نہیں کر سکے بلکہ جہاں کھڑے تھے آج بھی وہیں کھڑے ہیں۔ ہاں ان حضرات میں جو مخلص تھے ان کا تحریری وعملی سرمایہ ہمارے لئے نعمت عظمیٰ سے کم نہیں۔ اللہ ان پر اپنی رحمتوں کی برکھا برسائے۔ آمین۔

فقہ اسلامی کے اصل مصادر کون سے ہیں؟ اور ان کے تابع کون کون سے؟ ان کا مختصر تعارف بعض ضمنی مباحث کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

فقہ اسلامی کی تدوین عمومی انداز میں ہوئی اور اسے ہی پسند کیا گیا۔ یعنی مختلف فقہاء کی کاوشوں میں جہاں مخصوص ذہن کارفرما نظر نہ آیا اسے فقہ اسلامی نے اپنے اندر سمولیا مگر جہاں یہ رنگ غالب نظر آیا وہاں فقہ اسلامی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اس لئے کہ فقہ اسلامی وسعت کے اعتبار سے اپنا اونچا مقام رکھتی ہے وہ اپنے آپ کو محدود رکھنا تو کیا دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔ اس لئے اس میں ہر وہ مثبت کاوش شامل ہوئی جو فقہ اسلامی کو ذاتی سوچ اور مذہبی رجحانات سے پاک نظر آئی۔ فقیہ محترم کی ہر وہ رائے، اجتہاد یا استنباط وقیع حیثیت اختیار کر گیا جو کتاب وسنت اور مقاصد شریعت سے مطابقت رکھتا تھا۔ اس لئے کسی مجتہد کو عقل کل کا دعوی تھا نہ علم کلی کا۔ اور نہ ہی کسی کے بارے میں ایسی مبالغہ آرائی کا جواز ہے۔ فقہاء صحابہ ہوں یا فقہاء سبعہ، اسی طرح فقہاء اربعہ ہوں یا دیگر فقہاء ان سب نے بہ اخلاص اپنی اجتہادی کوششوں کو جاری وساری رکھا اس ضمن میں اگر کہیں علمی سہو، لاعلمی یا خطا کا علم ہوا بھی تو انہوں نے خود اصلاح کر لی یا ان کی جب اصلاح کی گئی تو ان کی متواضع طبیعت نے اپنی اس اصلاح کو رب ذوالجلال کے حضور شکرانہ ادا کر کے قبول کیا۔ اور امت کو ایک خاموش سبق بھی دے دیا کہ اس راہ کے مسافروں کا یہی چلن ہوا کرتا ہے: کہ

﴿وفوق کل ذی علم علیم﴾......... کہ دین میں ہر عالم سے بڑھ کر ایک عالم ہوا کرتا ہے۔

فتوی وافتاء بھی ایک موثر معاشرتی قوت وضرورت بن کر ابھرے جو سائل کی دینی تشفی کا سامان تھے اور عامۃ الناس کی شعوری بیداری کا ایک ذریعہ بھی۔ یہ منصب جلیلہ جسے حاصل ہوتا وہ طویل عرصہ کی مطالعاتی وتدریسی محنت ومشقت کا ذہنی ثمرہ ہوتا۔ اس میں ہر نووارد مفتی کی گنجائش ہوتی اور نہ ہی اپنی فقہ پڑھنے کے بعد اسے اس کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ علم ودلائل سے پختہ ان کے فتاوی جہاں جان رکھتے وہاں علماء وخواص بھی ان کے قدردان ہوتے۔ ان پر

عمل ہوتا اور عمل کروایا جاتا۔ جس کی وجہ افتاء وفتوی کی دینی، علمی وفقہی پختگی تھی۔

شریعت اور فقہ اسلامی کی تعریف ووضاحت کے لئے یہ چند صفحات طلبہ کی ذہنی بالیدگی کے لئے لکھے گئے ہیں تا کہ ان میں اپنی تاریخ اور فقہ اسلامی کی ہر دور میں ضرورت کا احساس جاگ سکے اور اصول فقہ کو بھی ضمناً سمجھ سکیں۔ کوشش ہماری یہی رہی ہے کہ اس موضوع کو قرآن وسنت کے ساتھ ہی منسلک رکھا جائے اور اسلامی فقہ کا وہ خالص انداز طلبہ کے سامنے لایا جائے جس پر چل کر امت مسلمہ خالص دین پر قائم ہو سکے اور تفرقہ وتعصب سے پرے بھی۔ اس منہج کو سنبھالا دینے کے لئے اس ارشاد رسول کو حرز جان بنانا ہوگا: کہ

إِنَّهُ مَنْ يَعِشْ مِنْ بَعْدِي..... میرے بعد جو جئے گا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ ایسی صورت میں میری جانی بوجھی سنت کو تھام لینا۔

ایسے حالات میں فقہ اسلامی کیا تقاضا کرتی ہے اور ایک بندہ خدا کو حد اعتدال پر لانے کے لئے کیا لائحہ عمل دیتی ہے۔ کچھ ایسے امکانات ابھی تک باقی ہیں جو مایوسی سے نکال کر امید کی روشن کرن فروزاں کرتے ہیں۔ کتاب کا آخری باب ان سوالوں کا جواب ہے۔

اس کتاب میں فقہی اصطلاحات، اور فقہی مواد کی ترتیب وتنظیم کو سہل انداز سے قابل فہم بنانے کی بھی کوشش کی گئی ہے اور استدلال میں قرآنی آیات وصحیح وحسن احادیث کو یا صحابہ کرام کے موثوق آثار کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ یہ بھی امید کرتے ہیں کہ طلبہ دین اپنی علمی اور فنی نصیحتوں کو بھی پیش کرنے میں بخل سے کام نہیں لیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں خیر کے تمام کاموں کو کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی رضا سے ہر طالب حق کو سرفراز فرمائے۔ آمین۔

کتاب کی تصنیف میں جن مصادر وماآخذ سے مدد لی گئی ہے ان کا چونکہ کتاب میں جابجا حوالہ دے دیا گیا ہے اس لئے الگ کتابی فہرست بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب اول

تعارف فقہ اسلامی

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّيْ عَلَى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ........أَمَّا بَعْدُ---

علوم بے شمار ہیں۔ یہ سبھی اللہ تعالیٰ کے ہاں عمدہ ومبارک ہو سکتے ہیں جب انسان ان سے خود فائدہ اٹھائے اور دوسروں کی دنیاوآخرت مفید بنا سکے۔اس لئے بنیادی طور پر علم کی دو اقسام ہیں۔علم دینوی وعلم شرعی۔

ا۔علم دنیوی: وہ علم جس کی ضرورت انسان کو اس دنیا میں پڑتی ہے جیسے علم ریاضیات، علم فلک، اور فزکس وغیرہ۔اس کی اہمیت دنیا میں ہے۔ دین وایمان متزلزل نہ ہو تو اسے سیکھنے کی ضرورت بھی ہے۔صرف نیت کی درستگی ضرور ہونی چاہئے۔اور بنیادی عقائد واعمال پر قائم رہتے ہوئے اس علم کا فائدہ آگے پہنچانا چاہئے۔ ایسا عمل باعث اجر وثواب ہے۔مگر جو اپنی ذات کے لئے اسے سیکھے وہ بھی گناہ گار نہیں۔

۲۔علم شرعی: یہ علم کتاب وسنت ہے جو بلاشبہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔آپ ﷺ کے ارشاد کا بھی یہی مقصود ہے۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ۔علم کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے۔

یہی انبیاء کی میراث ہے حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِيْنَارًا وَلَا دِرْهَمًا وَإِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ۔انبیاء کرام دینار و درہم نہیں بلکہ علم چھوڑ جاتے ہیں۔ جو بھی اسے حاصل کرتا ہے وہ بڑے نصیبے کو حاصل کرتا ہے۔

یہی توفیق ہی کافی ہے کہ آدمی اس راہ پر چل نکلے۔ جی ہاں جو اس راہ پر چلا وہ خوش قسمت ٹھہرا اور رب ذوالجلال کی رضا بھی اسے حاصل ہوئی۔ اپنی نیت کو خالص لوجہ اللہ کرتے ہوئے عمل بھی بجالائے اور اس پر قائم رہے تو یہی ﴿فقد أوتی خیرا کثیرا﴾ ہے۔طالب علم کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی شے باعث عزت نہیں۔ کیونکہ وہ ایسی راہ پر چل نکلا ہے جو صرف جنت کی طرف ہی جاتی ہے۔آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

مَنْ سَلَكَ طَرِيْقاً يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْماً سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ طَرِيْقاً إِلَى الْجَنَّةِ۔ جو ایسے راستے پر چلا جس سے وہ علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اللہ بھی اس کے لئے جنت کی طرف جانے والا راستہ آسان کر دیتا ہے۔

یہ فرق بھی محوظ رہے کہ جو اپنے آپ کو اس راہ میں کھپا تا ہے وہ اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے۔

﴿قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون﴾ ان سے کہئے کیا جو علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ (الزمر:۹)

استفہام انکاری ہے جس کا مطلب ہے کہ بالکل نہیں۔ جیسے زندہ و مردہ برابر نہیں ہو سکتے یا سننے والا اور بہرا اور بینا و نابینا برابر نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے اہل علم کا مقام اللہ عزوجل کے نزدیک بہت اونچا ہے:

﴿یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین أوتوا العلم درجات﴾ اللہ تعالیٰ تم میں اہل ایمان کے اور جو علم گئے ہیں ان کے درجات بلند کر دیتا ہے۔

ویسے بھی ہم غور کریں تو دنیا میں اہل علم ہی کی تعریف کی جاتی ہے۔ ان کی چھوڑی میراث کا ذکر خیر لوگ ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد کرتے رہتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ روز قیامت ان کے درجات دعوت الی اللہ اور صحیح علم کو پھیلانے میں اپنی اپنی کوشش کے مطابق جنت میں بھی بہت بلند ہوں گے۔

علم شرعی کے حصول کی چند شرائط:

اخلاص نیت: چونکہ علم تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے اس لئے متعلم کے لئے اخلاص نیت حصول علم کا پہلا زینہ ہے۔ خود راستی پر قائم رہے۔ مرغوبات دنیا اسے کھینچ نہ سکیں۔ اگر کوئی یہ بھی نیت کرلے کہ میں ڈگری پانے کے بعد اس سے اپنی آمدنی بھی حاصل کرنا چاہتا ہوں تو یہ معیوب بات نہیں۔ بلکہ اس کا حال اس حاجی کی طرح ہے جو فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے مکہ مکرمہ جا رہا ہو اور اثناء سفر میں تجارت کرلے جو بالاتفاق جائز ہے۔

﴿لیس علیکم جناح أن تبتغوا فضلاً﴾ تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم فضل تلاش کرو۔ (البقرۃ:۱۹۸)

وہ جب بھی شرعی علم کے دروس میں شریک ہو۔ یہ حدیث پیش نظر رکھے:

مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا يُبْتَغٰى بِهِ وَجْهَ اللّٰهِ ، لَا يَتَعَلَّمُهُ إِلَّا لِيُصِيْبَ مِنَ الدُّنْيَا، لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ جو اس علم کو سیکھتا ہے جس سے صرف اللہ کی رضا ہی حاصل کی جا سکے مگر یہ اسے اس لئے سیکھتا ہے تاکہ اس کے ذریعے سے دنیا بنائے ایسا شخص روز قیامت جنت کی خوشبو تک نہ پا سکے گا۔

علم کے ساتھ عمل: طالب علم کو چاہئے کہ وہ جو جانے یا سیکھے اس پر عمل بھی کرے۔ کیونکہ یہی علم کا ثمرہ ہے اور یہی تقرب الٰہی ہے۔ ورنہ سب بیکار ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ أَوْ عَلَيْكَ۔قرآن اگر اس کے مطابق عمل کیا یا تو تمہارے حق میں حجت ہے یا پھر عمل نہ کرنے کی صورت میں تمہارے خلاف حجت ہوگا۔

علم سیکھنے کا شوق اور دعائیں: طالب علم اپنے بھرپور شوق اور جستجو کا مظاہرہ کرے۔اگر کہیں کوئی بھی رکاوٹ پیش آئے تو اس کا حل تلاش کرے یا پھر رب کی بارگاہ میں دعا کرے۔امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

شَكَوتُ إِلَى وَكِيعٍ سُوءَ حِفْظِي فَأَوْصَانِي إِلَى تَرْكِ الْمَعَاصِي

میں نے وکیع سے اپنے برے حافظے کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے معاصی ترک کرنے کی نصیحت فرمائی

فَقَالَ الْعِلْمُ نُورٌ مِنْ إِلٰهٍ وَنُورُ اللّٰهِ لَا يُهْدَى لِعَاصِي

انہوں نے فرمایا کہ علم ایک خداداد نور ہوتا ہے اور یہ نور اللہ کے نافرمانوں کو نصیب نہیں ہوا کرتا۔

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جو بہ ارشاد رسول ﷺ حرام وحلال کے سب سے بڑے عالم ہیں اور روز قیامت امام وسید الفقہاء ہوں گے۔ان سے آخری وقت کہا گیا: آپ تو صحابی رسول ہیں اور آگے کی منزلیں بھی آپ کی آسان ہیں۔تو رونے لگ گئے۔کسی نے پوچھا: کیوں رو رہے ہیں؟ فرمانے لگے: میں آگے کی کامیابی پر نہیں بلکہ اس پر رو رہا ہوں کہ اب عمل کا موقع جا رہا ہے روزے، قیام اللیل اور مُزَاحَمَةُ الْعُلَمَاءِ بِالرُّكَبِ سواریوں پر علماء کے ہاں اژدحام کرنے کے سب مواقع ختم ہو رہے ہیں۔

امام ابن المبارک رحمہ اللہ کا آخری وقت جب آیا تو شاگردوں نے عرض کی کہ اگر آپ کو دوبارہ زندگی دے دی جائے تو آپ دنیا میں آکر کیا کریں گے؟ فرمانے لگے: ایسا اگر ہوا تو صرف دین سیکھنے ہی آؤں گا۔

امام ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے:

فَهْمُ الْعِلْمِ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِنْ حِفْظِهِ۔علم کا سمجھنا ہمیں زیادہ پسندیدہ ہے بہ نسبت اس کے یاد کرنے کے۔

یہی علم حکمت وخیر کثیر بھی کہلایا۔﴿ ومن يؤت الحكمة فقد أوتي خيرا كثيرا ﴾۔جسے حکمت عطا کی گئی وہ بلاشبہ خیر کثیر دے دیا گیا۔اس فقہ کا عطا ہونا بہت بڑی خیر ونعمت ہے:

آپ ﷺ سے بھی فرمایا گیا: ﴿وقل رب زدني علما﴾ اور آپ یہ دعا کیجئے: میرے مولا! میرا علم بڑھا۔(طہ:۱۱۴)

علی بن خشرم نے اپنے شیخ وکیع بن الجراح سے عرض کی کہ ذہن وحافظہ کی تیزی کا کوئی نسخہ بتایئے تاکہ میں اپنے حافظے کو اس طرح قوی کرسکوں جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا ہوا ہے کہ سولہ سال تک آپ نے کوئی کتاب ہی نہیں دیکھی۔فرمانے لگے: واقعی! اگر بتادوں تو وہ نسخہ استعمال کروگے؟ عرض کی: ضرور۔فرمایا: گناہ ترک کردو۔امام بخاری

رحمہ اللہ ہر روز دس پارے تہجد میں پڑھتے اور آخر میں ان کی دعا یہی ہوتی: میرے مولا! میرا علم بڑھا۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ عمر بھر یہ دعا کرتے رہے: يَا مُعَلِّمَ إِبْرَاهِيمَ ! عَلِّمْنِيْ اے ابراہیم کے معلم! مجھے بھی علم عطا فرما۔ وَيَا مُفَهِّمَ سُلَيْمَانَ ! فَهِّمْنِيْ اور اے سلیمان کو فہم عطا کرنے والے! مجھے بھی دین کا فہم عطا فرما۔

یہی علم، تقوی وصحیح فہم کے بغیر ہو تو اس کے نور کا حاصل ہونا بہت مشکل ہے۔ اور یہی علم اگرچہ کتنا ہی عالمانہ ہی کیوں نہ ہو۔ بے عملی اس کے نور کو بجھا دیتی ہے۔ اور اگر اس کا غیر مناسب استعمال غیر فقیہ بنا دیتا ہے۔ لوگ اسے جھٹک دیتے ہیں اور نہیں مانتے۔ غالباً اسی نامعقول استعمال کے بارے میں سیدنا عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا تھا: أَتُرِيْدُونَ أَنْ يُكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کا رسول جھٹلا دیئے جائیں؟ محدثین بھی یہی کہا کرتے: لاَ تَنْشُرْ بَزَّكَ إِلاَّ مَنْ يَبْغِيْهِ اپنے کپڑے کو صرف اس کے آگے پھیلاؤ جو اس کا ضرورت مند ہے۔ اس لئے اسلام، علم کو حجاب اکبر نہیں کہتا اور نہ ہی لدنی اور کشفی علوم کا قائل ہے یہ تو اَلْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ کا کہتا ہے۔

لوگوں کو خیر کی تعلیم: علم کو سیکھنے کے بعد اسے سکھانا اور پھیلانا بھی ضروری ہے۔ مسلمان نسلیں تبھی محفوظ رہیں گی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس خیر کو ہر جگہ بانٹنا چاہئے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: بَلِّغُوا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً۔ ایک آیت بھی میری طرف سے تم تک پہنچی ہو اسے آگے ضرور پہنچاؤ۔

علم کی راہ میں صبر: بعض اوقات اس راہ میں بہت محنت اور کوشش درکار ہوتی ہے نیز مشکلات بھی پیش آسکتی ہیں۔ حصول علم میں ہمہ وقت آسائشوں کی توقع نہ رکھے بلکہ ایسی تکالیف کو اہمیت دیئے بغیر اپنا ہدف ومقصد زندہ وسلامت رکھے۔ اور صبر وبرداشت سے کام لے۔ اس لئے کہ: ﴿إِنَّ مَعَ العسر يسرا﴾ یقیناً تنگی کے ساتھ آسانی بھی ہے۔ (الم نشرح: ۵)

احترام علماء اور ان کی عزت افزائی: طالب علم اپنے ان محسنوں کو ضرور بنظر احترام دیکھے جنہوں نے اسے اندھیرے سے نکال کر روشنی دکھائی۔ ان کے ساتھ باادب رہے بانصیب رہے گا۔ اپنا علم بھی محترم بنائے اور ان کا تذکرہ ہمیشہ خیر سے کرے نیز انہیں اپنی دعاؤں میں بھی یاد رکھے۔

تقوی کو لازم پکڑنا۔ علم کی حصول میں خدا خوفی ایک بنیادی عنصر ہے جس سے طالب علم اپنے نفس کو غرور میں مبتلا ہونے، علماء سے جھگڑا کرنے اور انہیں نیچا دکھانے سے روکتا ہے اور تواضع وعاجزی پر ابھارتا ہے۔ اس لئے کہ علم اس وقت ایک رحمت ہے ورنہ بہت بڑی زحمت جیسے شیطان کو علم کے تکبر نے خوار کیا۔

☆☆☆☆☆

فقہ اسلامی:

......دین اسلام کا صحیح فہم وادراک فقہ کہلاتا ہے۔ دین کے مصادر اس فقہ کا اصل ہیں۔ جن میں غوطہ زن ہو کر فقہ مستنبط کی جاتی ہے۔ یہ مصادر قرآن وسنت ہیں جو دوش بدوش چلتے ہیں اور اجتہادی مسائل میں اجماع وقیاس صحیح کے بھی راہنما ہیں۔

... اس علم وادراک کا صحیح نور علماء حق ہی کو عطا ہوتا ہے جو اسی کی روشنی میں چلتے، اپنے آپ کو مستقیم بناتے اور دوسروں کو بھی اسی کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ یہ علماء حق فقہاء، محدثین اور مجتہدین سبھی میں پائے جاتے ہیں۔

... اس فقہ کا علم ہمیں براہ راست قرآن وسنت رسول ﷺ سے حاصل ہو جاتا ہے یا پھر بالواسطہ فقہاء ومحدثین اور علماء کی دینی وعلمی بصیرت سے۔

...شریعت کے ہر فقہی حکم کا مقصد مسلمان کی بھلائی ہے۔ یہ حکم پانچ ہیں اور مقاصد خمسہ کہلاتے ہیں۔

... یہ فقہ ہر بالغ، عاقل، مسلم مرد وعورت سے متعلق ہے اور جنین ونوزائیدہ بچے کے لئے بھی۔ جو فاتر العقل، نابالغ اور غیر مسلم ہیں ان کے لئے نہیں۔ ہاں غیر مسلم سے تعلقات کے بارے میں اسلامی فقہ ہمیں ضرور آگاہ کرتی ہے۔

...... فقہ اسلامی تا ابد رہنے والی ہے۔ اسے زندہ مسائل سے واسطہ ہے۔ اور انسانوں کی تہذیب وثقافت کو بہتر اور بامقصد بنانے میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔

... اجماع واجتہاد کے دروازے جس طرح سابق میں کھلے تھے آج بھی اپنی زندہ دلی کے ساتھ معاشرتی اور معاشی معاملات کو بے لاگ اور مکمل ذہنی آزادی کے طریقے سے پیش کرنے کو تیار ہے۔

......بہت سے مسائل جو شریعت میں واضح اور صحیح احادیث سے ثابت ہیں اور جنہیں سمجھنے کے لئے نہ تو کسی عالم یا فقیہ ومحدث کے اجتہاد واستنباط کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی کسی مسلکی فقہ کی۔ ان سے مستفید ہونا فرض ہے اور انہیں اختلافی بنانے کی کوشش ایک کھلا انحراف۔ کیونکہ یہ براہ راست ہمیں قرآن وسنت سے مل چکے ہیں۔ ان سادہ مسائل کا فہم بھی فقہ کہلاتا ہے مثلاً وضو کا صحیح طریقہ جاننا اور نماز کو سنت رسول ﷺ کے مطابق پڑھنا۔

...... جو مسائل قرآن وسنت میں غیر واضح ہیں یا وہ نئے ہیں ان میں علماء وفقہاء کی کاوشوں کے نتائج سے مستفید ہونا بھی فقہ ہے۔ کیونکہ وہ ان کا حل کتاب وسنت سے ہی علت (Effective Cause) تلاش کر کے دیتے ہیں اور صحیح حکم بھی بتا دیتے ہیں۔ فقہاء کرام کے ان فیصلوں یا فتاویٰ میں یہ اختلاف بھی ہو سکتا ہے کہ جناب رسالت

مآب علیہ السلام کے کون سے افعال شرعی کہلائے جائیں گے اور کون سے غیر شرعی۔ اس لئے فقیہ یا مجتہد کے فیصلوں کا نفاذ نہیں بلکہ اطلاق ہوتا ہے یہی اسلامی فقہ ہوتی ہے۔

...... فقہ اسلامی چاروں مذاہب کے استنباطات وفتاوی وغیرہ سے مستفید ہو کر بغیر مذہبی تعصب کے أقربُ إلَى الصَّوَاب کو قبول کرتی ہے۔

...... قرآن وسنت میں وارد احکام، شریعت کے اڑھائی فی صد کے لئے نہیں بلکہ کل کیلئے ہیں اور یہی اسلامی فقہ کی اساس اور فقہ کے لئے کافی وشافی ہیں۔ اس میں از خود علتیں نکال کر مسائل کو فرض کرنے کی گنجائش نہیں۔ یہ بھی دینی خدمت نہیں کہ احکام قرآن وحدیث میں معارضہ یا مخالفت قائم کی جائے۔ کیونکہ اس لڑکھڑاہٹ میں قیاس اور ذاتی رائے، قرآن وحدیث پر مقدم ہو جاتے ہیں اور احادیث صحیحہ توڑ مروڑ دی جاتی ہیں جن سے تاویلات کے عجیب وغریب انبار لگ جاتے ہیں یا پھر باقی ماندہ اشیاء کو خلاف قیاس کہہ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

...... الفاظ قرآن وحدیث میں جو شرعی احکام ہیں وہ سب مطابق عقل اور قیاس صحیح کے موافق ہیں جن میں رہتی دنیا تک کے تمام نزاعات کے بہتر فیصلوں کی گنجائش موجود ہے۔ ان میں کوئی بھی شرعی حکم یا کوئی بھی فرمان نبوی، میزان عدل، قیاس صحیح، عقل سلیم اور فطرت مستقیمہ سے ہٹا ہوا نہیں۔ جس طرح کوئی انسان ایسا نہیں جس کی طرف آپ علیہ السلام رسول نہ ہوں اسی طرح کوئی حکم۔ جس کی کسی بھی وقت امت کو ضرورت پڑنے والی ہو۔ ایسا نہیں جس کا بیان آپ علیہ السلام نے نہ فرمایا ہو۔

......فقہ اسلامی میں ہمیں علماء وفقہاء کی فہم وفراست یکساں نظر نہیں آتی بلکہ اس میں بڑا تفاوت ہے۔ جو وسعت دینی اور سبھی سے مستفید ہونے کا عندیہ ہے۔ ایک ہی آیت یا حدیث کو ایک فقیہ سمجھ کر اس سے صرف ایک مسئلہ مستنبط کرتا ہے اور دوسرا دس مسئلے یا ان سے بھی زیادہ۔ بعض فقہاء کا فہم صرف الفاظ تک محدود رہتا ہے انہیں بیان ، ایماء، اشارہ، تنبیہ، یا اعتبار وغیرہ تک رسائی نہیں ہو پاتی۔ مفرد لفظ سے جو معنی بھی ان کے ذہن میں آتا ہے بس یہی ان کی فقہ ہوتی ہے۔ اس لئے فقہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے کہ صرف ایک ہی لفظ سے بے شمار مفاہیم ومعانی سے وہ کسی کو آگاہ کر دے اور فہم وفراست کے اعلیٰ مقام ومرتبہ تک پہنچا دے۔ مثلاً: ایک آیت کو سمجھنے کے بعد عموماً ذہن میں وہ بات نہیں آپاتی جو دو آیتوں کو ملا کر سمجھ آتی ہے۔ آیت: حمله وفصاله ۔۔ اور آیت حولين كاملين کو ملا کر سیدنا ابن عباسؓ نے یہ فقہ حاصل کی کہ عورت کے حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ ہے۔

...... اجتہادی مسائل میں مجتہدین کرام کے اپنے علمی ظرف اور بصیرت میں نمایاں فرق ہوتا ہے اور اختلاف رائے بھی۔ ان آراء کو پڑھنے کے بعد کسی نہ کسی مجتہد کی کسی خاص پہلو میں لاعلمی، غلطی، خطا کا علم ہو جاتا ہے لہٰذا

مجتہد سے غلطی ہونے کا امکان ہے جب کہ فقہ اسلامی میں فقہائے کرام کی کثرت رائے سے فہم وفراست کی یہ خیر ہمیشہ درست ملتی ہے۔

خصوصیات: ماضی میں دین اس سے بہت بلند تھا کہ صحابہ اور فقہاء وعلماء اس میں ذاتی رائے دیں۔ یا اپنی عقل وقیاس کو اس پر مقدم کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے علماء کی مقبولیت وشہرت زمان ومکان سے بے نیاز ہوگئی۔ رب العالمین نے ان کا ذکر جمیل ان کی وفات کے بعد بھی جاری رکھا۔ ان کے مخلص شاگردوں کی ایک جماعت بہ توفیق الٰہی ان کی اتباع میں انہی کے مطابق ہی کام کرتی رہی۔ تعصب یا کسی کی طرف داری نام کو نہ تھی۔ وہ اپنے بزرگوں کی طرح حجت ودلیل کا ساتھ دیا کرتے۔ جدھر حق ہوتا ادھر وہ اپنا منہ موڑ لیتے۔ حق کا دامن پکڑتے اور اسی کے گرد اگرد وہ گھومتے۔ حق کو دلیل سے پہچانتے نہ کہ رجال سے۔

☆..... فقہ اسلامی، مجموعی طور پر قرآن وسنت کے دلائل سے آراستہ ہوتی ہے۔ باقی مآخذ انہی پر انحصار کرتے ہیں۔ ضعیف وموضوع دلائل پر مبنی فقہی مسائل اس کی لغت میں نہیں۔ حقیقت حال پر مبنی فقاہت اس کی نظر میں صحیح فقہ ہے۔ نہ کہ مفروضہ مسائل۔

☆..... فقہ اسلامی میں صحابہ کرام کی اتباع کی جاسکتی ہے اس لئے کہ وہ عادل تھے دوسروں کی نہیں۔ کیونکہ ان پر نقد کی جاتی ہے۔ اسی طرح علم، اخلاق اور راستی میں بھی ان کے بعد کوئی نسل نہیں۔ صحابہ میں کوئی مبتدع نہیں تھا مگر ٹیکنیکلی تابعین میں مبتدع تھے۔ جیسے جہم بن صفوان صغار تابعین میں سے تھا۔ تابعین نے بھی صحابہ کرام کی اتباع کرنے کا کہا مگر کسی نے سعید بن المسیب، سفیان ثوری، حسن بصری، یا ابن سیرین رحمہم اللہ کی اتباع کا نہیں کہا۔ صحابہ کرام کی اتباع سے مراد ان کا متفق علیہ یا اجماعی طریقہ کار یا عمل ہے۔ انفرادی عمل نہیں۔ مثلاً صحابہ کرام نے مرتکب کبیرہ کو غیر مسلم نہیں کہا۔ اور نہ ہی غیر مسلم کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد: دو دین جزیرۃ العرب میں نہیں رہ سکتے۔ اس حدیث کا مطلب بھی ہم نے الٹا لیا کہ غیر مسلم اگر نظر بھی آئے تو اسے مار دینا چاہئے چہ جائیکہ وہ سعودی عرب میں ہی کیوں نہ ہو؟ جبکہ خلفاء راشدین کے عہد میں غیر مسلم جزیرۃ العرب میں رہتے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے تو اسی جزیرہ کے عیسائیوں سے معاہدہ کیا۔ کیا صحابہ کرام کی تعبیر رسول کی تعبیر کے عین مطابق تھی یا ہماری توجیہ زیادہ درست ہے؟

☆..... اتباع، دین کی مدلل بات کے قبول کرنے کو کہتے ہیں۔ اور تقلید بے دلیل بات کے قبول کرنے کو۔ فقہ اسلامی کی تاویل وتفہیم میں ائمہ اربعہ کا اختلاف بہت ہی نمایاں ہے۔ چاروں الگ الگ فقہیں اس کی شاہد ہیں۔ اور ہر امام دوسرے سے علم میں بھی بڑھا ہوا ہے۔ سینکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ایک دوسرے سے

بڑھے ہوئے ہیں۔ نیز ان میں کوئی بھی علم صحابہ سے بڑھا ہوا نہیں ہے۔ اس لئے نابینا اگر کسی سے پوچھ کر اپنا منہ قبلہ کی طرف کر لیتا ہے تو اس لئے کہ اس کے پاس اس سے زیادہ قدرت نہیں مگر کیا اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسروں کو بھی قبلہ بتاتا پھرے؟ اس لئے تقلیدی مسئلہ کو حق جان کر دوسروں کو بتانا اور زبردستی منوانا نیز فتوی بازی کرنا یہ دین میں جبر اور سینہ زوری ہے اور مسیطر بننا ہے۔ جب دوسرا حق پر ہوسکتا ہے تو پھر امن کو آگ نہیں لگانی چاہئے۔

☆..... عام خیال یہی ہے کہ فقہ صرف چار ائمہ کرام کی فقاہت تک محدود ہوگئی ہے۔ نیز باب اجتہاد بھی بند ہے خواہ علم و تخصص فقہ میں لوگ کتنے ہی کیوں نہ آگے بڑھے ہوئے ہوں۔ یہ خیال درست نہیں کیونکہ علم فقہ، صحابہ رسول نے آگے پھیلایا اور ہزاروں شاگرد تیار کئے۔ چنانچہ یہ علم ان چار ائمہ میں کیسے محصور ہوسکتا ہے؟۔ مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ ہی کو لے لیجئے ان کا شاید ہی کوئی ثانی تھا۔ نیز مکہ، عراق، بصرہ، شام اور مصر کے فقہاء تابعین کی ایک الگ طویل فہرست ہے جن کے اجتہادات اور فقاہت بھی اپنا بے مثل مقام رکھتے ہیں۔ یہ سب فقہاء متخصص تھے اور ان کے بعد بھی رہے۔ یوں علم فقہ خاصا پھلا پھولا۔ اسے محض ائمہ اربعہ تک محصور رکھنا درست فقہی رویہ نہیں۔ اسی جمود نے ہمیں یہ دن دکھائے کہ ہمارا مسلمان وکیل اسلامی فقہ سے استفادہ کی بجائے بدلتے حالات میں بدلتے جدید قوانین ونظریات سے مستفید ہو رہا ہے۔

☆..... فقہ اسلامی کو تازہ بتازہ اور متحرک رکھنے کے لئے اصول یہ دیا گیا ہے کہ اسے اہل علم سے دریافت کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون ﴾ (النحل: ۴۳)۔ اہل علم سے سوال کیا کرو اگر تمہیں علم نہ ہو۔ اس آیت میں اہل علم کا لفظ جمع کے لئے ہے اس سے مراد کوئی مخصوص عالم یا فقیہ نہیں اور نہ ہی خاص وقت کے علماء وفقہاء اس سے مراد ہیں۔ اس لئے امام مہدی کا ظہور ہو یا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، ان دونوں کی حیات کا بھی ہر لمحہ اسی کے سایہ تلے گذرے گا۔ یہ درست ہے کہ ماضی میں بعض فقہاء کی فقہ کو عروج ملا مگر فقہ اسلامی سے علماء وفقہاء کا تمسک اس فقہ کو پیچھے چھوڑ گیا۔ ایسا اب بھی ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔

☆..... فقہ اسلامی کا ہر پہلو ہماری زندگی کے ذاتی، اجتماعی اور معاشرتی حالات پر محیط ہے۔ بے شمار مسائل و آداب زندگی اس سے معلوم ہوتے ہیں۔ عبادات کی تفاصیل بھی موجود ہیں۔ معاملات زندگی پر بھی سیر حاصل مباحث ہیں۔ رشتوں کا تقدس، وراثت کے مسائل، نکاح وطلاق، تجارت ومعیشت، قانون ودستور، نماز وعبادات کے دیگر پہلو، سبھی کے بارے میں اسلامی فقہ ہماری راہنمائی کرتی ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پر عمل

کرنے کے لئے مسلمان قلبی طور پر تیار ہو اور اتباع رسول کو غیر معمولی اہمیت دے۔

محاسن:

۱۔ **دین ودنیا:** شریعت میں دین ودنیا دونوں کے احکام نازل فرمائے گئے۔ فقہ اسلامی اس اعتبار سے مالا مال ہے کہ جناب رسالت مآب ﷺ کی ذات گرامی نے اپنی حیات طیبہ میں دین ودنیا دونوں کے بارے میں بے شمار فقہی احکامات ارشاد فرمائے۔ حدیث وفقہ کا لٹریچر ان دونوں موضوعات کو زیر بحث لاتا ہے۔ عبادات اور معاملات دونوں موضوعات فقہ اسلامی کا حصہ ہیں۔ ان دونوں علوم کا حصول علوم دینیہ میں شمار ہوتا ہے۔

۲۔ **فقہی برکتیں:** معاملات کو چلانے میں اسلام کے آفاقی اصول، اس کے مصادر قرآن وسنت اگر پیش نظر رہیں اور ان کو بغیر کسی تاثر وتاثیر کے مناسب تفسیر واجتہاد سے نمٹایا جائے تو اسلامی فقہ کی برکتیں اسی طرح آج بھی نمایاں طور پر سامنے آسکتی ہیں۔ جس طرح قرون اولی میں یہ سب کچھ دیکھا گیا۔ ان برکتوں کے مظاہر میں ہم دیکھتے ہیں کہ:

ائمہ اربعہ کے علاوہ بہت سے دیگر فقہاء بھی ہیں جنہوں نے اپنی اپنی مصطلحات، قاعدے، اصول اور استنباطات واجتہادات پیش کئے ہیں۔ یہی وہ بنیادی محاسن ہیں جو فقہ اسلامی کے ہیں کہ اس نے ہر باشعور، معتدل مزاج اور ماہر علم کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی جس نے اپنے فہم اور عقل سلیم کے ذریعے دین پر نہ صرف تدبر کیا بلکہ غور وخوض کر کے نئی نئی فقہی، اصطلاحی اور استدلالی راہیں نکالیں۔

۳۔ **دین میں توسع:** فقہی کاوشوں کا مطالعہ یہی باور کراتا ہے کہ بذات خود دین میں بہت توسع ہے اور دین اپنی خدمت کے لئے معتدل سوچ کو کھپانے کا اہتمام ہر دور میں کرتا آیا ہے۔ اسی نعمت کو پاکر دین ہر دور میں سرخرو ہوا اور مسلمان فقہاء نے حالات، درپیش چیلنجز کا مقابلہ اجتہاد اور غور وفکر سے آخر کر ہی ڈالا۔ اس کی وسعت کا اندازہ صرف اس فقہی لٹریچر کو دیکھ کر ہوسکتا ہے جس میں مفروضہ مسائل نہیں۔

۴۔ **مجتہد معصوم نہیں:** فقہ اسلامی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے اسلام کے چشمہ صافی قرآن وسنت سے سیراب ہونا سیکھا ہے جس کا دینے والا اللہ وحدہ لاشریک لہ ہے۔ اہل اسلام کو متحد ومتفق رکھنے کے لئے جو سرمایہ اطاعت واتباع دیا وہ رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکات ہے۔ شریعت اور اس کے فہم میں اطاعت واتباع اپنے آخری رسول ﷺ کی کرائی گئی ہے۔ تاکہ استنباط واجتہاد میں اختلاف رائے کو اتباع رسول سے ختم کر دیا جائے جو ایمان کا لازمہ ہے۔ آپ ﷺ کے علاوہ شریعت میں کسی اور کو معصوم قرار نہیں دیا اور نہ ہی کسی کو اس کی اجازت دی ہے کہ اپنی طرف سے کسی کو معصوم قرار دے۔ اس لئے فقہی اختلافات میں کسی عالم، مجتہد یا امام وغیرہ

کو معصوم نہیں گردانا جاسکتا۔

۵۔ **ضرورت اجتہاد:** ائمہ اسلاف کی تاریخ اور ان کے فقہی مناہج کو بغور پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شروع شروع میں فقہاء کا فقہی مسلک یہ تھا کہ اجتہادی امور میں تقلید اور جمود کو پنپنے کا موقع ہی نہ دیا جائے بلکہ صحابہ کرام اور ائمہ اسلام کے اجتہادات سے وقتی مصلحتوں کے مطابق فائدہ اٹھایا جائے۔ اور فقہی فروع میں جمود اور فرقہ پرستی کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ بس اصل نظر کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ﷺ پر ہی مرکوز رہے۔ اسلاف کو کتاب وسنت میں اگر کسی مسئلہ یا وقتی حادثہ کے متعلق صراحت نہ ملتی تو اس کا فیصلہ محض شخصی رائے کے مطابق نہ کرتے۔ کسی علاقہ کے علماء نے اپنے مخصوص حالات وافکار کو امت پر زبردستی مسلط نہیں کیا۔ بلکہ صحابہ کرام اور اسلاف کی وسعت نظر پر حاضر فقہاء کی نگاہ رہی اور یہی اصل ہدف رہا۔ جمود اور شخصیت پرستی سے انہوں نے امت پر تنگی اور مشکل پیدا نہیں کی۔

نیز جب نصوص نہ ہوں اور کتاب وسنت سے نئے مسائل کا حل صراحۃً نہ ملے تو پھر اجتہاد کے سوا چارہ نہیں۔ صحابہ کرام نے بھی اجتہاد فرمایا، ائمہ اربعہ اور دیگر ائمہ مجتہدین نے بھی بوقت ضرورت اجتہاد سے کام لیا۔ لہٰذا آج بھی اہم معاملات ومسائل کو اجتہاد ہی کے ذریعے سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ محدثین وفقہاء کرام کا یہی مسلک تھا۔

☆☆☆☆☆

فقہ اسلامی کی اہمیت وضرورت:

☆..... اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرما کر اسے کرہ ارضی پر بسایا۔ غالباً اس میں حکمت یہ تھی کہ نسل انسانی جب زمین پر پھلے پھولے تو جہاں ان کے باہمی معاملات وتعلقات آگے بڑھیں وہاں یہ مختلف قوموں، برادریوں اور قبائل سے پہچانے جائیں۔ مگر ان کے باہمی روابط کیسے ہوں؟ ان بن کی صورت ہو تو اس کا حل کیا ہو؟ جرائم اگر ہوں تو ان سے کیسے نمٹا جائے؟ اور اگر کوئی ان سے نمٹتا ہے یا ان کا حل پیش کرتا ہے تو وہ کون ہو؟ گویا انسانی معاشرے کو پرامن بنانے اور چلانے کے لئے ایک پورا نظام ہو۔ ورنہ طاقتور کمزور کو کھا جائے گا۔ اور ظالم اپنے ظلم سے باز نہیں آئے گا۔ انسانیت کے نام پر انسان مار دیئے جائیں گے۔

☆..... انسان اگر خود قانون گر ہو تو اس کے قانون میں سب سے بڑا سقم ہی یہ ہوگا کہ وہ اسے کمزوروں کے لئے بنائے مگر اپنے لئے نہیں۔ اس کے مزاج کی تیزی، تبدیلی، خواہشات اور زیادتی وغلبے کا جذبہ ہی غیر متوازن

قانون سازی کرائے گا۔جس سے عدل وانصاف یا امن وسکون کی توقع نہیں کی جاسکتی۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان قوانین کوخود بنایا کیونکہ وہ انسان کا خالق ہے اسے علم ہے کہ اس چھ فٹ کے انسان کا مزاج کیا ہے؟اورکون سا قانون یا نظام اس کے لئے مناسب ہے۔چنانچہ اس کی تخلیق کے ساتھ ہی اسے چند قوانین کی پابندی سے آگاہ کردیا۔اور خیر وشر کی معرفت بھی دے دی۔اور سمجھا دیا کہ زمینی فساد کی ابتداان قوانین کوتوڑنے سے ہی ہوگی۔ تاریخ انسانی گواہ ہے کہ جہاں انسان نے الٰہی ہدایات کوترک کیا یا اس نظام سے ذرا غفلت برتی۔تاریکی اور ظلمت نے وہاں بسیرا کرلیا اور باہمی کشمکش میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔اس لئے ایسے نظام کواس نے خود ہی نظامِ جاہلیت کا نام دیا۔

﴿أفحكم الجاهلية يبغون ومن أحسن من الله حكماً لقوم يوقنون﴾۔کیا لوگ زمانہ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں۔اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لئے حکم میں اللہ سے بڑھ کرکون بہتر ہوسکتا ہے۔(المائدۃ:۵۰)

☆ ... صحیح عقیدہ، صحیح عبادات اور صحیح معاملات ہی صحیح قوانین ہیں۔جو خالق کے انعام کا شکر کرنا سکھاتے اور بھائی بندوں کے حقوق ادا کرنے کا درس دیتے ہیں۔جس میں کسی کے ساتھ ظلم وزیادتی کی گنجائش نہیں۔یہ سب قوانین اسلامی شریعت میں ہیں جو جدید وقدیم کو اپنے اندر سموتے اور وقت ضرورت آگاہ بھی کرتے رہتے ہیں۔اور یہی فقہ اسلامی ہے۔معاشی مسائل جن میں کاروبار، تجارت اور ملازمت جیسے اہم امور ہیں ان میں فقہ اسلامی کیا راہنمائی کرتی ہے؟ اس سے بھی اسے واقف ہونا ہے۔والدین، اولاد کی اور اولاد والدین کی ذمہ داریوں سے کس حد تک عہدہ برآ ہوسکتے ہیں؟ ان سے آگاہی بھی ہر شخص کی ضرورت ہے۔ذاتی طور پر بچپن، جوانی اور بڑھاپا کے مراحل کس خوش اسلوبی سے طے کیے جائیں؟ فقہ اسلامی یہاں بھی اپنی مکمل معلومات سے سرفراز کرتی ہے۔رشتہ دار، احباب، ہمسائے، ہم جلیس، مسافر، اپنے پرائے اور مسلم وغیر مسلم کے ساتھ کس طرح معاملات نبھانے ہیں؟ ان کی آگاہی سے بھی فقہ اسلامی بخل نہیں کرتی۔

☆ ... ان مسائل میں کچھ تو فوری طور پر سیکھنا ہیں جو فرض عین ہے اور کچھ تاخیر سے اور بعض بوقت ضرورت۔کچھ ایسے بھی ہیں جن کا سیکھنا فرض کفایہ ہے۔جیسے تجہیز وتکفین اور نماز جنازہ وغیرہ۔کبھی اس علم کا حصول نفل بھی ہوجاتا ہے جو فرض کفایہ کی حد ومقدار سے ذرا زائد ہے۔نیز عوام الناس کا عمل کی غرض سے نفلی عبادات سیکھنا بھی اس میں شامل ہے۔لہٰذا اس علم کا ادراک وفہم مسلمان کے لئے بہت ضروری ہے۔سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد روایت کرتے ہیں:

مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ جس سے اللہ بھلائی کا ارادہ فرمانا چاہیں تو اسے دین کی سمجھ عطا کردیتے ہیں۔

☆.....اس لئے تمام ضروری معاملات جن میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں شامل ہیں وہ اور عبادات کا شرعی طریقہ وکیفیت دونوں معلوم ہونے چاہئیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ۔ ہر مسلمان پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔ مرد ہو یا عورت دونوں کے علمی پہیئے ساتھ ساتھ رہیں گے تو گاڑی چلے گی۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ ضرورت پڑنے سے قبل ہی اسے سیکھنا ضروری ہے۔ وہ فرماتے ہیں: مَالاَ يَتِمُّ الْوَاجِبُ إِلاَّ بِهِ فَهُوَ وَاجِبٌ۔ جو چیز واجب کی تکمیل کے لئے ناگزیر ہو وہ بھی واجب ہے۔ کے تحت ایسا کرنا ناگزیر ہے۔ اس لئے تمام عبادات کی تیاری پہلے سے ہوتا کہ وقت وجوب اسے ادا کیا جا سکے۔ جیسے اقامت صلاۃ، جمعہ کی حاضری کے لئے کوشش اور تیاری وغیرہ۔ ایسے فوری اور واجب اعمال کی ادائیگی کی کیفیت سیکھنا بھی ضروری ہے۔ اگر وہ عمل تاخیر سے کرنے کا ہو تو اس کا علم بھی تاخیر سے سیکھا جا سکتا ہے۔ جیسے حج وعمرہ یا قربانی وغیرہ۔

☆..... اپنی دینی زندگی کی عمارت یقین پر اٹھانی چاہئے نہ کہ محض ظن وتخمین کی بنیاد پر۔ ہر عمل کرتے وقت یہ ٹھوس یقین ہونا چاہئے کہ وہ قرآن وسنت کے عین مطابق ہے اور قابل اجر وثواب بھی ہے یا نہیں؟ یا جو کچھ کیا جا رہا ہے آیا یہ جائز بھی ہے یا نہیں؟ کیا حرام تو نہیں؟ مسلمان اسی علم کو اپنی زندگی کا راہنما بناتا ہے۔ مگر کیسے؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان شرعی مسائل کو جاننے کے لئے ہر وقت چوکنا رہے اور قرآن وحدیث کے مطالعے کا عادی بھی بنے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اپنی آیات کا علم انہی کو نوازتا ہے جو اس کی جستجو میں رہتے ہیں۔ اور وہ اہل فقہ ہیں جو سب سے بڑی خیر کے حامل ہو جاتے ہیں۔

فقہ اسلامی کی روح: نیز آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

يأَيُّهَا النَّاسُ: إِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ، وَالْفِقْهُ بِالتَّفَقُّهِ، وَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ، وَإِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ، وَلَنْ تَزَالَ أُمَّةٌ مِنْ أُمَّتِي عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ عَلَى النَّاسِ لاَ يُبَالُونَ مَنْ خَالَفَهُمْ، وَلاَ مَنْ نَاوَأَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُاللّٰهِ وَهُمْ ظَاهِرُونَ۔ (الفقیہ والمتفقہ ۱، ۷۹) لوگو: علم سیکھنے سکھانے کا نام ہے اور فقہ دین کی گہری سمجھ کا، جس سے اللہ تعالیٰ خیر وبھلائی چاہتے ہوں اسے پھر دین کا گہرا فہم عطا کر دیتے ہیں، بلاشبہ اللہ کے بندوں میں علماء ہی ہیں جو اس کا ڈر رکھتے ہیں، میری امت میں ایک گروہ دیگر لوگوں پر حق کی بنیاد پر غالب رہے گا جو ان کی مخالفت کرے گا انہیں اس کی پروا نہیں ہوگی اور نہ ہی ان کی جو ان کے ساتھ دشمنی کرے گا یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ جائے گا اور وہ کامیاب وکامران ہوں گے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لَأَنْ أَجْلِسَ فَأَتَفَقَّهَ سَاعَةً أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ إِحْيَاءِ اللَّيْلِ بِلاَ فِقْهٍ. اگر میں ایک گھڑی بیٹھ کر فقہ حاصل کرلوں یہ مجھے زیادہ محبوب ہے بہ نسبت اس کے میں ساری رات بغیر کسی فقہ کے گزار دوں۔

......آپ ﷺ نے بھی سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو فرمایا: خریدنے کا یہ طریقہ سودی ہے کہ تم دو کلو خشک کھجوریں دے کر ایک کلو تازہ کھجوریں ان کے بدلے میں لو۔ میں یہ کھجوریں نہیں کھا سکتا۔

......بینکنگ سسٹم خواہ کوئی بھی ہو یہ بھی اپنے نظام کو سود پر کھڑا کرتا ہے۔ بینک کھولنے کے لئے سٹیٹ بینک سے سرٹیفیکیٹ حاصل کرنا اور بطور ضمانت بھاری رقم سٹیٹ بینک میں جمع کروانا ضروری ہے۔ پھر اس کی (Fixed Percentage) پر سرٹیفیکیٹ حاصل کرنے والا بینک اپنا کاروبار چلاتا ہے۔ بینکنگ ایک جوا خانہ ہے جس میں بینک ایک فرد سے رقم ادھار لیتا ہے اور اسے (Fix amount) کا لالچ دیتا ہے اور مقروض سے ذرا زیادہ لے کر پہلے کو تھوڑا سا پیسہ دے کر باقی اپنی جیب میں رکھتا ہے۔

......یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے تنگ دست مقروض کو قرض ادا نہ کرنے کی سکت کی وجہ سے مزید مہلت دینے کا کہا ہے نہ کہ اسے جرمانہ کرنے کا۔ اس لئے کہ یہ جرمانہ (Penalty) سود ہی ہوگا۔

......بینکنگ کے برعکس اسلام میں بیع (investment) کو رواج دیا گیا ہے جس میں فرد کی فکر و محنت شامل ہے۔ اس میں نفع کا امکان اور نقصان کا رسک بھی ہے۔ مگر نہ مقررہ نفع ہے اور نہ ہی مقررہ نقصان۔

......سٹاک مارکیٹ ہو یا حصص کی خرید و فروخت ان میں غالب صورت سٹہ بازی کی نظر آتی ہے۔ جس سے ذخیرہ اندوزی کو فروغ ملتا اور غیر ملکیتی اور ان دیکھی اشیاء کی خرید و فروخت کا رجحان و کاروبار بڑھتا ہے۔ اور جس سے گھر بیٹھے چند افراد اپنے جدید ترین وسائل سے یہ کاروبار چلاتے اور پیسہ بڑھاتے ہیں جس میں خون پسینہ کی وہ محنت قطعاً نہیں جو ایک عام آدمی کو کرنا پڑتی ہے۔ جس کے بھیانک نتائج میں ایک یہ بھی ہے کہ آدمی سود خوری اور خود غرضی کا شکار ہو کر لالچ و حرص کا عادی اور دینی فرائض کی ادائیگی سے محروم ہو جاتا ہے۔

......سیدنا فاروق اعظمؓ بازار میں دوکاندار کے بیع و شراء کے علم کا امتحان لیتے اگر وہ کامیاب ہوتا تو درست ورنہ اسے فرماتے: بند کرو یہ دھندا، اور جاؤ پہلے بیع و شراء کے مسائل سیکھو تا کہ تم حلال و حرام میں تمیز کر سکو۔ ورنہ حرام میں پڑے رہو گے۔

......امام عبداللہ بن المبارکؒ علم فقہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: آدمی کے پاس اگر مال نہ ہوتو اس

کے لئے زکاۃ کا علم سیکھنا واجب نہیں۔ لیکن اس کے پاس اگر دوسو درہم آ جائیں تو زکاۃ کے مسائل کا جاننا اس کے لئے فرض ہوگا تاکہ اسے علم ہو کہ زکوۃ کتنی مقدار میں نکالے، کب نکالے؟ اور کسے دے وغیرہ۔ وہ تاجر حضرات سے اکثر فرمایا کرتے: بھلے لوگو! تجارت سے قبل خرید وفروخت کے شرعی مسائل۔۔۔ اسلامی فقہ۔۔۔ کو ضرور سیکھ لو۔ لاعلمی کی وجہ سے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم سود میں ہی پھنستے چلے جاؤ۔

......امام ضحاکؒ اس آیت ﴿بما کنتم تعلمون الکتب وبما کنتم تدرسون﴾ (آل عمران:۷۹) کی تفسیر میں فرمایا کرتے: یہی تو وہ مجالس ہیں جن میں دین کا گہرا علم یعنی فقہ لوگ حاصل کرتے ہیں۔

......امام عطاءؒ بن رباح الخراسانی فرمایا کرتے تھے:

مَجَالِسُ الذِّكْرِ: هِيَ مَجَالِسُ الْحَلالِ وَالْحَرامِ ...... كَيْفَ تَشْتَرِي وَتَبِيْعُ، وَتُصَلِّيْ وَتَصُومُ، وَتَنْكِحُ وَتُطَلِّقُ، وَتَحُجُّ وَأَشْبَاهُ هَذَا۔ ذکر کی مجالس دراصل حلال وحرام کی مجلسیں ہوا کرتی ہیں یعنی تم کیسے خرید و اور کیسے بیچو، کیسے نماز پڑھو اور کیسے روزے رکھو، کیسے شادی کرو اور کیسے طلاق دو اور کیسے تم حج کرو۔

یہی وہ حلقے ومجالس ہیں جنہیں جنت کے باغات کہا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں صرف قرآن وسنت کی بات ہوتی ہے۔

......نیز معاشرے کی ایک اہم ضرورت صحیح علماء وفقہاء کی بھی ہے۔ ارشاد باری ہے۔

﴿ وما کان المؤمنون لینفروا کافة فلولا نفر من کل فرقة طائفة لیتفقهوا فی الدین و لینذروا قومهم إذا رجعوا إلیهم لعلهم یحذرون﴾ التوبہ:۱۲۲۔ اہل ایمان کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ سب کے سب جہاد کیلئے نکل کھڑے ہوں بلکہ مسلمانوں کی ہر بستی وطبقہ میں سے کیوں نہیں ایک جماعت نکلتی جو دین میں تفقہ حاصل کرے۔ اور جب وہ واپس پلٹے تو اپنی قوم کو ڈرائے شاید کہ وہ برائی سے بچے۔

یہ آیت درج ذیل ہدایات دے رہی ہے:

۱۔ علم دین کا سیکھنا اور اس میں تفقہ حاصل کرنا امت مسلمہ کے بعض افراد پر اسی طرح ضروری ہے جس طرح جہاد، دفاع وطن اور سرزمین کے لئے ضروری ہے۔

۲۔ جس طرح قوم ووطن کے دفاع کے لئے طاقت اسلحہ اور مجاہدین کی ضرورت ہے اسی طرح دین اسلام بھی ایسے افراد کا محتاج ہے جو اس کا دفاع دلائل اور براہین سے کریں۔ مسلمان قوم کی بقاء اور عروج کے لئے یہ علم بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

۳۔ آیات جہاد اور قتال کے بالکل درمیان اس آیت کو بیان کرنا معجزہ ہے جس کا انکشاف زمانہ حال میں ہو چکا ہے کیونکہ آج بہ نسبت اسلحہ کی فراوانی کے وارسٹریٹجی کا علم اہم ہے جس کے بغیر جنگیں لڑنا بیکار ہے۔ اور

جسے رسول اللہ ﷺ کے الحَرْبُ خُدْعَةٌ جنگ دھوکے کا نام ہے۔ سے تعبیر کیا ہے۔

۴۔اس آیت میں اہل ایمان کے دو ذمہ دار گروپ بتائے گئے ہیں۔ جہاد فی سبیل اللہ کرنے والا اور دوسرا تفقہ فی الدین والا۔ تا کہ کچھ مومن جہاد فی سبیل اللہ کی تیاریوں میں لگے رہیں اور کچھ دین میں صحیح فقہ وفہم حاصل کرنے میں لگ جائیں۔ اس طرح اسلام کی عظمت وشان کی نگرانی مجاہدین کریں گے اور شریعت کی پاسبانی طلبہ دین۔ جس طرح مجاہد کا خیال حکومت کرتی ہے تا کہ وہ قوی وصحتمند اور ذہین رہے اسی طرح پاسداران شریعت کا خیال بھی حکومت کرے گی تا کہ وہ بھی دین کے ابلاغ میں قوی وصحتمند اور ہوشیار رہیں۔

۵۔اس آیت میں لفظ فقہ سے مراد قرآن وحدیث کا علم ہی ہے۔ کیونکہ رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہی تھی جو دین فہمی کا ایک منبع ومصدر تھی۔ رہا انذار، تو اسے آپ ﷺ یا تو قرآن کریم سے کرتے یا حدیث مبارک سے۔ اس لئے فقیہ کے لئے قرآن کے ساتھ صحیح وحسن حدیث کا علم ہونا بھی شرط ہے۔

۶۔فقہاء دین بھی حقیقت حال کو جان کر اپنی دینی بصیرت سے بہرہ مند ہوں اور انذار کا ہنر اپنے درس وتدریس کے دوران آزمائیں۔ یہ بھی ایک ذمہ داری ہے جو اس آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ نے فقہاء دین کو دی ہے۔

۷۔افضل یہی ہے کہ فقہ اسلامی کو حاصل کرنے والے ذہین افراد ہوں۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔

رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيرُ فَقِيْهٍ، وَرُبَّ حَامِلُ فِقْهٍ إِلٰى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ۔ بہت سے فقہ کے حامل غیر فقیہ یعنی ناسمجھ ہوتے ہیں اور کچھ ایسے بھی جو فقہ ایسے شخص کو منتقل کر دیتے ہیں جو اس حامل سے بھی زیادہ فقیہ اور سمجھدار ہوتے ہیں۔

۸۔جو فتاوی یا استنباطات ہیں ان میں اختلاف کا حق بھی بعد کے فقہاء کو دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ کوئی معصوم نہیں اور نہ ہی ان کی فقاہت وحی ہے۔ لہٰذا اختلاف کی گنجائش جس طرح ان فقہاء نے اپنے شاگردوں کو دی اور جنہیں فقہی کتب میں بھی نمایاں کیا گیا ہے اسی طرح یہی حق علماء وفقہاء کے لئے ابھی تک قائم ہے۔

یہی آیت مقصد فقہ کو بھی اجاگر کر رہی ہے کہ خلق خدا کو صحیح وغلط اور حرام وحلال کی تمیز ہونی چاہئے جو انذار ہے۔ اس لئے امام شافعیؒ فرمایا کرتے:

كُلُّ الْعُلومِ سِوَى الْقُرآنِ مَشْغَلَةٌ — إِلَّا الْحَدِيثُ وَعِلْمُ الْفِقْهِ فِي الدِّيْنِ

الْعِلْمُ مَا كَانَ فِيهِ قَالَ حَدَّثَنَا — وَمَا سِوَى ذَاكَ وَسْوَاسُ الشَّيَاطِينِ

قرآن وحدیث اور علم فقہ کے علاوہ باقی سب علوم ایک شغل ہیں۔ علم وہی ہے جس میں قال حدثنا ہو اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ شیطانی وساوس ہیں۔

☆☆☆☆☆

فقہ کا موضوع: فقہ کا موضوع مکلّف یعنی بالغ، عاقل مسلمان کے افعال ہیں۔جن کے کرنے یا نہ کرنے کا مطالبہ اس سے کیا گیا ہے۔ان افعال کی حقیقت کیا ہے؟ فقہ اسلامی ہی اسے متعین کرتی ہے۔مثلاً: ایک بالغ، عاقل مسلمان کے لئے نماز قائم کرنا، زکوۃ دینا اور والدین کے ساتھ احسان کرنا فرض ہے اسی طرح غصب کرنا، چوری وملاوٹ کرنا یا والدین کے ساتھ بدسلوکی کرنا حرام کام ہیں۔یا یہ ناپسند کیا گیا ہے جسے مکروہ کہتے ہیں کہ وہ بکثرت سوال یا مال ضائع کرے یا یاوہ گوئی کرے۔یا وہ کام کرے جو مستحب وپسندیدہ ہے جیسے: فرض نماز کے بعد سنت یا نفل پڑھنا۔یا یہ کام مباح ہے جس میں کرنے نہ کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے جیسے سیب کھانا، چائے پینا۔یہی فقہ کا موضوع ہے۔

☆☆☆☆☆

لفظ فقہ کا معنی ومفہوم:

لفظ فقہ اپنے لغوی معنی کے تعین میں کچھ تاریخی وتدریجی مراحل رکھتا ہے جن سے واقفیت صحیح فقہی مفہوم کے لئے بہت اہم ہوگی۔

پہلا مرحلہ: لغت میں اس کا معنی ومفہوم **دوسرا مرحلہ:** خیر القرون میں اس کا معنی ومفہوم

تیسرا مرحلہ: متاخرین میں اس کا معنی ومفہوم۔

پہلا مرحلہ: **اہل لغت** نے اس لفظ کے معنی ادراک، فہم، اور علم کے لئے ہیں۔مگر اکثر فقہ سے مراد فہم مطلق لیتے ہیں یا فقہ کو فہم سے زیادہ اہم کہتے ہیں کیونکہ فقہ متکلم کے کلام کی مراد کا فہم ہے۔وہ فقہ سے دقیق اور گہرے فہم کا معنی نہیں لیتے۔ابن منظور نے لسان العرب میں اس کی تعریف یہ کی ہے:

اَلْفِقْهُ: اَلْعِلْمُ بِالشَّيْءِ وَالْفَهْمُ لَهُ۔وَغَلَبَ عَلَى عِلْمِ الدِّيْنِ لِسِيَادَتِهِ وَشَرَفِهِ وَفَضْلِهِ عَلَى سَائِرِ أَنْوَاعِ الْعُلُومِ كَمَا غَلَبَ النَّجْمُ عَلَى الثُّرَيَّا۔ فقہ سے مراد کسی چیز کا علم اور اس کا فہم ہے۔مگر علم دین پر اپنی سیادت، شرافت اور فضیلت کی وجہ سے یہ تمام علوم پر اس طرح حاوی ہوگیا ہے۔جیسے ستارہ ثریا پر۔

ابن فارس کہتے ہیں:

كُلُّ عِلْمٍ بِشَيْءٍ فَهُوَ فِقْهٌ، ثُمَّ اخْتُصَّ بِذَلِكَ عِلْمُ الشَّرِيْعَةِ فَقِيلَ لِكُلِّ عَالِمٍ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ فَقِيْهٌ۔ کسی بھی چیز کا علم فقہ کہلاتا ہے۔بعد میں یہ نام علم شریعت کے ساتھ مخصوص ہوگیا۔اس لئے ہر وہ عالم جو

حلال وحرام سے واقف ہو فقیہ کہلاتا ہے۔

عرب علم کو فقہ کہتے ہیں۔نحو کے امام، ثعلب، احمد بن یحییٰ نحوی اس فہم کی درجہ بندی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: آدمی کی سمجھ کے بارے میں درج ذیل الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً جب وہ علم میں کامل ہو جائے تو: فقُہ کہا جاتا ہے اور اگر معمولی سمجھ بوجھ رکھتا ہو تو فقِہ کہہ دیا کرتے ہیں۔

اس کی مزید وضاحت امام ابن حجر عسقلانی ؒ نے فتح الباری میں یوں کی ہے: فَقُہَ: قاف کے ضمہ کے ساتھ اگر یہ لفظ ہو تو وہ فقہ وفہم مراد ہے جو آدمی کے مزاج اور طبیعت میں رچ بس جائے۔ فَقِہَ یعنی کسرہ کے ساتھ ہو اس سے مراد سمجھ ہے۔اور اگر فَقَہَ زبر سے ہو تو مراد فہم میں سبقت لے جانا ہے۔

لغوی معنی آیات میں:

قرآن مجید میں بھی لفظ فقہ، فہم کے معنی میں آیا ہے۔مثلاً:

﴿قالوا یا شعیب مانفقه کثیرا مما تقول﴾(ہود:۹۱) وہ کہنے لگے اے شعیب! بہت سی باتیں جو تم کہتے ہو ہم نہیں سمجھتے۔

اسی طرح یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وإن من شيء إلا يسبح بحمده ولكن لا تفقهون تسبيحهم.﴾(الإسراء:۴۴) اور کوئی شے نہیں جو اللہ کی تسبیح نہ کرتی ہو۔مگر تم انسانو! ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔

موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا ذکر فرمایا:

﴿ واحلل عقدة من لساني يفقهوا قولي﴾(طہ:۲۸) اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ میری بات سمجھیں۔

لسان نبوی میں: احادیث میں بھی یہ لفظ اپنے لغوی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔

آپ ﷺ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو دعا دیتے ہوئے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّينِ۔ اے اللہ! اسے دین کا فہم عطا فرما۔

اسی طرح صحیح بخاری میں ہے:

إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيراً فَقَّهَهُ فِي الدِّينِ۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ کوئی بھلائی کرنا چاہتا ہے

تو اسے دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے۔

مسند احمدؒ میں ہے:

كَانَ كَلَامُ النَّبِيِّ ﷺ فَصْلًا، يَفْقَهُهُ كُلُّ أَحَدٍ، لَمْ يَكُنْ يَسْرُدُ سَرْدًا۔ آپ ﷺ کے کلمات بالکل الگ الگ ہوتے تھے جنہیں ہر کوئی سمجھ لیتا تھا۔ گفتگو لگاتار اور پے در پے نہیں ہوا کرتی تھی۔

.....اہل نجد کا وہ شخص جو بکھرے بالوں کے ساتھ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صحابہ اس کے بارے میں کہتے ہیں:

نَسْمَعُ دَوِيَّ صَوتِهِ وَلَا نَفْقَهُ مَا يَقُولُ.. (صحیح بخاری) ہم اس کی آواز کی گنگناہٹ تو سنتے تھے مگر سمجھ نہیں پاتے تھے کہ وہ کہہ کیا رہا ہے۔

اس لغوی معنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ فقہ، اپنے معنی اور مفہوم کی وجہ سے کسی خاص فن یا فکر کا نام نہیں بلکہ ہر علم کے فہم کو فقہ کہا جا سکتا ہے جس کے مختلف نام و مراتب ہیں۔

نوٹ: بعض مستشرقین کی یہ رائے ہے کہ لفظ فقہ رومی زبان کے لفظ (juris) سے ماخوذ ہے۔ یہ رائے درست نہیں۔ اس لئے کہ اولاً یہ لفظ قرآن مجید کے علاوہ قدیم عربی ادب میں بھی مستعمل ہے جو کسی بھی زبان سے مستعار نہیں بلکہ وہ اللہ کا کلام ہے دوسرا یہ کہ لفظ فقہ اور (juris) کے نطق میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

دوسرا مرحلہ: **خیر القرون میں:** اس دور کے فقہاء وعلماء نے فقہ کی متعدد تعریفات کی ہیں۔ چند درج ذیل ہیں:

پہلا معنی: علماء وفقہاء کے اختلافی دلائل کو جاننا فقہ کہلاتا ہیں۔ ہشام بن عبداللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

مَنْ لَمْ يَعْرِفْ اخْتِلَافَ الْفُقَهَاءِ فَلَيْسَ بِفَقِيْهٍ۔ جو علماء کے اختلاف کو نہیں جانتا وہ فقیہ ہی نہیں۔

امام قتادہ بن دعامہؒ فرماتے ہیں:

مَنْ لَمْ يَعْلَمِ الاخْتِلَافَ لَمْ يَشُمَّ الْفِقْهَ بِأَنْفِهِ۔ جس نے علماء کے اختلاف کو نہیں جانا اس نے فقہ کو سونگھا ہی نہیں۔

امام مالکؒ سے دریافت کیا گیا۔ کیا علماء کے اختلاف سے اہل الرائے کا اختلاف مراد ہے؟ فرمایا: نہیں بلکہ صحابہ کے اختلاف، ناسخ ومنسوخ اور مختلف الحدیث مراد ہیں۔ (جامع بیان العلم: ۳۴۵)۔ ایک اور ارشاد فرماتے ہیں: فتوی دینے کا مجاز صرف وہی شخص ہے جو اختلافی مسائل سے آگاہ ہو۔ (الموافقات ۱۶۰/۴) امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ

فرمایا کرتے: مَنْ كَثُرَ فِقْهُهٗ قَلَّ إِنْكَارُهٗ عَلَى الْمُخَالِفِيْنَ۔ جس کی فقہ زیادہ ہوگی اس کی مخالفین کے بارے میں نفرت کم ہوگی۔

ابو إسحاق الحوفیؒ کہتے ہیں:

اَلْعُلُوْمُ ثَلَاثَةٌ: عِلْمٌ دُنْيَاوِيٌّ، وَعِلْمٌ دُنْيَاوِيٌّ وَأُخْرَوِيٌّ، وَعِلْمٌ لَا لِلدُّنْيَا وَلَا لِلدِّيْنِ، فَعِلْمُ الَّذِي لِلدُّنْيَا عِلْمُ الطِّبِّ وَالنُّجُوْمِ وَمَا أَشْبَهَ ذٰلِكَ، وَالْعِلْمُ الَّذِي لِلدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ عِلْمُ الْقُرْآنِ وَالسُّنَنِ وَالْفِقْهُ فِيْهِمَا، وَالْعِلْمُ الَّذِي لَيْسَ لِلدُّنْيَا وَلَا لِلْآخِرَةِ عِلْمُ الشِّعْرِ وَالشُّغْلُ بِهٖ۔ علوم تین ہوتے ہیں۔ دنیاوی علم، دنیا اور آخرت کا علم اور ایسا علم جو نہ دنیا کا ہے اور نہ آخرت کا۔ دنیا کا علم، علم طب یا علم نجوم یا اس سے ملتے جلتے دیگر علوم ہیں۔ دنیا وآخرت کا علم، قرآن وسنت کا علم وفہم ہے۔ وہ علم جو نہ دنیا کا ہے اور نہ آخرت کا وہ علم شعر ہے اور اس سے دلچسپی ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں:

لَيْسَ الْفِقْهُ بِكَثْرَةِ الْمَسَائِلِ، وَلٰكِنَّ الْفِقْهَ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَشَاءُ فِيْ خَلْقِهٖ۔ (جامع بیان العلم ۳۴۴) یعنی فقہ زیادہ مسائل جاننے کا نام نہیں بلکہ فقہ اللہ کی عطاء ہے جسے وہ چاہتا ہے اپنی مخلوق میں اسے عطا کر دیتا ہے۔

ابن عبدالبرؒ نے اپنی کتاب **جامع بیان العلم** میں فقہ، علم اور رائے سے متعلق بے حد مفید مواد جمع کیا ہے۔ جس سے فقہ کے مفاہیم کو مزید سمجھا جا سکتا ہے۔

دوسرا معنی: فقہ سے مراد فہم قرآن ہے۔ حارثؒ بن یعقوب کہتے ہیں:

إِنَّ الْفَقِيْهَ كُلَّ الْفَقِيْهِ مَنْ فَقُهَ فِي الْقُرْآنِ وَعَرَفَ مَكِيْدَةَ الشَّيْطَانِ۔ اصل فقیہ وہی ہے جو قرآن کو سمجھے اور شیطانی چالوں کو جانے۔

سیدنا ابو الدرداءؓ کا قول ہے:

لَنْ تَفْقَهَ كُلَّ الْفِقْهِ حَتّٰى تَرَى لِلْقُرْآنِ وُجُوْهًا كَثِيْرَةً، (جامع بیان العلم ۳۴۳) تم کبھی فقہ نہیں سمجھ سکتے جب تک قرآن کی کسی آیت یا سورت کی بہت سی وجوہ نہ دیکھ لو۔

تیسرا معنی: آپ ﷺ نے اپنی حدیث کو بھی فقہ کا نام دیا۔ حدیث کے فہم وعلم کا نام بھی فقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے امت کے بیشتر علماء کو عطاء کیا ہے۔ جس میں مسائل کا ادراک ہے اور اجتہاد واستنباط وغیرہ بھی۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيهٍ، وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلٰى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ۔ بہت سے فقہ کے حامل غیر فقیہ یعنی ناسمجھ ہوتے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو فقہ کو ایسے شخص کو منتقل کر دیتے ہیں جو اس حامل سے بھی زیادہ فقیہ اور سمجھدار ہوتے ہیں۔

امام ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں: فَسَمَّى الْحَدِيْثَ فِقْهًا مُطْلَقًا وَعِلْمًا۔ آپ ﷺ نے خود اپنی حدیث کو صرف فقہ اور علم سے تعبیر کیا ہے۔ جس سے آپ ﷺ کی مراد حدیث کے الفاظ ومعانی کا بھرپور خیال کرنا ہے۔

نیز رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ سے مراد حدیث ہی تو ہے۔ اسی طرح حدیث یہ بھی واضح کر رہی ہے کہ فقیہ وہی ہوتا ہے جو دین میں صاحب بصیرت ہو۔ جو نصوص کے معانی پر متنبہ ہو اور ان سے احکام وعبر اور فوائد وغیرہ مستنبط کرنے کا ملکہ رکھتا ہو۔ أَفْقَهُ مِنْهُ میں فقہاء کے درجات ہیں جن میں افقہ وہ ہے جو نصوص سے اللہ تعالیٰ کی مراد اور اس کے دیئے گئے احکام اور قوانین کو زیادہ سمجھتا ہو۔

چوتھا معنی: وہ باتیں جو نفس کے لئے مفید یا مضر ہوں ان کا جاننا بھی فقہ کہلاتا ہے۔ یعنی علم الکلام یا عقائد وغیرہ بھی فقہ کہلاتے ہیں۔ یونانی علوم کی اشاعت کے بعد جب متکلمین نے مناظروں کا آغاز کیا اور تاویلات کی گرم بازاری ہوئی تو علم الکلام (یعنی اعتقاد، وجوب ایمان، اخلاق وتصوف اور اعمال) کو بھی فقہ سے تعبیر کیا گیا۔ الفقہ الأکبر جو امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب کتاب ہے۔ اس میں فقہ کا معنی یہ کیا گیا ہے:

اَلْفِقْهُ: مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَالَهَا وَمَا عَلَيْهَا۔ یعنی نفس کی ذمہ داریوں (یعنی اس پر اور اس کی ذمہ داری) کے سمجھنے کا نام فقہ ہے۔

یہ تعریف امام محترمؒ کے زمانہ میں بہت ہی مناسب تھی۔ کیونکہ ان کے دور میں فقہ، علوم شرعیہ سے الگ کوئی مستقل علم (Science) نہیں تھا۔ (الفقه الإسلامي وأدلته ۱/۱۵)

پانچواں معنی: فقہ سے مراد حکمت، اور علم دین ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿واذكرن ما يتلى في بيوتكن من آيات الله والحكمة﴾۔ تم اپنے گھروں میں پڑھی جانے والی آیات الٰہی کو اور حکمت کو یاد کرو۔

امام مالکؒ اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں: حکمت سے مراد سراسر اللہ کی اطاعت، رسول کی اتباع اور دین الٰہی میں تفقہ اور عمل کا نام ہے۔ بہت سی احادیث میں لفظ فقہ بمعنی علم دین مستعمل ہوا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

اَلنَّاسُ مَعَادِنُ، خِيَارُهُم فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُم فِي الإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوا۔ (صحیح بخاری) لوگ کانوں کی مانند ہوا کرتے ہیں۔ جاہلیت میں ان کا بہترین انسان اسلام قبول کرنے کے بعد بھی بہترین شمار ہوگا بشرطیکہ وہ دین کا گہرا فہم پائیں۔

صحیح بخاری (۴۳۹۰) میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی مروی ہے جو آپ ﷺ نے اہل یمن کے بارے میں فرمایا:

أَتَاكُم أَهلُ الْيَمَنِ أَضْعَفُ قُلُوبًا وَ أَرَقُّ أَفْئِدَةً، اَلْفِقْهُ يَمَانٍ وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَّةٌ۔ مسلمانو! تمہارے پاس یمنی آئے ہیں جو بہت نرم دل اور رقیق القلب لوگ ہیں، فقہ یمنی ہی ہے اور حکمت بھی یمنی۔

بعض علماء نے دیگر احادیث کو سامنے رکھ کے فقہ سے مراد یہاں حکمت، علم وفہم دین اور سمجھ داری بھی لی ہے۔ جیسا کہ امام بدرالدین العینیؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں۔ حدیث میں فقہ سے مراد دین کا گہرا فہم ہے۔

اس مفہوم میں یہ مثال بطور ایک دلیل کے دی جاسکتی ہے کہ امام شافعیؒ کو قرآن مجید میں سے اجماع کی حجیت چاہئے تھی۔ اس نیت سے انہوں نے قرآن مجید کو تین سو بار بغور پڑھا مگر کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ پھر کوشش فرمائی تو اس بار انہیں قرآن مجید کی ایک آیت میں اجماع کی حجیت کی دلیل سوجھ گئی جو سورۃ النساء کی درج ذیل آیت تھی:

﴿ومن يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدى ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ما تولى ونصله جهنم و ساء ت مصيرا﴾۔ (النساء: ۱۱۵) جو ہدایت کے واضح ہوجانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرے گا اور اہل ایمان کے راستے کے علاوہ کی پیروی کرے گا تو ہم بھی جدھر وہ مڑتا ہے اسے موڑیں گے اور اسے جہنم پہنچا کر ہی چھوڑیں گے جو بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

امام شافعیؒ کو دلیل یہ سوجھی کہ اس آیت میں سَبِيلُ الْمُؤمِنِين سے مراد اجماع ہے یعنی اہل ایمان نے کوئی راستہ بالاتفاق اپنایا ہوا ہے مگر کچھ لوگ یا فرد واحد اس راستہ یا طریقہ کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ یا راستہ اپنا لیتے ہیں وہ گویا اجماع سے ہٹا ہوا راستہ ہے۔ مثلاً عصر کی چار رکعتیں مسلمانوں پر فرض ہیں۔ اب اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ چار رکعت نہیں بلکہ تین یا پانچ رکعتیں ہیں تو یہ اجماع سے ہٹا ہوا راستہ ہے۔ یہ معلوم بھی ہوا کہ اجماع کی دلیل کے لئے نص (Text) کا ہونا ضروری ہے۔ امام شافعیؒ کو اجماع کی دلیل کا سوجھنا ہی فقہ ہے۔

مندرجہ بالا معانی سے یہ نتائج سامنے آتے ہیں کہ فقہ محض مسلکی مسائل یا ایک ہی امام وعالم کی محدود اجتہادی کوششوں کا نام یا اختلاف علم وعلماء وفقہاء نہیں بلکہ **فقہ**: دینی حکمت، اور اللہ کے دین پر عمل اور نفس کی مفید یا مضر باتوں کا علم، یعنی علم الکلام یا عقائد وغیرہ سبھی کو محیط ہے۔

مگر خیر القرون میں لفظ فقہ صرف علم دین کے لئے مختص تھا۔ جس کی نمائندگی اس دور میں صرف قرآن وسنتِ رسول ہی کیا کرتے تھے۔ اسی طرح مذاہب اربعہ ہوں یا خمسہ، جن ائمہ کے نام سے یہ مذاہب ایجاد ہوئے ان کے بانی فقہاء کی علمی، دینی اور اجتہادی کاوشیں بھی فقہ کہلائی جا سکتی ہیں۔ اور جو علماء وفقہاء ان کے بعد آئے اور جنہوں نے اپنے دور کے اٹھتے مسائل کا حل قرآن وحدیث کی فہم وفراست سے پیش کیا۔ وہ بھی فقہ ہے۔

اسی لئے صدر اول کے علماء، فقیہ سے مراد اس عالم کو لیتے ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے فہم میں سب سے آگے ہو۔ محض کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ کو یاد کر لینے سے آدمی فقیہ نہیں بن جاتا۔ مثلاً ایک شخص جلد بازی میں وضو کرتا ہے اور پھر جماعت کو پانے کے لئے دوڑ لگاتا ہے جب کہ دوسرا آرام سے وضو کرتا ہے اور ہر عضو کو اچھی طرح دھوتا ہے اور بعد از وضو وہ سکون ووقار سے جماعت کو پانے کیلئے چلتا ہے ظاہر ہے دونوں میں دوسرا ہی دین کو زیادہ سمجھتا ہے۔ یہی اس کی فقہ ہے اور پہلا اس فہم سے کورا۔

تیسرا مرحلہ: **لفظ فقہ متأخرین میں**: زمانہ خیر القرون کے بعد اس کا مفہوم بتدریج تبدیل ہو گیا۔ یہ کس طرح تغیر پذیر ہوا؟ ذیل میں ہم دو عظیم المرتبت فقہاء، دانشور اور مفکر حضرات کے اقتباسات نقل کرتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہی ذوق اور اس کے مفہوم میں محدودیت اور بتدریج تبدیلی کی لہر کیسے آئی؟ مسلم الثبوت کے مصنف محب اللہ بن عبدالشکور بہاری (م: ۱۱۱۹ھ) اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:

> فقہ کا لفظ ابتداء میں شریعت مطہرہ کے علم پر بولا جاتا تھا۔ جن میں مہلکات اور منجیات سرفہرست تھیں۔ اسی لئے امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کی تعریف یہ فرمائی: یہ نفس کی ذمہ داریوں کا نام ہے۔ اور عقائد میں لکھی گئی اپنی کتاب کا نام بھی انہوں نے الفقہ الأکبر رکھا۔۔۔۔ علم کلام کے بعد یہ لفظ تصوف اور اخلاق پر بھی بولا جانے لگا اسی لئے ریا اور حسد کی حرمت کو فقہ کہا گیا ہے۔ مدت تک یہی عرف رہا۔ پھر عرصہ بعد متاخر فقہاء کی کتب میں فقہ الفروع تو آ گیا مگر علم طریقت سے وہ خالی ہو گئیں۔ (مسلَّم، منہیہ: ۵)

امام غزالیؒ بھی اس سلسلے میں اپنی منفرد رائے رکھتے ہیں اور جسے خاصا سراہا گیا ہے۔ یہ رائے انہوں نے اپنی معروف کتاب احیاء علوم الدین ۲۴/۱ میں دی ہے اور جس کا تذکرہ کاتب چلپی نے کشف الظنون ۹۱/۲ میں اور طاش کبریٰ زادہ نے مفتاح السعادۃ ۶/۲ میں بغیر کسی تنقید کے کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> شرعی علوم میں مذموم اور ناپسندیدہ علوم کا اختلاط اور التباس اس لئے ہوا کہ علوم کے اچھے نام جو زمانہ سلف میں بولے جاتے تھے بعد میں اپنی فاسد اغراض کے لئے بدل دیے گئے اور ان کے ایسے معنی ومفہوم لئے گئے جن پر

خیر قرون میں قطعاً اطلاق نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی ائمہ سلف ان الفاظ سے یہ مطالب مراد لیتے تھے۔ یہ پانچ نام ہیں: فقہ، علم، توحید، تذکیر اور حکمت۔ یہ بہت اچھے نام ہیں۔ ان کے جاننے والوں کا دین میں بڑا مقام تھا۔ لیکن اب ان کو مذموم معانی پر بولا جانے لگا ہے۔ ان کے جاننے والوں سے اب دل نفرت کرتا ہے کیونکہ ان ناپسندیدہ معانی پر ان کا اطلاق عام ہوگیا ہے۔ پہلا لفظ فقہ ہے جس کے مفہوم میں روایت اور سلف کی طرف نسبت کی بجائے ان لوگوں نے تخصیص پیدا کر دی ہے۔ اب فتووں میں لفظ فقہ، غیر معروف اور حیرت انگیز فروع پر بولا جاتا ہے۔ اس پر طویل گفتگو اور بال کی کھال اتارنے اور ان کے وجوہ وعلل میں تعمق کا نام فقہ رکھ دیا گیا ہے۔ جو ان میں زیادہ وقت ضائع کرے اسے افقہ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ لفظ خیر القرون میں نفس کے امراض کی پہچان اور علوم آخرت کی معرفت پر بولا جاتا تھا۔ اور آیت قرآنی سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ دین کے فہم سے جو انذار اور خوف پیدا ہوتا ہے اسے فقہ سے تعبیر کیا جاتا۔ طلاق، عتاق، لعان، سلم، اجارہ وغیرہ مسائل کے جاننے سے نہ انذار ہوتا ہے اور نہ خوف۔ بلکہ ایسے مسائل میں مشغولیت کی وجہ سے دل مزید سخت ہو جاتا ہے۔

خیر القرون میں فقہ کا مفہوم وسیع تھا جس میں عقائد، اعمال، اخلاق، آداب بھی شامل تھے بعد میں علوم کی جب تقسیم ودرجہ بندی ہوئی تو پھر یہ علم بھی سکڑ گیا۔ اس تقسیم میں معتزلہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ عقائد کی بحث کو فقہ سے الگ کرکے انہوں نے پہلے پہل ان مسائل سے اپنی جان پہچان کرائی اور پھر اصول فقہ میں اپنی برتری۔ ہمارے یہاں صرف اعمال سے متعلق مسائل کا نام فقہ رکھ دیا گیا۔ مسلکی رجحانات نے فقہ کی بتدریج مزید تقسیم در تقسیم کر دی اور ہر فقیہ کی فقہ ایک مستقل نام پاگئی اور یوں فقہ اسلامی کے وسیع وجہاں گیر بہتے سمندر سے اور اس کی گہرائی میں پھوٹنے والے شیریں وشفاف چشموں سے دریاؤں اور ندیوں کو نکال کر فقہ کو محدود معنی دے دیا گیا۔ جس کی وسعت سے عام وخاص بھی محروم ہوگئے۔ پھر تعصبات کے جنگل نے محنت، فکر، تدبر، دانش اور ترقی تک کی سعادت ان سے چھین لی۔ حق بکھرا تو خود بھی بکھر گئے مگر اپنی پارہ پارہ حالت کو حق سمجھ بیٹھے۔ اسی طرح قرآن، حدیث، عقائد یا اصول دین، اخلاق وآداب اور توحید وغیرہ کے الگ الگ علوم متعارف کرائے گئے اور جن کے متخصصین ظاہر ہوئے اور کیے بھی گئے۔

اصطلاحی تعریف: ذیل میں دی گئی فقہ کی یہ تعریف خیر القرون کے بعد کے علماء نے پیش کی ہے:

عِلْمُ الْفِقْهِ : هُوَ الْعِلْمُ بِالأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ الْفَرْعِيَّةِ الْمُتَعَلِّقَةِ بِأَفْعَالِ الْعِبَادِ، فِي عِبَادَاتِهِمْ، وَمُعَامَلاتِهِمْ، وَعَلاقَاتِهِمُ الأُسَرِيَّةِ، وَجِنَايَاتِهِمْ، وَالْعَلاقَاتِ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ بَعْضُهُمْ وَبَعْضٍ،

وَبَيْنَهُمْ وَبَيْنَ غَيْرِهِمْ، فِي السِّلْمِ وَالْحَرْبِ، وَغَيْرِ ذٰلِكَ۔ وَالْحُكْمُ عَلٰى تِلْكَ الْأَفْعَالِ بِأَنَّهَا وَاجِبَةٌ، أَوْ مُحَرَّمَةٌ، أَوْمَنْدُوبَةٌ، أَوْ مَكْرُوهَةٌ، أَوْ مُبَاحَةٌ، وَأَنَّهَاصَحِيحَةٌ، أَوْ فَاسِدَةٌ أَوْ غَيْرُ ذٰلِكَ، بِنَاءً عَلَى الْأَدِلَّةِ التَّفْصِيلِيَّةِ الْوَارِدَةِ فِي الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَسَائِرِ الْأَدِلَّةِ الْمُعْتَبَرَةِ۔ علم فقہ، شریعت کے ان فروعی احکام کے علم کا نام ہے جن کا تعلق بندوں کے افعال سے ہے مثلاً ان کی عبادات ومعاملات، ان کے خاندانی تعلقات، دین کے حق میں ان کی زیادتیاں، زمانہ امن وجنگ میں مسلمانوں کے اپنوں اور غیروں سے تعلقات وغیرہ۔ پھران افعال کے بارے میں اس حکم کا علم کہ یہ واجب ہیں یا حرام، مندوب ہیں یا مکروہ یا مباح یا یہ کہ وہ صحیح ہیں یا غلط وفاسد وغیرہ۔ اس علم کی اٹھان ان تفصیلی دلائل پر ہی ہوگی جو کتاب وسنت اور دیگر معتبر دلائل سے ماخوذ ہوں۔

علماء فقہ نے لفظ فقہ کی اصطلاحی تعریف یہ کی ہے:

هُوَ الْعِلْمُ بِالْأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ الْعَمَلِيَّةِ الْمُكْتَسَبِ مِنْ أَدِلَّتِهَا التَّفْصِيلِيَّةِ۔ شریعت کے ان عملی احکام کا علم جو ادلہ تفصیلیہ سے ماخوذ ہو۔

چند الفاظ کی وضاحت: درجہ بالا تعریف میں:

علم ...... دراصل جہل اور اس کی تمام انواع کی ضد ہے۔ علم کسی شے کے مکمل ادراک کو کہتے ہیں۔ جیسے کل جزء سے بڑا ہوتا ہے۔ یا نیت، عبادت میں شرط ہے۔ اس میں یقین اور ظن دونوں شامل ہیں۔ اس لئے کہ کچھ فقہی احکام یقینی اور قطعی دلیل سے ثابت ہوتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو دلیل ظنی سے ثابت ہوتے ہیں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نصوص صحیحہ وضعیفہ سے عقلی راہنمائی لی جاتی ہے اس لئے اجتہاد واستنباط کی غالب تعداد ظنی علم ہے۔

احکام شرعیہ...... اس کی لفظی ومعنوی وضاحت یہ ہے:

حکم: کی جمع احکام ہے۔ **لغت میں حکم** کسی کام میں مثبت یا منفی چیز ثابت کرنا۔ کو کہتے ہیں۔ مثلاً آگ جل رہی ہے۔ یہ ایک حکم ہے جو مثبت ہے۔ یا آگ نہیں جل رہی ہے۔ یہ بھی ایک حکم ہے جو منفی ہے۔ شارع بھی اپنی بات سے ایک حکم جب دیتا ہے تو دراصل وہ ایک مثبت یا کسی منفی چیز کا کہہ رہا ہوتا ہے۔

اصطلاحاً: جو خبر بھی ہو اس میں صحیح غور وفکر کے نتیجے میں حتمی یا ظنی طور پر مطلوب تک پہنچنا۔ حکم کہلاتا ہے۔ خبر کا یہی مطلوب، حکم شرعی کہلاتا ہے۔ فقہاء کرام لفظ حکم کو فیصلہ شدہ شرعی مسئلے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

حکم سے مراد: شارع جب مکلف سے خطاب کرتا ہے تو اس میں کسی کام کے کرنے کا تقاضا ہوتا ہے یا اسے اختیار دیتا ہے یا وہ وضعی ہوتا ہے۔اس خطاب کا اثر جب بندے میں نظر آئے تو یہی حکم مراد ہوتا ہے۔مثلاً: نماز ادا کرنے کا حکم دیا۔اب بندے میں اس کا اثر نظر آئے۔حکم کو حکم سمجھے یعنی اسے واجب گردانے۔اسی طرح دیگر احکام ہیں۔بندہ مومن کو ان افعال کا فرض،مندوب،حرام،مکروہ،مباح،صحیح،فاسد یا باطل ہونا معلوم ہو۔یعنی یہ کیوں فرض ہے اس کی دلیل کیا ہے؟ کیونکہ دلیل ہی کے ضمن میں حکم آ جاتا ہے۔

شَرْعِیَّہ سے مراد وہ احکام ہیں جو شرعی ہوں یعنی جو قرآن وسنت سے ماخوذ ہوں خود ساختہ نیک وبد اعمال شرعی احکام نہیں کہلائیں گے۔کیونکہ ان پر شریعت کا رنگ نہیں چڑھا ہوتا۔فقیہ کا یہ فرض ہے کہ اپنے فکر وتأمل اور قوت استدلال کے ذریعے احکام اور ان کے دلائل میں اس منطقی ارتباط کو سمجھے جو دونوں میں موجود ہے۔غیر شرعی احکام اس لفظ سے از خود خارج ہو گئے۔مثلاً عقلی احکام جہاں عقل کا استعمال ہوتا ہے مثلاً ایک دو کا آدھا ہے۔اور شرعیہ کہنے سے لغوی احکام بھی خارج ہو گئے جیسے: فاعل کے احکام کیا ہیں۔یا مبتدا اور خبر کا حکم کیا ہے یا حسی احکام بھی خارج ہو جاتے ہیں جیسے: برف ٹھنڈی ہے۔

عَمَلِیَّہ: اس شرط سے علمی اور اعتقادی احکام اب نکل گئے۔جیسے ایمان کے مسائل جو علم عقیدہ اور اصول دین کہلاتا ہے۔اسی طرح بعض علماء کے نزدیک اصول فقہ بھی عملیہ کی قید سے خارج ہو گیا۔علمی سے مراد تمام فقہی احکام نہیں بلکہ ان کی اکثریت علمی ہے۔جب کہ ان میں سے کچھ نظری بھی ہیں جیسے: اختلاف دین وراثت میں مانع ہوتا ہے۔

فَرْعِیَّہ: سے مراد وہ احکام جن کا تعلق اصول سے نہیں بلکہ فروع سے ہو۔اصول تو مصادر ہیں یا نصوص۔جو شریعت کی اصل ہیں۔درخت کے تنے سے جس طرح ٹہنیوں یا شگوفوں کا جو تعلق ہوتا ہے وہی فروع کا اصل سے ہے۔

المُکْتَسَب: یہ علم کی صفت ہے۔جس کا معنی ہے: کہ فقہ ایسا علم ہے جو کتاب وسنت کے دلائل سے مستنبط کیا ہوا ہوتا ہے۔

افعال العباد: بندوں کے کام۔ان کا تعلق قلب سے بھی ہے جیسے نیت کرنا،اور غیر قلب سے بھی۔جیسے انسان کی اپنی ممارست قرأت،یا نماز پڑھنا وغیرہ۔یہ ظاہری وباطنی اعضاء کا عمل ہوتا ہے۔

بناء: بنیاد: مراد یہ کہ اس علم فقہ کی بنیاد قرآن وسنت میں غور وفکر اور اجتہاد پر مبنی اور مستنبط ہو۔

ادلہ: proofs,evidences or indications دلیل کی جمع ہے لغت میں دلیل مرشد وراہنما کو کہتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے:

إِذَا كَانَ الْغُرَابُ دَلِيْلَ قَوْمٍ سَيَهْدِيْهِمْ طَرِيْقَ الْهَالِكِيْنَا

جب کوئی کوا کسی قوم کا مرشد وراہنما ہو تو وہ انہیں ہلاکت والا راستہ ہی دکھائے گا۔

☆ یہ دلائل قرآن کریم کی آیات ہیں یا صحیح وحسن احادیث نبویہ ہیں۔ ان دونوں ادلہ پر سب فقہاء کرام کا اتفاق ہے۔ نیز اجماع وقیاس بھی دلائل ہیں مگر ذیلی۔ جس پر بعض فقہاء کرام کا اختلاف بھی ہے۔

☆......یہ بھی امت مسلمہ مانتی ہے کہ تمام مجتہدین اگر کتاب وسنت یا قیاس سے مستنبط حکم پر متفق ہو جائیں تو وہ خطا سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایک تیسری اصل پیدا ہوئی جسے اجماع کہا جاتا ہے جو قیاس سے زیادہ قوی ہے۔ اجماع، چونکہ حکم قطعی یا حکم ظنی کا فائدہ دیتا ہے اور قیاس، حکم ظنی کا۔ اس لئے یہ بھی ادلہ ہیں۔

☆ .... مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ شریعت کے تمام احکام مصالح اور علل پر مبنی ہیں۔ اس لئے کتاب وسنت سے ایک چوتھی اصل متفرع ہوئی جسے قیاس کہا جاتا ہے۔

☆......اس طرح ادلہ احکام چار ہوئے۔ کتاب، سنت، اجماع اور قیاس۔

☆......ادلہ احکام ہونے کی حیثیت سے ان چاروں پر امت کے سواد اعظم کا اتفاق ہے۔

ان کے علم سے مراد یہ ہے کہ:

☆......فقیہ کو ان کی حجیت کے بارے میں علم ہو کہ استدلال کے مراتب کیا ہیں؟

☆......نص کیا مفہوم اور دلیل دے رہی ہے؟

☆......اجماع کا معنی کیا ہے؟ اس کی شرائط کیا ہیں۔

☆......قیاس کی تعریف، اقسام اور اس کی شرائط صحت وغیرہ کیا ہیں؟

☆......ابو القاسم محمد بن احمد بن جزیؒ (م۔۷۴۱ھ) نے تقریب الوصول میں متفقہ وغیر متفقہ مصادر کی تفصیل دیتے ہوئے ان کی تعداد بیس بتائی ہے۔

یہ ادلہ دو قسم کے ہیں: ادلہ عقلیہ اور ادلہ نقلیہ۔

اَدِلَّہ نَقْلِیَّہ: یہ کتاب وسنت ہیں اور ان کے ذیلی مختلف فیہ ادلہ، اجماع، عرف، ہم سے پہلے کی شریعت

اورقول صحابی وغیرہ ہیں ۔یعنی یہ روایت ونقل کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔

اَدِلَّه عَقْلِیَّه: یہ قیاس ،مصالح مرسلہ، استحسان، سد ذرائع اور استصحاب جیسے ادلہ ہیں۔عقل ان سے دلائل لے کر پیش کرتی ہے۔یہ بھی مختلف فیہ ہیں۔

اَدِلَّه تَفْصِیْلِیَّه :

☆......آیات کتاب اور احادیث سنت ہیں۔ وہ نصوص جو کسی بھی معین مسئلہ کے بارے میں دلیل اور حکم کی تفصیل بتادیں۔انہیں ادلہ تفصیلیہ کہتے ہیں۔مثلاً:

﴿أقيموا الصلوة﴾۔نماز قائم کرو۔ یہ آیت تفصیلی دلیل ہے جو ایک مخصوص مسئلہ نماز کی اقامت کے بارے میں حکم دے رہی ہے۔

﴿ وآتوا حقه يوم حصاده﴾۔اور فصل کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کردو۔ یہ بھی ایک اور مخصوص مسئلے عشر کا حکم بتارہی ہے اور اس کی دلیل ہے۔اسی طرح:

﴿وكلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الأبيض من الخيط الأسود من الفجر﴾۔ کھاؤ پیو یہاں تک کہ سفید دھاری کالی دھاری سے فجر کی ظاہر ہو جائے۔ یہ بھی ایک خاص مسئلے کی تفصیلی دلیل ہے اور وہ سحری فجر تک کھانا ہے۔

☆ ان میں ہر آیت فقہ کے مختلف ابواب میں سے ایک معین باب کے بارے میں حکم بتارہی ہے۔

☆......انہیں ادلہ تفصیلیہ یا ادلہ جزئیہ بھی کہتے ہیں۔یعنی ایسے ادلہ جو جزئی اور مفصل ہوں۔ان کا مبحث فقہ یا علم الخلاف ہوا کرتے ہیں۔یہی فقہاء کا موضوع بحث ہوتا ہے۔

☆...... رہے وہ ادلہ جو اجمالی ہیں یا کلی، وہی دراصل مصادر شریعہ (کتاب وسنت، اجماع وقیاس، عام وخاص اور امر ونہی) ہیں یا ان سے متعلق قواعد۔ یہ اہل اصول کا موضوع بحث ہوا کرتے ہیں۔اسلامی فقہ کے یہ سب دلائل اپنے مسائل کے ساتھ بطور دلیل ہمراہ ہوتے ہیں۔

تبصرہ: متاخرین کی یہ تعریف فقہ، کتاب وسنت یا متقدمین کے ہاں وارد لفظ فقہ کے مفہوم کے مقابلے میں بہت محدود ہے کیونکہ کتاب وسنت میں لفظ فقہ، شریعت وعقیدے دونوں کو شامل ہے۔جیسے امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کی یہ تعریف کی: مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَالَهَا وَمَا عَلَيْهَا۔یعنی نفس کی کیا ذمہ داری ہے اور کیا نہیں؟ اس کی معرفت کا نام فقہ ہے۔جن

میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات، اس کی وحدانیت اور تمام نقائص سے اس کے پاک ہونے کا اقرار، اس کی خشیت، حقوق اللہ کی معرفت، اور انبیاء ورسل کی معرفت جہاں شامل ہے وہاں اخلاق وآداب کا علم اور سچی بندگی کے لئے محض اللہ کے لئے قیام وغیرہ بھی شامل ہیں جسے علم التوحید کہتے ہیں۔ اس لئے کہ عقیدہ کا صحیح فہم نہ ہو یا وہ خراب ہو تو فروعی فقہی مسائل کی حیثیت باقی کیا رہ جاتی ہے۔

نوٹ: احکام شرعیہ کی وضاحت سے غیر شرعی احکام مثلاً عقلی احکام اس علم سے خارج ہو گئے۔ جیسے ایک دو کا آدھا ہوتا ہے۔ لغوی احکام بھی اس سے نکل گئے۔ جیسے: فاعل، مبتدا اور خبر کے احکام وغیرہ۔ متاخر فقہاء کی غالب اکثریت یہی معنی لیتی ہے۔ نیز ان کے نزدیک احکام شرعیہ کا تعلق عمل یعنی عبادات اور معاملات سے ہوتا ہے نہ کہ عقائد وایمانیات اور اخلاق سے۔

☆ .... یہ احکام غور وفکر اور استدلال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ محض نقالی یا بے سوچی سمجھی بات نہیں ہوتی۔ مثلاً حرمت علیکم أمھاتکم۔ تم پر تمہاری مائیں حرام کردی گئی ہیں۔ اس آیت میں مسئلہ ماؤں کے ساتھ نکاح کا ہے۔ اور اس مسئلہ کے بارے میں ایک مقررہ حکم کو بتاتی ہے۔ وہ حکم ہے ﴿**حرمت علیکم امھاتکم**﴾، أي حرمت نکاح أمھاتکم۔ جو ایک دلیل ہے۔

دین اور مذہب میں فرق: فقہی مکاتب کے ہاں لفظ مذہب۔ مخصوص فقہی سوچ یا نظریے کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ اس لئے مناسب لگتا ہے کہ لفظ دین کے مقابلے میں اسے واضح کر دیا جائے۔

دین: اسلام کے لئے دین کا لفظ قرآن پاک اور احادیث شریفہ میں عام مستعمل ہوا ہے۔ اس لئے کہ دین (راستہ، عقیدہ وعمل کا منہج، طریقہ زندگی) بتدریج نازل ہوا اور مکمل صورت میں ہمیں مل گیا۔ جو سب آسمانی وحی ہے اور مقدس ہے۔ جس کا اعلان قرآن کریم میں واشگاف الفاظ میں کیا گیا ہے: ﴿إن الدین عند الله الإسلام﴾ یقیناً اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اگر کوئی ہے تو وہ اسلام ہے۔ اس آسمانی دین میں کسی انسانی فکر یا سوچ کا کوئی دخل نہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں بذریعہ وحی ملا ہے جس کے رسول اللہ ﷺ بھی پابند ہیں۔

مذہب: یہ ہماری اسلامی تاریخ کے دین کے ماہر علماء وفقہاء کی اس فکر کا نام ہے جو انہوں نے دین کے کسی اہم مسئلے پر غور وفکر کے بعد اپنی رائے کی صورت میں دی۔ اس سوچ اور فکر کو جب اپنایا جاتا ہے تو اسے مذہب نام دیا

جاتا ہے۔ اسی لئے مذاہب اربعہ یا چاروں مذاہب کی اصطلاح عام ہے۔ اور ہر مذہب اپنا فقہی مسئلہ بتاتے وقت یہی کہتا ہے کہ ہمارے مذہب میں یوں ہے اور فلاں مذہب میں یہ ہے۔ نیک نیتی سے اگر سوچا جائے تو یہ ایک رائے یا اس مسلک کا نام ہے جو کسی امام نے دی یا اپنائی۔ مگر بعد میں اسے باقاعدہ اس امام کی طرف منسوب کرنا اور اس پر سختی سے کاربند ہونا کیا اس کی کوئی معقول توجیہ ہے؟ اور کیا یہ امت کے حق میں مفید ہے؟

دین اور مذہب کی اس تعریف کے بعد اب یہ جاننا کوئی مشکل نہیں کہ ان میں کیا فرق ہے۔ دین اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا ہوا ایک طریقہ زندگی وعقیدہ ہے اور مذہب ایک عالم کی فکر کو اپنانے کا نام ہے۔ دین ایک مقدس شے ہے اور مذہب میں بہر حال معصومیت نہیں ہوسکتی اس میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی خطا اور غلطی کا امکان ہے۔ دین کی طرف نسبت کرنا تو قرآن اور سنت رسول اللہ کا مطالبہ ہے ﴿هو سمكم المسلمين﴾ مگر مذہب کی طرف نسبت کرنا کوئی دلیل نہیں رکھتا بلکہ اکابر کے بارے میں غلو کا نظریہ چھلکتا ہے۔ دین کی اتباع بہر صورت فرض ہے اس کے انکار سے مومن مسلم نہیں رہتا جب کہ مذہب ایک فرد کی سوچ یا رائے کے ساتھ سختی سے چمٹ جانا ہے اس کا انکار بھی کر دیا جائے تو مسلمان بہر حال مسلمان ہی رہتا ہے۔

کسی فرد خواہ وہ عالم ہو یا فقیہ اس کی رائے دین میں کیا حیثیت رکھتی ہے؟ بس اتنی کہ اگر اس کی رائے دین کے اصول اور عقائد کے عین مطابق ہے تو سر آنکھوں پر اور اگر نہیں تو ظاہر ہے اس عالم کو نبی یا رسول کا مقام نہیں دیا جاسکتا۔ اس کی رائے بہ احترام ایک طرف رکھ دی جائے گی۔ اس میں نہ عالم یا فقیہ کی توہین ہے اور نہ ہی روز قیامت اس کی پوچھ ہے۔ نہ ہم اس کے اخلاص پر شک کرنے کے روادار ہیں اور نہ ہی اس رائے کو قبول کر کے ہم اس کی شان کو بلند کر سکتے ہیں۔ ہاں حدیث رسول کے مطابق یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اگر اس کی رائے دین کے عین موافق ہے تو اسے دوگنا ثواب ملے گا اور اگر مخالف ہے تب بھی اللہ تعالیٰ اس کے اخلاص کی وجہ سے اسے ایک ثواب ضرور دے گا۔

فقہ، شریعت اور قانون

ان تینوں علوم کے لغوی و اصطلاحی فرق کو سمجھنا بھی ضروری ہے تاکہ ہر علم کو اس کا مناسب مقام دیا جا سکے۔

فقہ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف آپ پڑھ چکے اور تاریخی اعتبار سے بتدریج اس کے مفہوم میں جو تبدیلی آئی وہ بھی آپ جان چکے۔ ہمارے دور میں رائج فقہ کی اب دو قسمیں ہیں:

مذہبی فقہ:

...یہ وہ فقہی کوشش ہے جو ہر مسلک و مذہب کے علماء و فقہاء نے سرانجام دی۔ جن کا مقصد اپنی اپنی مسلکی فقہ کی اشاعت و ترویج ہے۔

...یہ فقہ عموی طور پر اپنے مسلک یا امام یا مجتہد کے علم وفہم، اقوال و استنباط اور اجتہاد کے ارد گرد گھومتی ہے اور اسی کے نام سے معروف بھی ہوتی ہے جیسے فقہ جعفری، فقہ شافعی اور فقہ حنفی وغیرہ۔ دیگر فقہاء کے فقہی استنباطات کے مقابلے میں اپنی ترجیح قائم کرنا اس فقہ کا سب سے اولین اور بنیادی کام ہوتا ہے۔ اس فقہ کو اپنی منشورات وفتاوی میں بھی نمایاں کیا جاتا ہے۔

......مدارس، حوزہ علمیہ اور مساجد اس کا اصل مرکز ہیں۔

......چونکہ یہ فقہ سوسائٹی کی نشوونما اور ارتقاء کے ساتھ آگے نہیں بڑھ سکتی اس لئے ایسی مذہبی فقہ کا نفاذ کسی جج کے ذریعے ممکن ہوا اور نہ ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ جن حالات میں مجلۃ الاحکام العدلیہ یا فتاوی عالمگیر یہ لکھا گیا وہ حالات مسلمانوں کو آج درپیش نہیں۔ مزید یہ کہ یہ فقہ، فقہ اسلامی کا ایک جزو تو ہوسکتی ہے مگر اسے مکمل اسلامی شریعت کہنا مبالغہ آرائی ہوگا۔ ایسی فقہ مذہبی فقہ کہلاتی ہے۔

......اس مذہبی فقہ کی بقاء کے لئے نظریہ یہی باور کرایا جاتا ہے کہ ان ائمہ ہدی کے عطا کئے گئے استنباطات و اجتہادات کا علم غیر معمولی اور ابدی شاہکار ہے اس لئے ایسی باکمال ہستیاں اب امت مسلمہ کو کہاں نصیب ہوسکتی ہیں لہٰذا ہمارے امام برحق کے علم وفضل سے امت مستفید ہوتی رہے اور مزید اجتہادی کوشش میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔ مگر سوال یہ ہے پھر دوسرے ائمہ کا کیا کیا جائے؟ اور انہیں برحق سمجھا جائے یا ناحق؟

......ایسی فقہ میں ضروری نہیں کہ شریعت کے ہر باب کے بارے میں مسائل بتائے گئے ہوں۔ اس لئے کہ بعض موضوعات پر ان ائمہ کرام سے ایک مسئلہ بھی بیان شدہ نہیں ہوتا۔ کتب فقہ بھی ان کی رائے کے اظہار سے خالی ہوتی ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے: موجودہ فقہ خلافت عباسیہ میں بنی۔ جسے زمین پر کلی اقتدار حاصل تھا۔ چنانچہ یہ مدون فقہ یہ تو بتاتی ہے کہ مسلمان جب حکمراں حیثیت میں ہوں تو ان کے لئے شرعی احکام کیا ہیں؟ اس میں ایسے ابواب کثرت سے پائے جاتے ہیں لیکن اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ مسلمان جب اپنے آپ کو غیر حکمراں حیثیت میں پائیں تو اس وقت ان کے لئے کیا شرعی حکم ہے تو اس کا واضح جواب آپ کو موجودہ مدون فقہ میں نہیں ملتا۔ موجودہ مسائل میں

اہل اسلام کو مہدی منتظر کی آمد بھی کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔

......اسی طرح موجودہ فقہ جب مدون کی گئی تو اس وقت سلطانی وخلافت کا زمانہ تھا۔ دور حاضر کی عوامی جمہوریت اس وقت قائم نہیں ہوئی تھی اس لئے اس فقہ میں خلیفہ اور سلطان سے متعلق احکام تو بہت ملیں گے لیکن اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ مسلمان کسی ملک میں تنہا حاکم نہ ہوں بلکہ جمہوری نظام کے تحت دوسری قوموں کے ساتھ شریک حکومت ہوں ایسی حالت میں ان کے لئے شرعی احکام کیا ہیں؟ موجودہ مدون فقہ میں آپ کو کوئی راہنمائی نہیں ملے گی۔ یہی مسئلہ دارالاسلام اور دارالحرب یا دارالکفر کا ہے۔ مگر کیا آج کے دور میں ان اصطلاحات کو لاگو کیا جاسکتا ہے؟ یہ کمی صرف مدون فقہ میں ہے اگر آپ اس فقہ سے گذر کر قرآن وسنت تک پہنچ جائیں تو آپ پائیں گے کہ قرآن وسنت میں ہر صورت حال کے لئے کامل راہنمائی موجود ہے۔

دینی فقہ:

......اس کے برعکس وہ فقہ جس میں مسلکی نہیں بلکہ اس میں دین کی آفاقیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ یعنی علماء وفقہاء اور مجتہدین حضرات کی آمد و رفت کا سلسلہ اس میں باقی رہتا ہے اور دین کی وجہ سے تا قیامت قائم رہنا ہے۔ اس لئے حال ومستقبل کے فقہاء کی استنباطی واجتہادی کاوشوں پر اس میں پابندی نہیں ہوتی۔

......ایسی فقہ کسی مخصوص فقیہ ومجتہد کے نام سے نہیں بلکہ تمام ائمہ فقہاء ومجتہدین سے مستفید ہوتی اور محض دین کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ خواہ وہ ماضی کے کسی مجتہد یا امام کی کاوش ہو یا دور حاضر کے کسی فقیہ کی، مگر اسلام کے بیشتر اصولوں سے ہم آہنگ ہو اور قرآن وسنت رسول ہی اس کا استدلال رہا ہو وہ دینی فقہ کہلاتی ہے

......یہ فقہ شریعت کے مقابلے میں زیادہ خاص شے ہے۔ کیونکہ اس میں صرف ایسے احکام شرعی سے بحث ہوتی ہے جن کا تعلق عمل سے ہے۔ جیسے وضو، طہارت، اور تمام عبادات یا بیوع ومعاملات کے احکام وغیرہ۔ فقہ شریعت کا جزء ہے یعنی کچھ چیزیں شریعت کی اس میں ہیں نہ کہ ساری۔ کبھی فقہ کا لفظ شریعت کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو جائز ہے کہ عام بول کر اس سے خاص مراد لیا جائے۔

......یہ فقہ معاشرہ کے ارتقاء سے پہلے ہی نشو ونما پا چکی ہوتی ہے اس لئے اس کا نفاذ ممکن ہے۔ اس کی دستاویز میں فقہ وشریعت کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو ہوتی ہے اور مختلف فقہاء کرام کے نقطہ ہائے نظر کو دلائل کے ساتھ پیش کر کے قاری کے ذہنی سفر کو اڑان دی جاتی ہے۔ ایسی کتب اور فتاوی عموماً قرآن وسنت کے دلائل ہی سے آراستہ

ہوتی ہیں۔یہی استدلالی سرمایہ فقہ ہے۔اسے شریعت بھی کہا جاتا ہے۔مذہبی اور دینی فقہ کے اس فرق کو سامنے رکھتے ہوئے ہم علماء وفقہاء کے مابین مذہبی ودینی فرق کو بھی بخوبی جان سکتے ہیں۔

دونوں میں فرق:

......دینی فقہ میں ہر وہ اجتہاد جگہ پا گیا جو قرآن وسنت رسول ﷺ کے اصولوں کے عین مطابق تھا۔اس لئے فقہاء صحابہ، ائمہ اربعہ یا دیگر فقہاء امت میں جس کسی کا سرمایہ افتخار قرآن وسنت رسول رہا اس کی فقہ اپنی وسعت، قوت استدلال، اور نصوص سے وابستگی کی وجہ سے ہر دور میں امر ہوگئی اور دین نے اسے اپنے اندر جذب کر لیا۔

......جس نے شذوذ کی راہ اختیار کی اسے دینی تو نہیں بلکہ ایک انفرادی رائے یا مسلکی فقہ کا نام دے دیا گیا مگر پھر بھی اس کے بارے میں حسن ظن سے یہ کام لیا گیا کہ گو اس کا مخلصانہ عمل قابل ثواب ہے مگر قابل تقلید نہیں۔

......آج کے دور میں ان دونوں فقہ پر خوب کام ہو رہا ہے کتب لکھی جارہی ہیں اور علم اپنی حقیقت کو سامنے لا رہا ہے۔اس اعتبار سے دونوں فقہ کا مطالعہ ماضی کے تاریخی ورثے اور زندہ ومتحرک فقہ کا مطالعہ ہوگا تاکہ دینی فقہ کا مصدر استخراج جانا جاسکے۔

شریعت: لغت میں تشریع (شریعت کی رو سے قانون سازی کرنا) کا لفظ شریعت سے ماخوذ ہے۔عربی لغت میں اس کے متعدد معانی ہیں۔مثلاً: شَرَعَ الْوَارِدُ شَرْعاً: آنے والے نے اپنے منہ سے پانی تناول کیا۔ شَرَعَ الدِّیْنَ: دین کو ایک طریقہ بنایا اور اسے واضح کیا۔یہی معنی قرآن کریم میں مستعمل ہے:﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ﴾۔نیز اس کا مطلب پھیلانا اور تیار کرنا کے بھی ہیں جیسے: شَرَعَ الطَّرِیْقَ وَمَهَّدَہُ۔اس نے راستہ پھیلایا وسیع کیا اور تیار کیا۔یہی معنی شریعت کا بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد ﷺ کے ذریعے اپنے بندوں کو عطا فرمائی جس میں عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق اور زندگی کے مختلف شعبوں کے نظام موجود ہیں تاکہ لوگ انہیں قبول کر کے اپنی دنیاوی اور اخروی سعادتوں کو حاصل کر سکیں۔اسی کا مبالغہ شَرَّعَ ہے جس سے لفظ تشریع مصدر ہے۔

تشریع: عربی میں یہ لفظ شریعت سے ماخوذ ہے جس کے دو معنی بیان کئے جاتے ہیں:

۱۔ **مستقیم راستہ**۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی ہے:﴿ثم جعلناک علی شریعة من الأمر﴾ پھر ہم نے آپ کو دین کی سیدھی راہ پر قائم کیا۔اس معنی میں شریعت پھر ایسا واضح راستہ ہے جو اپنے سالک کو فوز وفلاح سے ہمکنار کر کے جنت کی طرف لے جاتا ہے جس میں نفوس قدسیہ کی حیات ہے اور قلب وعقل کی سیرابی بھی۔شاہراہ کو بھی شارع کہا جاتا ہے

کہ وہ منزل مقصود تک پہنچاتی ہے۔ملت اور منہاج بھی اس کے معنی ہیں۔مراد یہ کہ شریعت بمعنی دین ہو تو وہ اللہ کی طرف ایک مستقیم طریقہ زندگی ہے۔جیسے اوپر والی آیت میں شریعت سے مراد دین ہے۔اگر شریعت بمعنی شریعت وملت ہو تو رسول اللہ ﷺ کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے جیسے:شریعت محمدیہ۔اور اگر اس کا نفاذ واستعمال ہو تو پھر اسے امت کی طرف منسوب کرتے ہیں۔جیسے اسلامی شریعت۔

۲۔**چلتے پانی کا پنگھٹ**، جہاں لوگ پانی پینے پلانے کے لئے آئیں۔جب اونٹ پانی کے پنگھٹ پر پہنچ جاتے تو عرب کہا کرتے: شرعت الإبل۔میں اونٹوں کو پانی کے پنگھٹ پر لایا۔ ایک ضرب المثل بھی ہے:أَهْوَنُ السَّقِيِّ: التَّشْرِيعُ۔ مراد یہ کہ اونٹوں کو چلتے پنگھٹ پر لے جاؤ تاکہ وہ پانی پی لیں۔کیونکہ بغیر ڈول نکالے یہی طریقہ زیادہ آسان تھا۔اس معنی میں شریعت جسم وقلب کو سیراب کرنے والی ایسے شے ہے جیسے پانی پیاسے کے حلق وجسم کو سیراب کردیتا ہے۔قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال اسی معنی میں ہوا ہے۔

﴿لكلّ جعلنا منكم شرعة و منهاجاً﴾ تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک شریعت اور ایک راہ عمل متعین کردی ہے۔

یہ آیت اصل میں اس آیت ﴿شرع لكم من الدين ما وصى به نوحاً﴾ کی تفسیر ہے کہ سبھی ملتوں کا دین واصول مساوی اور ایک ہی تھا جس میں نسخ نہیں ہوا۔جیسے معرفت باری تعالی اور دیگر اصول جیسے:﴿ ومن يكفر بالله وملئكته وكتبه ورسله﴾ (۔۔النساء:۱۳۶)۔نیز اس سوال کا جواب بھی کہ جب تمام انبیاء کرام اور کتابوں کا دین ایک ہے اور سب ایک دوسرے کی تصدیق کرتے آئے ہیں تو پھر شریعت کی تفصیلات میں فرق کیوں ہے؟ جواب یہی ہے کہ اللہ تعالی ہی ہے جس نے مختلف قوموں کے لئے مختلف زبانوں اور مختلف حالات میں مختلف ضابطے بنائے۔کیونکہ پچھلی شریعتوں میں بعض فروعی احکامات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ایک شریعت میں بعض چیزیں حرام تھیں تو دوسری میں حلال تھیں۔بعض میں کسی مسئلے میں شدّت تھی تو دوسری میں تخفیف۔لیکن سب کی دعوت اور دین ایک ہی تھا۔ آپ ﷺ نے بھی اس کی وضاحت یوں فرمائی تھی۔

﴿نَحْنُ مَعَاشِرُ الأَنْبِيَاءِ إِخْوَةٌ لِعَلاَتٍ، دِينُنَا وَاحِدٌ﴾ ہم انبیاء کی جماعت علاتی بھائی ہیں ہمارا دین ایک ہے۔(صحیح بخاری)

علاتی بھائی وہ ہوتے ہیں جن کی مائیں تو مختلف ہوں مگر باپ ایک ہی ہو۔مطلب یہ کہ ان کا دین ایک ہی تھا اور شریعتیں (دستور اور طریقے) مختلف تھیں۔شریعت محمدیہ کے بعد اب سابقہ شریعتیں منسوخ ہوگئی ہیں۔اب دنیا کے

خاتمے تک دین بھی ایک ہے اور شریعت بھی ایک۔ ایک اور مقام پہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ثم جعلناک علی شریعة من الأمر فاتبعها و لا تتبع أهواء الذین لا یعلمون﴾ (الجاثیہ:۱۸) پھر ہم نے آپ کو دین کی ظاہر راہ پر قائم کر دیا۔ سو آپ اسی پر رہیں اور نادانوں کی خواہشات پہ نہ چلیں۔

اصطلاحاً: وہ احکام جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعے اپنے بندوں کو دیئے جن میں عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق اور شعبہ ہائے زندگی سے متعلق مختلف تعلیمات بھی شامل ہیں ان پر لوگ گامزن ہوں اور اپنی دینی، دنیوی اور اُخروی سعادتوں کو سمیٹ سکیں۔ انہیں احکام شرعیہ کہا جاتا ہے۔

ان لغوی اور اصطلاحی معنوں میں ذرا غور کریں تو ان میں ایک گہرا تعلق یہ بھی ہے کہ شریعت۔ جو احکام کے مجموعے کا نام ہے۔۔ بہت ہی پختہ، ٹھوس اور ناقابل تغیر ہے جس کی بنیاد انتہائی مضبوط اور مستقیم ہے۔ یہ ایسا نظام ہے جو زمانہ وحالات میں اپنے مقصد سے کبھی بھی انحراف نہیں کرتا۔ یہ اس شارع کی مانند ہے جو بالکل سیدھی ہے جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں۔ اس اعتبار سے یہ پنگھٹ کے مشابہ ہے کہ یہ نفس وعقل دونوں کو غذا مہیا کرتی ہے جو ان کی حیات ہے۔ کیونکہ چشمہ بھی بدن کی زندگی کے لئے ایک ذریعہ حیات بنتا ہے۔

رسول کریم ﷺ کے حوالے سے جب مسلمان شریعت کا نام لیتے ہیں تو اس سے مراد کسی سابقہ نبی کی شریعت نہیں۔ سیدنا موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کے عہد میں ان کی شریعت اسلام تھی۔ آپ ﷺ کے رسول بننے کے بعد اب آپ کی دی ہوئی شریعت اسلام ہے۔ اس لئے سابقہ شریعتیں منسوخ ہونے کے بعد الٰہی دین نہیں رہیں اور نہ ہی وہ قابل عمل ہیں۔ اس لئے نماز میں قرآن کی بجائے توراۃ یا انجیل کی تلاوت سے نماز نہیں ہوگی خواہ وہ اصولاً کلام الٰہی ہو۔ قرآن کی موجودگی میں عبادت، ثواب اور اجر کے لئے ان کتب کی تلاوت حرام اور ناجائز ہے اور ایسا کرنا نبی کریم ﷺ کی رسالت میں مداخلت ہے۔ یہی وجہ ہے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے جن عقائد واعمال کو سمجھایا ہے اس آیت کی رو سے سبھی شریعت کہلاتے ہیں۔ اسی طرح سنت۔۔ شریعت کی مانند ہے۔ یعنی جسے آپ ﷺ سنت بنائیں وہ شریعت ہے۔ عقائد کو بھی آپ ﷺ نے سنت وشریعت قرار دیا اور کبھی عمل کو بھی۔ اور کبھی اس سے دونوں مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ شریعت دو قسم کے احکام رکھتی ہے:

پہلی قسم: یہ وہ احکام ہیں جو ناقابل تغیر اور اٹل ہیں خواہ حالات وواقعات کیسے ہی ہوں۔ جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یا حدود وغیرہ۔ یہ اپنی موجودہ ہیئت واحکام کے ساتھ مفید ہیں اور اجتماعی ومعاشرتی مضبوط روابط کا ذریعہ بھی۔

دوسری قسم: ان احکام کی ہے جن کا تعلق عام دنیاوی حالات ومعاملات سے ہے۔ مثلاً تعلیم وتربیت، تجارت

وصنعت، صلح وجنگ اور تعزیرات وغیرہ۔ چونکہ حالات کبھی یکساں نہیں رہتے اور قابل تغیر ہوتے ہیں اس لئے ان کے بارے میں شریعت نے اٹل اصول نہیں دیئے اور نہ ہی جزئی تفاصیل دی ہیں بلکہ ان کے لئے عام اصول وقواعد بنا دیئے ہیں تا کہ اُمت کے آگے بڑھنے کا راستہ کھلا رہے اور غلط وصحیح کے درمیان امتیاز بھی کرتی رہے۔ رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام، خلفاء راشدین اور اسلاف مختلف حالات میں اپنے فہم واجتہاد سے ایسے قوانین بناتے رہے جن میں ان کلی اصولوں کی پابندی لازما رہی جو شریعت نے مقرر کئے مگر ان کے معانی ومفہوم کی وسعت وہمہ گیریت سے وہ اپنے گونا گوں حالات میں بھرپور فائدہ اٹھاتے۔ (ماخوذ وملخص از مقدمہ اسلام کا فوجداری نظام از استاذ محمد عودہ)

☆..... اس لئے اسلامی حکومت کا تعلق محض معاملات کے قانونی حصے سے نہیں ہوتا بلکہ شریعت کے ہر نوع کے قانون سے ہوتا ہے۔ ساری شریعت کے نفاذ میں حکومت کو مستعد اور بیدار رہنا ہوگا۔ حدود وقصاص کا نفاذ کرنا، نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کے احکام پر عمل کرانا بھی حکومت کا فرض ہوگا اور مسلمانوں میں غیر دینی مشرکانہ اور خرافانہ نظریات کی آمد کا قلع قمع بھی کرنا ہوگا۔ جو چیزیں فرض کی حد تک ہیں ان کا سختی سے نفاذ ہوگا اور جو مندوب ہیں اس میں نصیحت کی جائے گی۔ یہ لفظ وضعی قوانین کے لئے بھی استعمال نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی فاسد عقائد یا اللہ کی شریعت کے مخالف مذاہب ونظریات کے لئے بولا جاتا ہے۔

لفظ شریعت کے تین معانی لئے جاتے ہیں:

شرع مُنَزَّل: جو آپ ﷺ پر نازل ہوئی اور جسے آپ ﷺ ہی نے پیش کیا۔ جس کی اتباع لازم اور مخالفت قابل تعزیر ہے۔

شرع مؤوَّل: مجتہدین وعلماء کی آراء۔ جیسے: مذہب شافعی وحنفی وغیرہ۔ جاہل کے لئے ان کی پیروی کو جائز سمجھا جاتا ہے مگر کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ عوام کو کسی مذہب کی پیروی پر مجبور کرے بلکہ شرع اسلامی ہی کی دعوت دے۔

شرع مبدَّل: جو اللہ ورسول نے نہیں کہا ان کی طرف وہ بات یا عمل منسوب کر دینا۔ یا اس کی مراد غلط لینا۔ یا اسے بدل کر دین بنا دینا۔ ایسا شخص بلانزاع کفر کا مرتکب ہوا ہے۔ مثلاً: وہ یہ کہے: خون، مردار یا ﴿ما أهل لغير الله به﴾ حلال ہے یا سود حلال ہے۔ وغیرہ۔

شریعت وفقہ میں فرق:

ا۔ ان دونوں میں عام وخاص کی نسبت ہے۔ جہاں فقیہ کا اجتہاد حکم الٰہی کے مطابق ہوتا ہے وہاں شریعت اور فقہ ایک ہی

ہو جاتے ہیں۔ اور جہاں مجتہد کا اجتہاد خطا کر جاتا ہے وہاں شریعت، فقہ سے الگ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح شریعت ان احکام میں بھی فقہ سے علیحدہ ہو جاتی ہے جن کا تعلق عقیدہ و اخلاق سے ہو یا گذشتہ اقوام کے واقعات ہوں۔ فقہ، شریعت کا جزو ہے نہ کہ شریعت کے تمام احکام اس میں شامل ہیں۔ کبھی فقہ کے لفظ سے شریعت بھی مراد لی جاتی ہے اور کبھی اس کے برعکس۔ عام لفظ بول کر اس سے خاص مراد لینا جائز ہے۔

۲۔ شریعت کے مصادر صرف قرآن وسنت ہیں۔ مگر فقہ کے مصادر قرآن وسنت اجماع اور قیاس ہیں۔

۳۔ شریعت عقائد، عبادات اخلاق اور اقوام ماضیہ کے واقعات پر مشتمل ہے جبکہ فقہ صرف عبادات ومعاملات پر۔

۴۔ شریعت کامل ہے اور ہر قسم کے تغیر وتبدل سے محفوظ۔ کیونکہ یہ قاعدوں اور عام اصولوں پر مشتمل ہے جن سے ہماری زندگی کے ان احکام کو لیا جاتا ہے جن کے بارے میں نص خاموش ہے۔ رہی فقہ یہ امت کے مجتہدین حضرات کی آراء ہیں جو شرعی ضرورت کے تحت حالات واقعات کی تبدیلی کے ساتھ قابل تغیر بھی ہیں۔

۵۔ شریعت مختلف علوم پر مشتمل ہے اور علم فقہ ان علوم میں کا ایک ہے۔ جس کے مباحث صرف مکلفین کے افعال اور ان کا حکم ہیں یعنی واجب ہے یا مندوب، مباح، حرام یا مکروہ۔ یہی افعال ہی تو ہیں جنہیں علم فقہ کا موضوع کہا جاتا ہے۔

۶۔ شریعت عام ہے جسے عموماً شریعت، اس کے مقاصد، اس کی نصوص میں اس وقت محسوس کیا جا سکتا ہے جب وہ عالم بشریت سے مخاطب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محترم سے فرمایا:

﴿وما أرسلنک إلا کافة للناس بشیرا ونذیرا﴾ سبأ: ۲۸۔ ہم نے آپ کو سبھی انسانوں کے لئے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے۔

جبکہ فقہ کے احکام عام بھی ہو سکتے ہیں اور خاص بھی۔

۷۔ شریعت تمام انسانیت کے لئے ضروری ہے کیونکہ ہر انسان جس میں تکلیف کی شروط پائی جائیں اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ اس کے عقیدہ، عبادت، اخلاق وسلوک کو مانے۔ جبکہ فقہ آراء مجتہدین کا نتیجہ ہے۔ ایک مجتہد کی رائے دوسرے مجتہد کو پابند نہیں کرتی بلکہ اس کے مقلد کو بھی۔ کیونکہ جب وہ کسی دوسرے مجتہد کی رائے کو بہتر پاتا ہے تو وہ اسے ہی مانتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ ایک اصول ہے:

العَامِيُّ لَا مَذْهَبَ لَهُ، وَإِنَّمَا مَذْهَبُهُ مَذْهَبُ مَنْ يُفْتِيهِ۔ ایک عام آدمی کا کوئی مذہب نہیں ہوا کرتا اس کا مذہب وہی ہے جو اسے فتوی دے دے۔

یعنی وہ ضروری نہیں سمجھتا کہ میں کسی خاص مذہب کا دائمی پیروکار بن کر رہوں۔ کیونکہ وہ کبھی کسی مسئلہ میں ایک مفتی کا کہنا مان رہا ہوتا ہے اور کبھی دوسرے مسئلہ میں کسی دوسرے مفتی کا۔

۸۔ شریعت ایک جامع ومکمل اور ہر زمان ومکان میں رہنے والی ہے۔ رہی فقہ جو مجتہد کا استنباط ہے اور جو کبھی معاشرے کے مسائل کا علاج بھی کسی زمانہ یا حالت میں پیش کر دیتی ہے مگر ایسا بھی ہے کہ وہ دوسرے مقام وزمان میں حل پیش کرنے سے قاصر ہو۔ مثلاً امام شافعی رحمہ اللہ نے عراق میں قدیم مذہب کے مطابق کچھ کہا اور لکھا بھی۔ مگر عراق سے واپسی پر مصر کے

لئے جب براستہ مکہ گذرے اور دیگر علماء ومحدثین کرام سے ان کی ملاقات ہوئی تو بہت سے ان مسائل سے رجوع کرلیا جن کا اظہار وہ عراق میں کیا کرتے۔ اسے مذہب جدید کہا جانے لگا۔ مگر اپنی کتب کو انہوں نے مصر میں لکھا اور وہیں اصول بھی لکھے۔ اس لئے وہ اپنی عراقی کتب کو منا ڈالتے اور ان کی روایت کو حرام قرار دیتے۔ فرمایا کرتے: لَيْسَ فِي حِلٍّ مَنْ رَوَى عَنِّي الْقَدِيمَ۔ یہ حلال ہی نہیں کہ کوئی مجھ سے قدیم مذہب روایت کرے۔ (البحر المحیط از زرکشی: ۵۸۴/۴)۔

۹۔ شرعی احکام صائب اور دائمی ہیں جن میں کوئی خطأ نہیں مگر فقہاء ومجتہدین کے احکام کبھی کبھار خطا والے ہوتے ہیں۔

قانون (KANUN)

یہ یونانی لفظ ہے جو سریانی زبان کے ذریعے عربی زبان میں آیا۔ بعض اہل لغت نے اسے رومی یا فارسی لفظ قرار دیا ہے۔ ابتداء میں قانون کا لفظ مِسْطَرَۃ کے معنی میں مستعمل ہوا جو لائنیں کھینچنے کے پیمانے کو کہتے ہیں۔ ابن منظور افریقی (م: ۷۱۱ھ) نے قانون کا معنی: مِقْيَاسُ كُلِّ شَيءٍ۔ لکھا ہے یعنی یہ لفظ۔۔۔ ہر چیز کا ٹھیک اندازہ کرنے کا آلہ۔۔ کے لئے مستعمل ہوا جو رفتہ رفتہ وہ عام معنی اختیار کر گیا جسے قاعدہ کہتے ہیں۔ جیسے قانون فطرت، حرکت کا قانون، کشش وجذب کا قانون اور قانون صحت وغیرہ بمعنی قاعدہ کے کلمات ہیں۔ انہیں قانون تو کہا جاتا ہے مگر یہ بدلتے رہتے ہیں کیونکہ طبعی قانون کو آج ماٰخذ بنانا اور کل اس کا متضاد آنا ممکن ہے جن کا ابھی تک علم نہیں ہو سکا۔ کچھ کی تردید میں متضاد قانون بھی آچکے ہیں۔ طبعی قانون کو انسانی فلاح کا ضامن سمجھنا انسانیت کی تذلیل، اس سے دشمنی اور حیوانیت کے نچلے درجے تک گرنا ہے۔ رسم ورواج بھی بعض سوسائٹیوں کا قانون رہے ہیں۔ ایک شخص نے کسی چیز کو رواج دیا تو اس کے کچھ پیروکاروں نے اسے پسند کر کے اس کے بعد بھی اسے جاری رکھا جو بعد میں رسم ورواج نام پا کر قانون بن گیا۔ اس کی پابندی بھی دراصل حیوان کی طرح لگی بندھی زندگی والی عادت ہے اس لئے یہ قانون بھی خلاف عقل اور سفیہانہ ہے۔ اس کا نفسیاتی اثر یہ ہے کہ عقل، اصول پسندی کے جوہر سے خالی ہو جاتی ہے یا اس کا اثر بہت ہی کم نمایاں ہوتا ہے۔ اس میں ایک اندھا دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر چلتا ہے۔ خواہ وہ بینا ہی کیوں نہ ہو مگر رواج خود اندھا ہوتا ہے جو اس نابینا عقل کی قیادت کرتا ہے۔ پھر اس نابینا قائد سے کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ اس لئے یہ قانون بھی غلط، گمراہ کن اور مضر ہے۔

نفسیاتی ماحول بھی انسانی مزاج پر بڑی قوت سے اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی رجحان ایک قانون کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً: ستی کی بجائے نکاح بیوگان کی تحریک چلی، رجحان بڑھا تو ہندوؤں نے نکاح بیوگان کا قانون بنایا اور اسے پالیمنٹ سے پاس کرالیا۔ یہی حال ہمارے ہاں نظام زکوۃ کے نفاذ کا ہوا ہے۔ شیعہ حضرات نے رجحان دیکھا تو

اپنے لئے عشر کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ جو ان کا حق سمجھ کر پاس کر دیا گیا۔

لفظ قانون کے مختلف استعمال:

۱۔ گزشتہ چند صدیوں سے فقہ کی بجائے ان احکام کو جو اسلامی ممالک میں نافذ ہیں۔ قوانین (Law) کہا جانے لگا ہے۔ جس سے مراد حکومتی قوانین کی دفعات کا مجموعہ ہے۔ جیسے قانُونُ الْجَزَاءِ العُثْمَانِی۔ سلطنت عثمانی کا قانون سزا۔ یا القَانُونُ الْمَدَنِیُّ الْعِرَاقِی۔ عراق کا دیوانی قانون۔ عثمانی خلافت میں یہ لفظ سرکاری احکام کیلئے اکثر استعمال ہوتا تھا۔ جنہیں حکومت خود جاری کرتی تھی تاکہ یہ احکام، شرع اسلامی کے ان احکام سے علیحدہ سمجھے جائیں جو شرع کے معروف دلائل پر قائم ہیں۔ یہ فرق ملحوظ رہے تو حکومت کا وہ قانون جو شرع سے متصادم ہو مثلاً سود شرعاً حرام ہے لیکن قانوناً جائز ہے۔ سمجھ آ سکتا ہے۔ آج کل یہ لفظ یورپین زبانوں میں صرف قانون کلیسا کیلئے بولا جاتا ہے۔

۲۔ لفظ قانون کا ایک اور عام معنی آئین (Constitution) کا بھی ہے۔ جسے انگریزی میں قانون (Ordinance) یا اندھا کالا قانون کہہ دیتے ہیں۔ بعض مخصوص حالات میں یہ لفظ ہر اس قاعدے کے لئے بولا جاتا ہے جن کا تعلق عام معاملات کے ضابطوں اور قاعدوں (Rules) سے ہو۔ مثلاً کہا جاتا ہے۔ سینٹ نے غلہ کی سمگلنگ روکنے کا قانون منظور کر لیا ہے۔

۳۔ فقہی اصولوں کیلئے بھی اس لفظ کا استعمال قدیم سے ہے۔ ابو القاسم ابن جزی المالکی (م ۷۴۱ھ) نے فقہ مالکی کے بارے میں ایک کتاب لکھی۔ جس کا نام انہوں نے الْقَوَانِینُ الفقهیةُ فی تلخیصِ المَذهَبِ المالِکیةِ رکھا۔ البتہ فقہائے اسلام اپنی اصطلاح میں لفظ قانون کی بجائے شرع یا شریعت کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے اسلامی قانون کا اصول فقہ سے بھی گہرا تعلق ہے۔

۴۔ بعض دفعہ لفظ شریعت، قانون کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً: شرائع اسلام، قوانین اسلام کے معنی میں آتا ہے۔ اسی طرح لفظ حکم، شرعی قانون کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ اور حاکم کو شارع کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

جب قانون کا لفظ پہلے دو معنی میں استعمال ہو تو اس میں درج ذیل خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں۔

☆۔ اس کا تعلق دنیاوی معاملات سے ہو جاتا ہے۔ عبادات سے نہیں۔ جبکہ فقہ اسلامی کے قواعد میں دین اور دنیا دونوں پر بیک وقت بحث ہوتی ہے۔

☆۔ ایسے قانون حکومت نافذ کرتی ہے۔

☆۔ جج کے فیصلے کی طرح کسی خاص معاملے یا شخص کے لئے قانون نہیں بنایا جاتا بلکہ بغیر کسی تفریق وخصوصیت کے تمام انسانوں یا انسانوں کے کسی طبقے کے لئے وضع کیا جاتا ہے۔

۵۔اسی طرح لفظ قانون بعض علوم کی کتابوں کیلئے نام کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جیسے: **القانون**- علم طب میں ابن سینا (م: ۴۲۸ھ) کی کتاب اور **القانون**- علم ہیئت وتنجوم میں ابوریحان البیرونی (م: ۴۴۰ھ) کی کتاب اور **قانون الرسول**- فقہ وکلام میں امام غزالی (م: ۵۰۵ھ) کی کتاب وغیرہ۔

قانون کیسے بنتا ہے؟: قانون سے مراد وہ احکام ہیں جو انتظامیہ کے اعلیٰ ارکان ادنی ارکان کے لئے وضع کرتے ہیں۔ یا انسان کے خارجی افعال کے متعلق وہ عام قاعدہ ہے جس کی تعمیل ملک کی مرکزی حکومت لوگوں سے کراتی ہے۔SALMOND اپنی کتاب Jurisprudence (ص ۳۹) میں لکھتا ہے:

قانون اصول وقواعد کا ایسا مجموعہ ہے جسے ملک کی حکومت تسلیم کر کے اس کے ذریعے عدل وانصاف قائم کرتی ہے یا اس قانون کو ملک کی عدالتیں تسلیم کر کے ان پر عمل کرتی اور کراتی ہیں۔

قانون کی نشوونما: قانون کی ابتداء اس وقت ہوئی جب خاندان اور قبیلہ وجود میں آئے۔اس وقت خاندان کے سربراہ کا قول ہی پورے خاندان کے لئے قانون کا درجہ رکھتا تھا اور قبیلے کا قانون ہوا کرتا تھا۔قانون اسی طرح سوسائٹی کے نشوونما اور ارتقاء کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ریاست وجود میں آگئی۔ابتداءً ہوتا یہ تھا کہ ہر خاندان وقبیلے کی عادات وروایات دوسرے خاندان وقبیلے سے مختلف ہوتیں۔مگر جب ریاست وجود میں آگئی تو عادتوں اور روایات میں ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔اس طرح قانون وجود میں آتا رہا۔

شریعت وقانون میں فرق: اس حیثیت سے تو شریعت،قانون سے ہم آہنگ ہے کہ دونوں سوسائٹی کے معاملات کی تنظیم کرتے ہیں مگر شریعت،قانون سے یوں مختلف ہے کہ شرعی قواعد دائمی اور ناقابل تغیر ہیں جبکہ قانون نہیں۔یہ امتیازی خصوصیت شریعت کو حاصل ہے قانون کو نہیں۔اس لئے ان دونوں میں نہ کہیں مماثلت ہے اور نہ ہی دونوں مساوی درجے کے ہیں۔شریعت کے اس امتیاز کے دو تقاضے ہیں۔

۱۔ شریعت اسلامیہ کے قواعد اور اس کی دفعات میں اس قدر عمومیت اور اس قدر لچک ہے جو معاشرتی ارتقاء کی ہر نوبہ نو تغیر پذیر صورت حال میں سوسائٹی کی تمام متنوع ضروریات کا حل پیش کرتی ہے۔

۲۔ شریعت اسلامیہ کے قواعد اور دفعات میں پہلے ہی سے اس قدر رفعت اور ارتقاء ہوتی ہے جو کسی بھی وقت سوسائٹی کے معیار سے فروتر نہ ہوں۔ان محاسن کے ساتھ باقی فرق آپ خود ملاحظہ کیجئے۔

شریعت:

۱۔ شریعت، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نازل کردہ ہے۔

۲۔ شریعت، اللہ کی تخلیق اور آئین الٰہی کے تفصیلی ضابطوں کا نام ہے۔ جس میں اس کی قدرت، کمال اور عظمت کی جھلک اور اس کے ماضی و مستقبل کے تمام ممکنات پر محیط علم کی روشنی موجود ہے۔ جو تمام مسائل و معاملات کا احاطہ کر گئی ہے۔ اس کا فیصلہ ہے کہ اس شریعت میں کوئی ترمیم وتغیر ممکن نہیں۔

۳۔ شریعت، سوسائٹی کی ایجاد نہیں بلکہ خود سوسائٹی شریعت کی ساخت ہے۔ لفظ شریعت ایک مقدس Holy لفظ ہے۔ جس کے ساتھ لفظ اسلامی کی قید درست نہیں۔ کیونکہ شریعت اسلامی ضابطوں کے سوا دنیا میں موجود مذاہب یا نظریات قوانین کے لئے مستعمل ہی نہیں یہ تو خالصتاً اسلامی اصطلاح ہے جو اپنے مفہوم سے ہی پہچانی جا سکتی ہے۔

۴۔ شریعت میں ظلم، نقصان یا خواہش نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔ اس میں ایجابی اور سلبی احکام ہیں۔ وہ امر و نہی کرتی ہے۔ ترغیب وترہیب بھی کرتی ہے۔ شریعت میں عام عقائد، ایمان باللہ، و بالرسل، عالم الغیب، عبد کا اپنے رب سے تعلق، اخلاق مومن، مختلف نظامہائے حیات موجود ہیں۔ دل مسلم میں اس کا احترام و وقار ہے۔ اس میں دنیاوی و اخروی جزا ہے۔ اور داخلی و خارجی عمل کا احتساب بھی ہے۔

۵۔ اس لئے حضرت انسان کو خود بدلنا ہوگا نہ کہ شریعت کو۔ چاہے حالات و زمانہ میں کتنی ہی تبدیلی کیوں نہ آ جائے۔ Natural Laws جس طرح اٹل ہیں اسی طرح اللہ کی یہ نازل کردہ شریعت بھی تمام لوگوں، گروہوں اور حکومتوں کے لئے ایک مکمل اور ناقابل تغیر قانون ہے۔

قانون:

۱۔ قانون انسان کی ایجاد ہے۔ انسان کے بس کا روگ ہی نہیں کہ شریعت سازی کر سکے۔

۲۔ قانون میں انسانی نقص، عجز، ضعف، اور قلت موجود ہے۔ جسے ہمہ وقت ترمیم وتبدیلی سے دو چار ہونا پڑتا ہے جو کمال کا نہیں نقص کا اظہار ہے۔ یہ اس وقت کمال کو پہنچ سکتا ہے جب انسان خود کمال کو پہنچ جائے۔

۳۔ سوسائٹی قانون بناتی ہے اور اسے بتدریج اپنی عادات، روایات اور تاریخ کے رنگ میں رنگ لیتی ہے۔ گویا قانون سوسائٹی کے معاملات کی تنظیم کے لئے تو ہوتا ہے مگر سوسائٹی کی راہنمائی کے لئے نہیں ہوتا۔ نتیجتاً قانون سوسائٹی کے ارتقاء سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ اور اس کی ترقی کے تابع ہوتا ہے۔ ایسا قانون اور اس کے قواعد سوسائٹی کے پیش رو نہیں بلکہ اس کے پیرو ہوتے ہیں۔ یا اس معیار کے ہوتے ہیں جس معیار پر اس وقت سوسائٹی ہوتی ہے۔

۴۔ قانون میں ظلم وزیادتی اور خواہشات کی بھرمار ہے۔نقصان سے یہ روکتا ہے مگر خیر کو بہت کم رواج دیتا ہے۔حکومت بچانے کیلئے قانون میں معاشرے کی اجتماعی، اقتصادی حالت پر گرفت زیادہ ہوتی ہے۔قانون کا دلی احترام دلوں میں بہت کم ہوتا ہے۔اس میں اتھارٹیز ہی اعزاز واکرام دیتی ہیں۔کچھ خارجی کاموں پر اس کی دلچسپی ہوتی ہے۔

۵۔ قانون ایک بچہ کی مانند کمزور وناتواں پیدا ہوتا ہے۔پھر رفتہ رفتہ نشوونما پکڑ کر طاقتور ہو جاتا ہے۔یہاں تک کہ بھر پور شباب کو پہنچ جاتا ہے۔پھر جس سوسائٹی میں یہ قانون نافذ ہے وہ معاشرہ جس قدر تیزی کے ساتھ ارتقاء پذیر ہے۔اسی قدر تیزی کے ساتھ یہ قانون بھی ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔قانون ابتداء میں آج کے قانون سے مختلف تھا۔وہ ہزاروں سال پر محیط تغیر وارتقاء کے تدریجی عمل سے گزر کر اس مقام پر پہنچا ہے جس پر وہ آج موجود ہے۔

بہرحال شریعت، کی نشوونما قانون کی طرح نہیں ہوتی بلکہ یہ آسمان سے بذریعہ وحی نازل ہوئی ہے۔اس لئے قانون کا مقابلہ نازل شدہ شریعت سے نہیں ہوسکتا۔آدم علیہ السلام کے زمین پر اترتے ہی یہ بھی ہمراہ آ گئی۔بعد میں ہر خاندان، جماعت، قوم یا ریاست کیلئے یہ اپنے احکام وقوانین کو منظر عام پر لاتی رہی۔اس لئے قانون کے برعکس شریعت ہر انسان کے لئے ہوتی ہے۔خواہ وہ حکمران ہو یا رعایا کا عام فرد۔عربی ہوں یا عجمی، مشرقی ہوں یا مغربی، یا اس کے رسم ورواج کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔خواہ لوگوں کی عادات، روایات اور تاریخ میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔یہ ایسا عالم گیر الٰہی قانون ہے جس کے بارے میں ماہرین قانون سوچتے تو رہے ہیں مگر کوئی عالمی قانون اس کے مقابلے میں اب تک وجود میں نہیں لا سکے۔قانون کے برعکس شریعت قابل تغیر ہوتی ہے اور نہ ہی قابل ترمیم۔ اس کی عبارات ونصوص میں اس قدر عمومیت اور لچک پیدا کر دی گئی ہے کہ کبھی کسی ترمیم وتغیر کی ضرورت ہی پیش نہ آئے اور نہ ہی نئے حالات وتغیرات میں اس کا دامن تنگ ہوسکتا ہے۔

انتباہ: شریعت کے لئے "محمڈن لاء" کی اصطلاح استعمار نے اسلام دشمنی کی بناء پر خود گھڑی ہے جو دیگر اصطلاحات کی طرح ہمارے ہاں تسلیم شدہ ہے۔دراصل یہ اصطلاح، شریعت کو وحی الٰہی اور آئین الٰہی تسلیم نہ کرنے کا اظہار ہے اور اسی کی دعوت ہے۔استعمار نے اپنے مذموم مقاصد کے لئے یہ اصطلاح وضع کی اور اپنے سمجھنے کے لئے بنائی مگر ہمارے ہاں اس کا استعمال ایک غلامی کی یادگار بن گیا ہے۔لاء کالجز میں پڑھائی جانے والی ہماری قانونی کتب (law books) کے عنوانات اسی سوچ کے غماز ہیں۔اس اصطلاح سے استعمار نے یہ باور کرایا کہ میں

شریعت کو وحی الٰہی نہیں مانتا بلکہ اسے محمد ﷺ کی خود ساختہ کہتا ہوں اور یہ دیگر قوانین کی طرح وقت کے ساتھ ساتھ قابل تغیر بھی ہے۔ جب کہ مسلمان اپنے ایمان وعقیدے کی بنیاد پر اسے محض ایک بڑ سمجھتا ہے اور معترف ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت، قرآن کا آپ ﷺ پر نزول، پھر آپ کا معلم کتاب ہونا اور اس کے گوہر حکمت کو چن کر امت کو دینا نیز آپ ﷺ کا قرآن کے ذریعے فرد وسوسائٹی کا تزکیہ کرنا یہ سب مسلمان پر اس کے رب کا فضل وکرم ہے جس نے اپنی اہمیت، افادیت اور ہمہ گیریت کی بناء پر تمام خود ساختہ قوانین کو زیر کر دیا ہے۔

مقام عبرت: شریعت اپنے نفاذ کے لئے اپنی تدریس وتبلیغ بھی چاہتی ہے۔ ہمارے تدریسی مناہج میں سب کچھ ہے مگر شریعت نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ اس کی تدریس وتبلیغ میں اہل دین ہی بٹ گئے۔ ہماری تعبیرات شریعت نے اہل وطن کو شریعت کے محاسن سے بہرہ مند ہونے کے ہر نادر موقع سے محروم کر دیا۔ فاضلین ومفتی حضرات کے اژدحام کے باوجود معاشرے نے انہیں وہ مقام نہ دیا جو ایک انگریزی قانون پڑھنے والے کو دیا گیا۔ شاید اس کا سبب نئے دور اور اس کے تقاضوں سے ان فاضلین کی رجعت قہقری تھی۔ وکلاء کی اکثریت تو حسرت سے اپنی اس خواہش کی تکمیل چاہتی رہی کہ کسی طرح اسلام کے عدالتی نظام کو اہل دین سمجھا اور پڑھا سکیں تا کہ اس کی تنفیذ کی کوشش میں وہ پیش پیش رہیں مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اس کی وجوہات میں ایک بنیادی اور اہم وجہ وسعت نظری سے محرومی اور حزبیت سے لگاؤ ہے۔ ہر قیادت اور جماعت، اصلاح امت کے لئے اپنے آپ کو ناگزیر سمجھنے لگی۔ اسے صرف اپنے اتباع ہی سب سے زیادہ عزیز ہو گئے۔ ملزم بھی وہی بنے۔ شریعت کے دائرے میں جب تک ہم رہے خوش نصیبی اور برکتیں ہمارا ساتھ دیتی رہیں اور جب سے ہم نے شریعت سے منہ موڑا ذلت وادبار نے مستقل بسیرا کر لیا۔ کیسی عبرت ہے ہماری تاریخ میں؟ یہ شریعت ہی تھی جس نے مسلمانوں کو اقوام عالم میں سرفراز کیا مگر شریعت کو ترک کرنے سے ہر قسم کی ترقی ان سے روٹھ گئی اور زندگی کے ہر میدان میں پسپائی ان کا مقدر بن گئی۔ ﴿ورفعنا فوقکم الطور﴾ جیسے حالات ہمارے بھی بن گئے۔ ضعف دو چند ہو گیا۔ ملت اسلامیہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ دل پراگندگی اور انتشار کا شکار ہیں۔

سیاست کا معنی ومفہوم: لفظ سیاست عربی زبان میں قیادت کرنا یا راہنمائی کرنا کے معنی میں آتے ہیں۔ سائس گھوڑا سدھارنے والے کو کہتے ہیں۔ قوم کو سدھارنا اور اسے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے آگے بڑھانا ایک سائس کا کام ہوتا ہے۔ اس لئے سائس بمعنی قائد وراہنما کے بھی آتا ہے۔ سیکولر سیاست اور اسلامی سیاست میں

فرق صرف اتنا ہے کہ اسلامی سیاست میں ایک مثالی راہنما دین اسلام کے اصولوں کو اپنا کر افراد و قوم کی راہنمائی کرتا ہے۔ وہ وقتی نعروں یا افواہوں کو خاطر میں نہیں لاتا بلکہ اس کی تمام تر طاقت اور علم کا محور، دین اور اس کا عقیدہ ہی ہوتا ہے۔ اپنے اس ٹھوس نظریے سے اس کی وابستگی نظریہ ضرورت کے تحت نہیں بلکہ ایمانی حد تک ہوتی ہے۔ اس کا اخلاق اور کردار خدا خوفی کا مظہر ہوتا ہے۔ وہ مسلمان قائد ہوتے ہوئے اپنی گفتگو و بیانات میں منفرد ہوتا ہے۔ اسلامی سیاست کی اساس کلمہ توحید ہے جو دنیا کے ہر غیر مسلم کی راہنمائی اور اپنے نظریے کی برتری و عمدگی کو اجاگر کرتی ہے۔ آپ ﷺ لیڈر، ٹیچر، امام تھے مگر دینی اعتبار سے آپ ﷺ کا رول بطور ایک قائد و راہنما کے زیادہ تھا۔ اس دینی سیاست کو آپ ﷺ نے ہر لمحہ اور ہر مقام پر اپنایا ہر فرد کے دل میں گھر بنایا۔ نتیجتاً سیکولر سیاست شکست کھا گئی اور آپ ﷺ بالآخر کامیاب ہوئے۔ خلفاء راشدین نے بھی اسی انداز سیاست کو اپنا کر بحیثیت امام اور لیڈر کے اپنا رول ادا کیا۔

سیکولر سیاست میں دنیا و شہرت طلبی، اخلاق باختگی، ذاتی مفادات اور عوامی ضرورت مقدم ہوتی ہے۔ دھوکہ دہی، منافقت، ہنگامہ آرائی اور حرص و آز اس کی روح ہے۔ فرعون، نمرود، شداد اور ہامان و قارون کی سیاست ظالمانہ، آمرانہ، مال و دولت سمیٹنے اور عوام کا استحصال کرنے پر مبنی تھی۔ جس میں چالاک مشیروں کا کردار بھی نمایاں تھا۔ ان کے ہاں دین ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ بلکہ ان سیکولر سیاستدانوں و راہنماؤں کی نگاہ میں دین، ترقی و ذاتی عروج کی راہ میں زبردست رکاوٹ ہوتا ہے۔ سیکولر سیاست چونکہ نظریہ ضرورت کی بھی قائل ہوتی ہے اس لئے اکثر اوقات قیادت بھی لوٹا گردی، لالچ، ضمیر فروشی اور غداری کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس سیاست کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ قوم اور عوام کو ہانکی ہوئی بھیڑ بکریاں سمجھا جاتا ہے۔ انہیں بے وقوف بنایا جاتا ہے مگر اپنی سیاست کی آ کاس بیل اس طرح بنائی ہوتی ہے کہ اقتدار میں ہوں تب بھی مزے لوٹیں اور اگر محروم ہوں تو بھی پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں۔ قوم کو حزب اختلاف اور حزب اقتدار کی جذباتی اصطلاحات دی جاتی ہیں تاکہ وہ سمجھے کہ ہم اپنے مقصد اور لڑائی میں مخلص ہیں۔ مگر درحقیقت ایک ہی میز پر کھانا کھانے کے علاوہ ایسی سیاست رشتہ داریاں جوڑنا اور آپس میں شادیاں بھی کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ سیکولر سیاست کا لب ولہجہ قوم کے اخلاق و کردار پر گہرا اثر ڈالتا ہے جس کے منفی اثرات میں سے ایک اثر محراب و منبر اور ان کے محافظین میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

فقہ اسلامی کے چند مسائل: ذیل میں قرآن وسنت سے ماخوذ چند فقہی مسائل بیان کئے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ فقہ کیا ہے۔ مسائل اوران کے احکام کس طرح بیان کئے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿یأیھا الذین آمنوا إذا قمتم إلی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وأیدیکم إلی المرافق فامسحوا برؤسکم وأرجلکم إلی الکعبین.﴾ اے اہل ایمان! جب تم نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہونے کا ارادہ کرو تو اپنے چہروں کو دھولیا کرو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولیا کرو۔ پھر اپنے سر کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں سمیت دھولیا کرو۔ (المائدہ:۶)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ نماز کا آغاز کھڑے ہونے سے ہوتا ہے لیکن اس سے قبل وضو کا کرنا۔ اور وضو سے قبل نیت کرنا ضروری ہے۔ وضو کی ترتیب بھی ملحوظ رکھنا از روئے آیت فرض ہے۔ جسمانی صفائی کے بعد وضو میں منہ دھونا۔ ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھونا۔ سر کا مسح کرنا۔ پاؤں ٹخنوں سمیت دھونا۔ بھی واضح کیا گیا ہے۔

نماز کے لئے قیام کرنا تو ہم نے جان لیا مگر رخ کس طرف کریں گے؟ یہ بھی ہمیں قرآن کریم آگاہ کرتا ہے: ﴿وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ﴾ کہ تم جہاں کہیں بھی ہو نماز پڑھتے وقت اس قبلہ کی طرف رخ کرلیا کرو۔ (البقرۃ:۱۴۴) پھر نماز کی تفاصیل رسول اکرم ﷺ پر چھوڑ دی گئیں کہ آپ ﷺ ہی نماز پڑھ کر دکھادیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اسی روشنی میں فرمایا: صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي۔ تم نماز ویسے پڑھو جیسے مجھے پڑھتا دیکھو۔ وضو کی بھی مکمل تفاصیل ہمیں حدیث رسول ﷺ میں ملیں گی۔ یہ وضو سے پہلے یا بعد میں یا بیماری وعذر سے متعلق یہ تفاصیل ہیں۔ ان تمام مسائل کے مصادر قرآن وسنت ہیں جو نص کہلاتے ہیں۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے شاگردوں کو رسول اکرم ﷺ کے وضو کرنے کا وہ عمل بتایا جو انہوں نے اپنی آنکھوں سے یوں دیکھا:

أَنَّهُ دَعَا بِوَضُوءٍ فَتَوَضَّأَ، فَغَسَلَ كَفَّيْهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ مَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُمْنَى إِلَى الْمَرَافِقِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُسْرَى مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَهُ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَهُ الْيُمْنَى إِلَى الْكَعْبَيْنِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَهُ الْيُسْرَى مِثْلَ ذَلِكَ ثُمَّ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوئِي هَذَا (مسلم) سیدنا عثمانؓ نے وضوء کا پانی منگوایا، پہلے اپنی ہتھیلیاں تین مرتبہ دھوئیں پھر کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا۔ پھر اپنا منہ تین مرتبہ دھویا۔ اس کے بعد اپنا دایاں ہاتھ تین مرتبہ کہنیوں سمیت دھویا اسی طرح بایاں ہاتھ کہنیوں تک تین مرتبہ دھویا۔ پھر سر کا مسح کیا۔ مسح کے بعد اپنا دایاں پاؤں تین مرتبہ ٹخنوں تک دھویا اور اسی طرح بایاں پاؤں ٹخنے تک تین مرتبہ دھویا۔ پھر

فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح وضوء کرتے دیکھا تھا جس طرح تم نے مجھے وضوء کرتے دیکھا ہے۔

یہ اور اس قسم کی دیگر صحیح احادیث کو سنن کی کتب سے جمع کر کے ان کے الفاظ پر غور کرنے کے بعد وضوء سے متعلق تمام فرض، سنت، نفل اور مباح مسائل واحکام کو بآسانی جانا جا سکتا ہے اور اضافی مسائل کو بھی۔ اسی کا نام فقہ ہے یعنی جس میں آپ کے پاس علم بھی آ جائے اور صحیح دلائل بھی جو قرآن وسنت سے ماخوذ ہوں۔ ضعیف وموضوع روایات کا سہارا لے کر مسائل اور ان کے احکام بیان کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر روایات بیان کرنا ہیں تو شرط یہ ہے کہ صحیح روایات سے یہ مسائل اخذ کئے جائیں۔ ورنہ وہ ضعیف فقہ ہوگی۔ مثلاً:

مسواک کا مخصوص سائز ہونا اور مسواک کرتے وقت اسے خاص انداز سے پکڑنا، وضوء کرتے وقت ہر عضو دھونے سے قبل دعاء پڑھنا۔ وضوء کے دوران گردن کا مسح کرنا۔ چوتھائی سر کا مسح کرنا وغیرہ۔ نماز شروع کرنے سے پہلے اپنی زبان میں نیت کے الفاظ پڑھنا۔ اسی طرح عورتوں کا نماز میں گٹھڑی کی طرح بیٹھ کر سجدہ کرنا، بعد از سلام ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھنا، یا دیگر فقہی مسائل مثلاً: وقت نکاح ایجاب وقبول تین بار کروانا، بیک وقت دی گئی تین طلاق کی صورت میں دوبارہ آباد ہونے کے لئے نکاح حلالہ کروانا، زکوۃ سے بچنے کے لئے اپنی بیوی کو سال گذرنے سے ذرا قبل اپنا سارا مال ہبہ کر دینا، میدان عرفات میں جمع بین الصلاتین نہ کرنا وغیرہ جو فقہ اسلامی کی رو سے ضعیف وموضوع اور غلط حیلوں پر مبنی فقہی مسائل ہیں جن کا ارشادات رسول سے کوئی تعلق نہیں اس لئے یہ فقہی مسائل ہیں اور نہ ہی انہیں فقہ کہا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

فقہ میں اہم چیز کون سی ہے؟ عموماً دو چیزیں فقہ میں اہم ہوتی ہے۔ استخراج مسئلہ اور اس کی دلیل۔

دلیل: جب بھی کوئی فقہی مسئلہ بتایا جاتا ہے تو اس میں انتہائی اہم شے اس کی دلیل ہوا کرتی ہے۔ دلائل دو قسم کے ہیں۔ عقلی اور نقلی۔ شرعی مسائل میں نقل یعنی قرآن وحدیث کی اہمیت زیادہ ہے۔ اسے دلیل کہتے ہیں۔ فقہ کی بنیاد انہی دو پر قائم ہے۔ کیونکہ مسلمان کو یہی دو چیزیں ہی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ملی ہے۔ اس لئے اولاً تو اس مسئلے کی دلیل غور کر کے قرآن وسنت میں دیکھی جاتی ہے اور عقلاً بھی اس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن تو اللہ کا کلام ہے اور سنت، صحیح حدیث سے ثابت ہوتی ہے۔ اسی غور کا نام فقہ ہے۔ یہ غور دراصل دینی بیداری ہے جو فقیہ کو اللہ تعالی نصیب فرماتے ہیں کہ فقہی مسائل قبول کرتے وقت قرآن وسنت کی دلیل کو دیکھے اور جانے۔ وہ حق کو دلیل سے

پہچانے نہ کہ رجال سے۔اس بیداری میں یہ بات بھی شامل ہے کہ قرآن وسنت کی کوئی دلیل بالفرض اگر قبول نہیں تو پھر جسے دلیل بنایا جارہا ہے وہ کیسے اور کیوں قبول کی جارہی ہے؟ استدلال کی صحیح پہچان کا یہ ملکہ اللہ تعالیٰ جس کو عطا کردے وہی خیر کثیر ہے۔

استخراج مسئلہ: نصوص صحیحہ کو پڑھنے کے بعد اسے کیسے سمجھا اور کیا سمجھا ہے؟ یہی شے فقیہ کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہے۔اس کی بیدار مغزی اور صحیح دینی معرفت ہی وہ خیر کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کردی ہے۔ مثلاً دورِ حاضر کے مسائل کا حل نصوص صحیحہ کو سمجھ کر دینا جیسے: خاتون کے لئے میڈیکل و نرسنگ کی تعلیم حاصل کرنا یا بینکنگ اور انشورنس کے سودی نظام کو اسلامی بنانا وغیرہ۔ایسے مسائل کا استخراج قرآن وسنت کی روشنی میں کرنا اور حل پیش کرنا اجتہاد کہلاتا ہے۔ایسے اجتہاد واستخراج کی شاہد کتب حدیث کے تراجم ابواب ہیں جو دراصل عصری سوالات تھے جن کا جواب انہوں نے حدیث سے استدلال کرکے باب کی صورت میں دیا۔دورحاضر میں شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ کی تفسیر اور اس میں مسائل کا استخراج واستنباط ایک بے مثال فقاہت کا ثبوت ہے۔فقہ وتفقہ کا حاصل یہی کچھ ہے جو علماء نے دین کے اصل مآخذ سے جمع کیا ہے۔اسی طرح بعض فقہاء کرام کے زبردست استدلال پر انسانی عقل بھی دنگ رہ جاتی ہے جیسے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اور ان کے معاصر یا بعد کے فقہاء کے استدلال وغیرہ۔ذیل میں کچھ متداول کتب کی مثالیں اس فقہی بیداری کو بآسانی سمجھا سکیں اور مراتب فقہاء کو بھی۔

آیت یا لفظ سے استخراج: سورۃ النصر جب آپ ﷺ پر نازل ہوئی تو بیشتر صحابہ کرام اس کے نزول پر بہت خوش ہوئے کہ الحمدللہ اس دین کو مزید پھلنے پھولنے کی خوش خبری مل گئی مگر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ غمگین ہوگئے۔کہ اس سورۃ میں تو آپ ﷺ کی وفات کی خبر ہے۔مگر بیشتر قریشی صحابہ اپنے اپنے فہم پر قائم رہے۔جن کی اصلاح جناب فاروق اعظمؓ نے اپنے دورِ خلافت میں فرمائی۔اسی طرح آیت:

> ﴿أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم، فإن تنازعتم في شيء فردوه إلى الله والرسول إن كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر﴾۔ اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اللہ کی اور حکام وعلماء کی، پھر اگر تم آپس میں کسی چیز میں اختلاف کرنے لگو تو اسے تم اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو تو۔(النساء:۵۹)

میں ﴿أطيعوا الرسول﴾ سے کیا مراد ہے؟ اگر رسول زندہ نہ ہو تو پھر کس کی اطاعت کی جائے؟ کیا اطاعت

رسول سے مراد صحیح یا حسن حدیث ہوگی؟ کیا اس میں خبر واحد بھی شامل ہے؟ کیا خبر واحد بھی وحی ہے؟ یا ظنی؟ اسی طرح ﴿أولو الامر﴾ سے مراد کون لوگ ہیں؟ کیا حکام ہیں یا علماء؟ اور پھر ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر کیا جا سکتا ہے تو کس صورت میں؟ اور اگر نہیں تو کس صورت میں؟ علماء نے اس موضوع پر بہت سا علمی مواد مہیا کیا ہے جسے پڑھ کر ان تمام مسائل کا علمی موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ صحیح بخاری میں کتاب العلم اور امام شافعیؒ کی کتاب الرسالہ بھی ان موضوعات سے بخوبی آ گاہی دیتی ہیں۔ فقہ العقائد کی مثالیں دیکھئے:

...... ﴿ولکم فی الأرض مستقر ومتاع إلی حین﴾ تمہارے لئے زمین میں ٹھکانہ ہے اور ایک مقررہ وقت تک کے لئے اسباب بھی ہیں۔ میں انسان کا مستقر یعنی جینے اور مرنے کی جگہ زمین ہی بتائی ہے۔ اور ﴿ منها خلقنکم وفیها نعیدکم ومنها نخرجکم تارة أخری﴾ اسی سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اسی میں ہی ہم تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں دوسری بار ہم نکالیں گے۔ فرما کر یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ کسی اور سیارے پر انسانی زندگی ممکن نہیں۔ اور اس بارے میں یہ کوششیں کہ شاید کہیں پانی مل جائے سب مایوس کن ثابت ہوں گی۔

...... یا ﴿وکنتم أمواتاً﴾ انسان میں نفخ روح سے قبل کا زمانہ موت کہا گیا ہے۔ یعنی وہ ایک جامد چیز، میت تھا۔ ﴿فأحیاکم﴾ پھر اللہ تعالیٰ نے روح پھونکی اور اسے زندہ کر دیا۔ روح سے پہلے وہ میت تھا۔ ﴿ثم یمیتکم﴾ پھر وہ تمہیں موت دے دے گا یعنی روح لے کر میت بنا دے گا۔ ﴿ثم یحییکم﴾ پھر وہ ایک اور زندگی عطا کرے گا جس میں موت نہیں آئے گی۔ اور وہ آخرت کی حیات ہے۔ جس شے میں روح نہ ہو اس کے لئے لفظ موت بولا جا سکتا ہے۔ خواہ اس سے پہلے حیات ہو یا نہ ہو۔ موت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس سے پہلے حیات ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جمادات کے لئے بھی موت کا لفظ فرمایا ہے: ﴿أموات غیر أحیاء﴾۔ اسی لئے قبر موت کے بعد ہی بنتی ہے۔

حدیث سے استخراج: حدیث کا فہم اور اس سے استخراج مسئلہ میں بھی فقہاء کرام نے خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔ ان میں استخراج مسئلہ جہاں ہے وہاں دلیل بھی موجود ہے۔ جسے دیکھ کر فقاہت کا اعلی وادنی معیار جانچا جا سکتا ہے۔ مثلاً صحیحین کی یہ حدیث: آپ ﷺ نے ظہر یا عصر کی نماز دو رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیا اور گھر کی طرف تشریف لے جانے لگے۔ صحابی رسول سیدنا ذوالیدین رضی اللہ عنہ نے ہمت کر کے عرض کی اللہ کے رسول! کیا نماز کم ہو گئی ہے یا آپ بھول گئے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہ بھولا ہوں اور نہ ہی نماز کم ہوئی ہے۔ انہوں نے عرض کی: اللہ کے رسول! پھر آپ بھول گئے ہیں۔ آپ ﷺ صف کی طرف واپس تشریف لائے اور صحابہ سے فرمایا: ذوالیدین کیا

ٹھیک کہہ رہے ہیں؟ انہوں نے عرض کی: آپ نے واقعی دو رکعات پڑھائی ہیں۔ آپ ﷺ نے مصلے پر کھڑے ہو کر تکبیر کہی اور باقی دو رکعات پڑھا کر آخر میں سجدہ سہو کر کے سلام پھیر دیا۔ پھر صحابہ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا: میں ایک انسان ہوں۔ میں بھی بھولتا ہوں جس طرح تم بھولتے ہو۔ اس لئے میں جب بھولوں تو سبحان اللہ کہہ کر مجھے یاددلایا کرو۔

فقہاء نے اس حدیث سے بے شمار مسائل مستنبط کئے جن میں ایک یہ بھی ہے کہ اگر نمازی بھول جائے تو اسے گفتگو کے ذریعے یاددہانی کرا کے باقی نماز پڑھوائی جاسکتی ہے خواہ وہ اپنا مقام نماز ہی کیوں نہ چھوڑ چکا ہو۔ نیز ایسی گفتگو سے پچھلی رکعات ضائع نہیں ہوتیں۔

ایک اور مثال۔ امام ابوداودؒ نے المراسیل میں ابوالعالیۃ الریاحیؒ سے روایت کی ہے:

جَاءَ رَجُلٌ فِيْ بَصَرِهِ ضُرٌّ، فَدَخَلَ الْمَسْجِدَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّي أَصْحَابَهُ، فَتَرَدّٰى فِي حُفْرَةٍ كَانَتْ فِي الْمَسْجِدِ، فَضَحِكَتْ طَوَائِفُ مِنْهُمْ، فَلَمَّا قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الصَّلَاةَ، أَمَرَ مَنْ كَانَ ضَحِكَ مِنْهُمْ أَنْ يُعِيْدُوا الْوُضُوْءَ وَيُعِيْدُوا الصَّلَاةَ۔ ایک آدمی جس کی آنکھ میں تکلیف تھی مسجد میں داخل ہوا۔ جناب رسالت مآب ﷺ اپنے صحابہ کرام کو نماز پڑھا رہے تھے۔ وہ آدمی اچانک مسجد کے گڑھے میں جا گرا۔ صحابہ میں سے چند اس کیفیت کو دیکھ کر ہنس پڑے۔ جب نبی کریم ﷺ نے نماز مکمل فرمائی تو آپ ﷺ نے ہنسنے والوں سے فرمایا کہ وہ اپنا وضو اور نماز دونوں لوٹائیں۔

فقہاء کرام اس حدیث کے فہم میں مختلف ہیں کہ آیا اس شخص کا وضو ٹوٹے گا یا نماز بھی جاتی رہے گی؟ بعض فقہاء نے یہ فتویٰ دیا کہ حدیث میں وضو ٹوٹنے کی بھی وضاحت ہے اس لئے کہ نماز کے ساتھ اس کا وضو بھی ٹوٹ جائے گا اور یوں اسے دونوں چیزیں لوٹانا ہوں گی۔ جب کہ کچھ فقہاء اس مسئلے کے قائل ہوئے کہ وضو توڑنے والی چیزیں تو احادیث میں مذکور ہیں اس لئے اس حدیث میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان احادیث سے متعارض ہے جو صحیح ہیں جبکہ یہ حدیث مرسل ہے۔ لہٰذا یہی کہا جاسکتا ہے کہ ایسے شخص کی نماز ٹوٹ گئی نہ کہ وضوء۔ محدثین اسے مرسل یعنی غیر متصل حدیث قرار دیتے ہیں جو ایک ضعیف حدیث ہے۔ امام دارقطنیؒ نے اس حدیث مرسل کے چوالیس طرق (سندیں) بیان فرمائے اور کہا کہ سبھی ابوالعالیۃ الریاحی پر جا کر ہی ختم ہوتے ہیں جو تابعی ہیں اور صحابی کا ذکر کئے بغیر رسول اللہ ﷺ سے حدیث روایت کرتے ہیں اس لئے سند میں کسی صحابی کا سقوط ہے۔ کوئی بھی ایسی

حدیث نہیں ملتی جو مرفوع متصل ہو۔لہٰذا یہ حدیث ہی صحیح نہیں۔ انہوں نے زور دیا ہے کہ اس مرسل حدیث کے مقابل میں سیدنا جابرؓ کی ایک موقوف روایت کیوں نہ لے لی جائے جو صحیح بھی ہے۔سیدنا جابرؓ (فتح الباری ۱/۲۸۰) فرماتے ہیں:

اَلضِّحْكُ فِي الصَّلاةِ يَنْقُضُ الصَّلاةَ وَلَا يَنْقُضُ الْوُضوءَ۔ نماز میں ہنسنے سے نماز تو ٹوٹ جاتی ہے مگر اس سے وضوء نہیں ٹوٹتا۔

استخراج واجتہاد فقہاء: فقہاء کرام کے استدلال مختلف ہوجانے کی وجہ سے استنباط واستخراج بھی مختلف ہیں۔ امام قدوریؒ، امام نوویؒ اور امام ابن قدامہؒ نے اپنی معروف کتب میں ان مسائل کی نشاندہی اپنے اپنے استدلال سے فرمائی ہے۔ یہ اختلافی آراء ایک ہی مسلک کے مجتہد اور ان کے شاگردوں کے مابین بھی ہے اور خود شاگردوں کے درمیان بھی۔یا دو مجتہدین کے درمیان بھی۔مثلاً: المختصر میں باب صفة الصلوة میں امام قدوریؒ لکھتے ہیں:

فَإِنْ قال بَدْلًا مِنَ التَّكْبِيْرِ: اَللّٰهُ أَجَلُّ، أو أَعْظَمُ، أوِ الرَّحْمٰنُ أَكْبَرُ، أَجْزَاهُ عِندَ أَبِي حَنِيفَةَ وَمُحَمدٍ رَحِمَهُما اللّٰهُ تَعَالٰی۔ وَقَالَ أبويوسُفَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی، لَا يَجُوزُ إِلَّاأَنْ يَقولَ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ أَو اَللّٰهُ الأَكْبَرُ أو اَللّٰهُ الْكَبِيْرُ۔ (ص:۲۴) اگر نمازی تکبیر تحریمہ اللہ أکبر کی بجائے اللہ أجل کہہ دے یا اللہ أعظم کہہ دے، یا الرحمن أکبر کہہ دے تو امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک ایسا کرنے سے اس کی نماز ہو جائے گی۔مگر امام ابویوسف رحمہ اللہ کا ارشاد ہے کہ ایسا کہنا جائز ہی نہیں۔ ہاں اگر نمازی اللہ أکبر کہے یا أللہ الأکبر کہے یا اللہ الکبیر کہے تو جائز ہوگا۔

☆......مکلّف کی تعریف کو پیش نظر رکھتے ہوئے محدثین کا کہنا یہ ہے کہ غیر عرب نومسلم جب نماز سیکھ لے گا اس وقت وہ وہی کلمات ادا کرنے کا مکلّف ہو جائے گا جو رسول اللہ ﷺ نے امت کو سکھائے ہیں۔غیر مسنون الفاظ ادا کرے اور نہ ہی سن انہیں سیکھے۔

☆......اسی طرح منیة المصلی ص۶ میں ہے:

ويَمْسَحُ الرَّقَبَةَ بِظُهُورِ الأَصَابِعِ الثَّلٰثِ بِمَاءٍ جَدِيدٍ۔ وَقَالَ بعضُهم، هُوَ أَدَبٌ۔ اور گردن کا مسح تین انگلیوں کے ظاہری حصے سے جدید پانی لے کر کرے۔بعض فقہاء کہتے ہیں ایسا کرنا ادب ہے۔

اسی پر ایک دوسرے فقیہ فتاوی قاضی خان سے نقل کرتے ہوئے یوں حاشیہ آرائی فرماتے ہیں:

أَمَّا مَسْحُ الرَّقَبَةِ فَلَيْسَ بِأَدَبٍ وَلَا سُنَّةٍ۔ وضوء میں گردن کا مسح نہ تو ادب میں شامل ہے اور نہ ہی سنت ہے۔

☆......ایک اور اختلاف رائے یہ بھی سامنے آیا جسے امام قدوریؒ بیان فرماتے ہیں:

وَيُكْرَهُ لِلنِّسَاءِ أَنْ يُصَلِّيْنَ وَحْدَهُنَّ بِجَمَاعَةٍ، فَإِنْ فَعَلْنَ وَقَفَتِ الإِمَامَةُ وَسْطَهُنَّ كَالْعُرَاةِ---- وَيَصُفُّ الرِّجَالُ ثُمَّ الصِّبْيَانُ ثُمَّ الْخُنْثٰى ثُمَّ النِّسَاءُ---- وَيُكْرَهُ لِلنِّسَاءِ حُضُورُ الْجَمَاعَةِ، وَلَا بَأْسَ بِأَنْ تَخْرُجَ الْعَجُوزُ فِي الْفَجْرِ وِالْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ عِنْدَ أَبِي حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى، وَقَالَ أَبُويُوسُفَ وَمُحَمَّدٌ: يَجُوزُ خُرُوجُ الْعُجُوزِ فِي سَائِرِ الصَّلَوَاتِ۔ (المختصر للقدوری:۲۹) عورتوں کے لئے مکروہ ہے کہ وہ خود باجماعت نماز پڑھیں۔ پھر اگر وہ ایسا کر بھی لیں تو عورتوں کی امام عورت، ان کے درمیان چھپ کر کھڑی ہوگی۔۔۔صف پہلے مرد بنائیں گے، پھر بچے، پھر مخنث پھر عورتیں۔۔۔عورتوں کا مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کے لئے آنا مکروہ ہے۔ بوڑھی عورت اگر فجر، مغرب اور عشاء کے لئے باجماعت نماز پڑھنے کے لئے آنا چاہے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جب کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا کہنا ہے: تمام نمازوں میں بوڑھی عورت مسجد میں نماز باجماعت پڑھنے کے لئے آسکتی ہے۔

آیات واحادیث کے فہم واختلاف کو آپ نے ملاحظہ کیا۔ اور فقہاء کرام کے اجتہادی اختلاف رائے کو بھی آپ نے ملاحظہ کیا۔ ان مسائل کی وضاحت میں علماء وفقہاء، متن قرآن ومتن حدیث میں الفاظ کی وضاحت، ان کے معانی سے اخذ شدہ نتائج اور مزید مسائل کا انکشاف یا ان کا حل، جب پیش فرماتے ہیں تو یہ سب متن کے علاوہ فروعات کہلاتے ہیں۔ جو حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی فقہ سبھی میں ملتی ہیں۔

فرع، شاخ کو کہتے ہیں جو تنے سے برآمد ہوتی ہے۔ گویا قرآن وحدیث اصل اور ان سے نکلے ہوئے مسائل فروعات ہیں۔ فقہ اسلامی میں ان کی بہت اہمیت ہے۔ ان کی ابتدا دور رسالت سے ہوگئی تھی جو بدستور جاری وساری ہے۔ صحابہ کرام نے فروعات کا فہم آپ ﷺ سے ہی سیکھا تھا مگر ان کا دور واجب، مسنون، مستحب اور مکروہ وغیرہ کی اصطلاحات سے مبرا تھا۔ بعد کے ادوار میں تفریع واستنباط کا طریقہ وہ نہ رہا جو دور صحابہ میں تھا۔ صحابہ ایسی تفریعات کو اپنے وجدانی ذوق سے معلوم کرلیا کرتے تھے۔ ہاں متاخرین کی کاوشیں چند شرائط کے ساتھ فقہ اسلامی کا نام پاسکتی ہیں۔ جن کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔ قدیم کتب تفسیر میں **الجامع لأحکام القرآن** جو امام ابن العربی اور ان کے شاگرد امام القرطبی کی بھی الگ تصنیف ہے۔ نیز دور حاضر کی تفاسیر میں أضواء البیان از مفسر محقق شنقیطیؒ، **تفسیر القرآن الکریم** از شیخ ابن العثیمینؒ، **أیسر التفاسیر** از الشیخ ابوبکر الجزائری اور اردو تفاسیر میں تفسیر مظہری از قاضی ثناء اللہ پانی پتی، **أحسن البیان** از شیخ صلاح الدین یوسف اور **تیسیر الرحمان لبیان القرآن** از ڈاکٹر محمد لقمان

سلفی نیز کتب حدیث میں صحیح بخاری اور بالخصوص کتب سنن کی شروح، موطأ امام مالک کی متعدد شروح نیز فقہ السنہ، اور فقہ الحدیث کی نئی مطبوعہ کتب اس اسلامی فقہ کی جان ہیں اور فروعات کے پیش نظر لکھی گئی ہیں تا کہ فقہ اسلامی کا صحیح ذوق قرآن وحدیث کی عبارات کے پہلو بہ پہلو متعارف کرایا جاسکے۔

فقیہ کہتے کسے ہیں؟ فقیہ وہ ہوتا ہے جو شریعت کے غالب احکام کا علم رکھتا ہو یا اس نے اپنے آپ کو ادلہ تفصیلیہ کی معرفت سے اور استنباط واستدلال میں شرعی دلائل سے مالا مال کر رکھا ہو۔ قرآن وسنت کے ٹھوس علم کے علاوہ اس میں ذیلی خوبیاں ہونا بھی ضروری ہے:

..... فقہی مسائل کے استنباط یا افتاء کے لئے وہ آیات وصحیح احادیث وروایات یا فتاوی کا چناؤ کرے۔

..... خود ثقہ اور ضابط ہو اور ضعیف وموضوع روایات واستنباط میں تمیز کا ملکہ رکھتا ہو۔

..... وہ اپنی فکر اور قوت استدلال کے ذریعے احکام اور دلائل میں منطقی ارتباط کو سمجھے جو دونوں میں موجود ہے۔

فقہاء کے درجات: آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ لَيْسَ بِفَقِيْهٍ-وَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ۔ (مسند احمد) بہت سے فقہ کے حامل غیر فقیہ یعنی ناسمجھ ہوتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو فقہ کو ایسے شخص تک منتقل کردیتے ہیں جو اس حامل سے بھی زیادہ فقیہ اور سمجھدار ہوتے ہیں۔

اس حدیث مبارک میں آپ ﷺ نے خود اپنی حدیث کو فقہ قرار دیا۔ نیز فقہاء کے درمیان ایک واضح درجہ بندی بھی فرمادی ہے کہ جو صحیح احادیث کو لفظی ومعنوی اعتبار سے بخوبی سمجھتے واز بر رکھتے ہیں اور اپنی فقہ واجتہاد کا انہیں ہی سہارا بناتے ہیں وہی فقہ اسلامی کے اعلی درجے کے فقیہ ہیں مگر جو فہم حدیث میں کوتاہ ہیں وہ دعوے کے باوجود بھی فقیہ کہلانے کے مستحق نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ احادیث پر اپنی عقل مسلط کرتے ہیں اور ضعیف وموضوع احادیث کا سہارا لے کر فقہی مسائل کا استنباط کرتے ہیں اور صحیح احادیث کو اہمیت نہیں دیتے۔ یہ انتہائی کم درجے کے فقیہ ہیں۔ سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ کی یہ روایت ہماری اس گفتگو کا حاصل ہے کہ رسالت مآب ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ مَثَلَ مَاآتَانِيَ اللّٰهُ مِنَ الْهُدٰى وَالْعِلْمِ، كَمَثَلِ غَيْثٍ أَصَابَ أَرْضًا، كَانَتْ مِنْهَا طَائِفَةٌ طَيِّبَةٌ، قَبِلَتِ الْمَاءِ وَأَنْبَتَتِ الْكَلَأَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيرَ، وَكَانَتْ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَكَتِ الْمَاءَ، فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهِ النَّاسَ، فَشَرِبُوا مِنْهُ وَسَقَوا وَزَرَعُوا، وَطَائِفَةٌ أُخْرٰى إِنَّمَا هِيَ قِيْعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً، وَلَا

تَنْبُتُ كَلَأً، فَذَلِكَ مِثْلُ مَنْ فَقُهَ فِيْ دِينِ اللّٰهِ وَنَفَعَهُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهِ فَعَلِمَ وَعَمِلَ۔ وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذَلِكَ رَأْسًا، وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللّٰهِ الَّذِيْ أُرْسِلْتُ بِهِ۔ وقَالَ الْحَسَنُ وَالْقَاسِمُ: فَعَلِمَ وَعَلَّمَ. (متفق علیہ) اللہ تعالیٰ نے مجھے جس ہدایت اور علم سے مالا مال کیا ہے اس کی مثال اس برکھا کی سی ہے جو زمین پر برسے۔ اس میں زمین کا جو حصہ اچھا اور پاکیزہ ہے وہ بارش کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ زمین کا کچھ حصہ ایسا بھی ہے جو بجائے جذب کرنے کے پانی کو روک لیتا ہے جس سے بہت لوگ مستفید ہوتے ہیں لوگ نہ صرف پانی پیتے ہیں بلکہ اپنے جانوروں اور کھیتی کو بھی سیراب کرتے ہیں۔ زمین کا ایک حصہ ٹیلے دار ہے جو برسات کے پانی کو نہ تو روک سکا اور نہ ہی وہاں کچھ اگ سکا چنانچہ یہ مثال ایسے لوگوں (فقہاء) کے لئے ہے جن میں کچھ تو ایسے ہیں جو اللہ کے دین کو صحیح معنوں میں سمجھتے ہیں اور میرے علم سے اللہ بزرگ و برتر انہیں فائدہ پہنچاتے ہیں وہ اسے جانتے بھی ہیں اور عمل بھی کرتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں (فقہاء) کے لئے بھی ہے جو میرے علم کو سیکھنے اور پانے کے لئے اپنا سر تک نہیں اٹھاتے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ اس ہدایت کو قبول کرتے ہیں جسے دے کر میں بھیجا گیا ہوں۔

امام خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث میں جناب رسالت مآب ﷺ نے فقہاء کرام اور فقاہت کے مدعی سب حضرات کے مراتب بڑی باریکی سے ارشاد فرما دیے ہیں۔

پہلا درجہ: اچھی اور پاکیزہ زمین کا ہے جس سے مراد۔۔۔ وہ خدا ترس فقہاء کرام ہیں جو علم شرعی میں اور بالخصوص روایت (حدیث) میں ضابط (Accurate) ہوں۔ ان کی دینی بصیرت ایسی ہوتی ہے کہ وہ ہر مسئلے کو قرآن وصحیح حدیث کے دلائل سے آراستہ کرتے ہیں۔

دوسرا درجہ: بنجر اور سخت زمین کا ہے جو پانی کو جذب کرنے کی بجائے روک لیتا ہے اور خلق خدا اس سے محظوظ ہوتی ہے۔ مراد وہ فقہاء کرام ہیں جو شرعی مسائل پر مبنی احادیث کو سننے کے بعد محفوظ کریں، انہیں یاد بھی رکھیں اور وقت ضرورت انہیں دوسروں تک من وعن پہنچا دیں۔ اس طرح اس کے پہنچانے میں بہتوں کا فائدہ ہے کہ حدیث رسول جسے یہ فقیہ آگے پہنچائے ہوسکتا ہے کہ وہ نہ صرف یاد رکھے بلکہ اس سے زیادہ بہتر طریقے سے بہت سے لوگوں تک پہنچا کر انہیں دین کی راہ پر لے آئے۔ آپ ﷺ کے ارشاد کا یہی معنی تو ہے:

رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ لَيْسَ بِفَقِيهٍ۔ وَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ۔ (مسند احمد) بہت سے فقہ کے حامل غیر فقیہ یعنی ناسمجھ ہوتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو فقہ کو ایسے شخص تک منتقل کر دیتے ہیں جو اس حامل سے بھی زیادہ فقیہ اور سمجھدار ہوتے ہیں۔

آپ ﷺ نے اپنی حدیث مبارک کے حاملین کو فقیہ قرار دیا۔

تیسرا درجہ: اس نام نہاد فقیہ کا ہے جو حدیث تو سنے مگر سن کر نہ اسے یاد رکھ سکے اور نہ ہی اسے ضبط کر سکے اور نہ ہی اس کے مطابق مسئلہ بتا سکے۔ وہ نہ پاکیزہ زمین کی طرح ہے اور نہ ہی بنجر زمین کی مانند، بلکہ وہ تو ہر خیر سے محروم ہے۔ ایسے شخص کی مثال ٹیلے جیسی ہے جہاں گھاس اُگتا ہے اور نہ ہی وہاں پانی رکتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سچ فرمایا ہے: ﴿هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون﴾ (الزمر: ۹) کیا علم والے اور لاعلم لوگ برابر ہو سکتے ہیں؟ اسی طرح یہ ارشاد: ﴿أفمن يعلم أنما أنزل إليك من ربك الحق كمن هو أعمى﴾ (الرعد: ۱۹) کیا بھلا جو یہ علم رکھتا ہے کہ جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے وہ حق اور سچ ہے وہ اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جو اندھا ہو؟ اللہ تعالیٰ نے علم صحیح ترک کرنے والے کو، اس سے اجتناب برتنے والے کو، اسے احترام نہ دینے والے اور ایسے علم کو جھوٹ کہنے والے کو کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ ﴿واتل عليهم نبأ الذي آتيناه آياتنا فانسلخ منها... فمثله كمثل الكلب﴾. (الأعراف: ۱۷۵۔۱۷۶) ان پر اس شخص کی خبر کو پڑھئے جسے ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا تو وہ ان سے کھسک گیا۔۔۔تو اس کی مثال کتے کی مثال کی مانند ہے۔۔(الفقیہ والمتفقہ ۱/۷۹!)

غلط فہمیاں: فقہ کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں اور غلط رجحانات بھی ہمارے معاشرے میں بکثرت ہیں۔ بعض لوگ فقہ کو محض فقہاء کرام کا جھگڑا اور اختلاف سمجھتے ہیں اس لئے کہ مختلف فقہی مسالک کے حلقوں اور دروس وکتب میں یہ سب کچھ پڑھنے اور دیکھنے میں آتا ہے۔ اس طرح وہ اس سے یکسر کنارہ کش ہو گئے۔ بعض نے فقہاء کرام کے اقوال وفتاوٰی کو ہی صرف فقہ گردانا اور قرآن وسنت کے اصل چشموں سے سیرابی نہ چاہی۔ حالانکہ کسی فقیہ کی تمام فقہیات کو من وعن قبول نہ کرنا اور بات ہے اور فقہ سے نفرت دوسری بات۔ جبکہ ایک معتدل مسلمان میں پہلی بات تو ہونی چاہئے اور دوسری سے اعلان براءت۔ اس لئے کہ مسلمان جب قیاس کو حجت مانتا ہے تو پھر فقہ سے نفرت کا کیا مطلب؟ ہاں فقہی استنباطات ومسائل میں تنقید ہوتی آئی ہے جس کی گواہی اور نقد کی شہادتیں ہمیں فقہاء اربعہ ومسالک اربعہ کے متون وشروح میں بکثرت ملتی ہیں۔ مذکورہ دونوں گروہوں نے جس افراط وتفریط سے کام لیا ہے اس نے عوام کو بھی قرآن وسنت کے صحیح فہم سے دور کر دیا ہے۔

یاد رکھنے کی بات: ہماری شریعت کا مصدر (Source) وحی الٰہی ہے۔ اس کا نازل کرنے والا رب العالمین ہو۔ جو دنیا میں محض اس لئے آئی ہو کہ حیات انسانی سے متعلق جملہ امور ومسائل کا حل پیش کر دے۔ کیا ایسی شریعت میں

اختلافات کی بھرمار ہوگی؟ اللہ تعالیٰ کا یہ احسان عظیم ہے کہ اس نے رسول رحمت پر اپنی شریعت نازل کی اور اہل ایمان کو عطا کی۔ اس شریعت میں سراسر رحمت ہی رحمت ہے۔ مکمل یگانگت وہم آہنگی ہے۔ اختلاف نہیں۔ جب اہل علم نئے مسائل پر غور وفکر کر کے اپنی آراء جب دیتے ہیں تو لامحالہ وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں جو دینی وسعت ہے۔ اہل درد صرف اس رائے کو ترجیح دے دیتے ہیں جو صحیح مدلل ہو، وزنی ہو۔ اس باب میں تعصب شامل نہیں ہونا چاہئے جو بہر صورت مذموم ہے۔

☆......دنیا میں انسان کو نت نئے حوادث کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ناگزیر ہیں۔ ہر لمحہ ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ شریعت نے ان کی تفاصیل کچھ اس انداز سے دی ہیں کہ ان میں بعض ناقابل تغیر ہیں اور بعض میں اجتہاد واستنباط کی گنجائش ہے۔ مثلاً احوال شخصیہ یعنی عقائد وعبادات، نکاح ومواریث اور وفات جیسے امور ناگزیر ہیں۔ ان کے لئے ایک صحیح رخ احکم دے کر انسانی معاشرے کو سنبھالا ہے۔ ان میں اختلاف نہ ہونے کے برابر ہے اور اگر ہے تو وہ فرد کی طرف سے ہے شریعت اس میں قصور وار نہیں۔ اس اختلاف کی اصلاح قرآن وسنت کی روشنی میں ہونی چاہئے۔ مگر جو امور نئے حوادث کی وجہ سے تغیر پذیر ہیں ان کے بارے میں شریعت نے کچھ عام قواعد متعارف کرائے جن سے وقتی حالات وحوادث کے احکام، استنباط کیے جاسکتے ہیں۔ ان استنباطات میں احوال یا ماحول کی مناسبت سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ فقہاء کرام کے اختلاف کو بھی اسی نظر سے دیکھنا چاہئے۔

☆......علاوہ ازیں دین کی مبادیات اور اصولوں میں علماء دین کے مابین کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوا اختلاف جب بھی رونما ہوا تو فروعات دین میں ہوا ہے۔ اور فکر ونظر کا اختلاف ہونا باعث حیرت نہیں بلکہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ انسانوں کا کون سا بنایا ہوا ایسا قانون ہے جس میں اتفاق ہو۔ اختلاف کی گنجائش ان میں بھی رہتی ہے۔ اس لئے فروعی مسائل میں جو بظاہر اختلاف نظر آتا ہے وہ ہمارے مجتہدین کے نصوص شرعیہ (Text of Qur'an &Hadith) کو واقعات پر منطبق (Apply) کرنے کی وجہ سے ہوا ہے۔

فقہ اسلامی میں مصالح عامہ کا خیال

اسلامی شریعت ایک بڑی اہم اساس پر قائم ہوئی۔ لوگوں کی مصالح کا خاص خیال رکھنا۔ یعنی ان سے مفاسد اور مضر کو دور کرنا اور مفید ومناسب مہیا کرنا۔ یہ ایک ایسا جامع اصول ہے جو شریعت کے تمام احکام پر محیط ہے۔ اس لئے شریعت کے ہر حکم میں یہ چیز ضرور پائی جاتی ہے کہ مفاسد ومضر کو دور کرنا یا مفید ومناسب کو مہیا کرنا۔ شرعی احکام

دیتے وقت انسان کی ان ضرورتوں کا جو خاص خیال رکھا گیا ہے اسی سے اسلامی فقہ کے مزاج کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بالا اختصار عرض خدمت ہے ورنہ تفصیل میں جائیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی شریعت اپنے پہلے دور میں متعدد بنیادوں پر قائم تھی۔ جن میں سے اہم درج ذیل ہیں:

رفع حرج: حرج عربی زبان میں تنگی کو کہتے ہیں۔ جس کا شرعی معنی یہ ہے کہ احکام دیتے وقت یہ لحاظ رکھا گیا کہ لوگ شرعی حکم پر عمل کے وقت تنگی محسوس نہ کریں۔ یہ مطلب نہیں ہر مشقت جو شرعی احکام بجالاتے وقت مکلف کو جھیلنا پڑتی ہے وہ اٹھالی گئی کیونکہ کوئی عبادت ہو یا تکلیف، اس میں مشقت تو ہے خواہ وہ معمولی ہو یا بہت ہی تھوڑی۔

رفع حرج کے دلائل: قرآن پاک میں:

﴿ماجعل عليكم في الدين من حرج﴾ (الحج: ۷۸) اس نے تم پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں ڈالی۔

﴿ما يريد الله ليجعل عليكم من حرج﴾ المائدہ: ٦۔ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ وہ تم پر دین کے معاملے میں کوئی تنگی ڈال دے۔

﴿يريد الله بكم اليسر و لا يريد بكم العسر﴾ البقرة: ۱۸۵ اللہ تعالیٰ تم سے آسانی کرنا چاہتا ہے تنگی نہیں کرنا چاہتا۔

احادیث رسول میں:

آپ ﷺ کا ارشاد اور سیدنا معاذ بن جبل وابوموسیٰ اشعری کو یہ نصیحت:

يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا، بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا۔ (صحیح بخاری) آسانی کرنا تنگی نہ کرنا، خوشخبری سنانا نفرت انگیز باتیں نہ کرنا۔

اسی طرح:

إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ، وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ، فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا وَأَبْشِرُوا۔ (صحیح بخاری) یقیناً یہ دین آسان ہے۔ دین کو کسی نے بھی شدت سے لینا چاہا تو یہ اس پر غالب آیا ہے۔ لہٰذا تم استقامت اختیار کرو اور معتدل رہو اور دین کی خوشخبری قبول کرو۔

اُم المؤمنین کی آپ ﷺ کے مزاج کے بارے میں یہ اہم خبر:

أَنَّهُ مَا خُيِّرَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بَيْنَ أَمْرَيْنِ إِلَّا اخْتَارَ أَيْسَرَهُمَا، مَا لَمْ يَكُنْ إِثْماً۔ (صحیح بخاری)۔ رسول اللہ ﷺ جب بھی دو کاموں میں ایک کے کرنے کا اختیار دیئے گئے تو آپ ﷺ ان میں آسان کام کو ہی پسند فرمایا

بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہوتا۔

رفع حرج کی مثالیں:

......پانی کی عدم موجودگی میں تیمم کا استعمال

......نمازی جس طرح بھی نماز پڑھنے کی استطاعت رکھتا ہے ویسے ہی پڑھ لے۔ جو کھڑا نہیں ہوسکتا وہ بیٹھ کر اور جو بیٹھ کر نہیں وہ پہلو پہ لیٹے لیٹے پڑھ لے۔

......رمضان میں مسافر اور بیمار کو روزہ نہ رکھنے اجازت۔ جب صحت یاب ہو تو ان کی قضا دے دے۔

......موزوں اور جرابوں پر مسح کرنے کی اجازت اس لئے کہ ان کے اتارنے اور پاؤں کو دھونے میں مشقت ہے۔

......طلاق کی اجازت، رجوع کی اجازت اور طلاق کی تعداد کا تعین کہ تین تک نہ پہنچ پائیں۔

......لعان کی اجازت۔ وغیرہ

۲۔**قلتِ تکلیف**: کم سے کم اعمال دیئے جائیں تاکہ لوگ دین کو بآسانی اور خوشی سے اپنا سکیں۔

۳۔**تدریج**: کسی بھی بدعادت کو چھڑانے اور اسے اچھائی کی طرف لانے کا تدریجی پہلو نظر انداز نہ کیا جائے۔

آج ان تینوں پہلوؤں کو نظر انداز کر کے شریعت یا فقہ اسلامی کو بہت مشکل بنا دیا گیا ہے اور ایسے مسائل پیش کئے جاتے ہیں جن کا فقہ سے یا شریعت کے مزاج سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی گو سخت ہے مگر اسی مزاج کی نشان دہی کرتا ہے:

لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ۔ اللہ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت فرض نہیں۔ بلاشبہ اطاعت تو معروف میں ہوا کرتی ہے۔

اس کی وضاحتی مثال یہ ہے کہ کسی سفر میں مسلمانوں کے (أولی الأمر) امیر نے ان سے کہا: آگ میں کود جاؤ۔ کچھ نے ارادہ بھی کر لیا مگر آپ ﷺ کو جب علم ہوا تو فرمایا: اگر یہ کود جاتے تو ہمیشہ آگ میں ہی رہتے۔ اس لئے کہ یہ صحیح اسلامی فقہ نہیں ہے۔ اس واقعہ میں غور طلب بات یہ ہے کہ:

......ان کا کودنا کیا اپنے امام اور اولی الأمر کے فرمان کے مطابق نہیں تھا اور کیا اس کی بجا آوری وہ اپنے اوپر واجب نہیں سمجھتے تھے؟

..... آپ ﷺ کے سخت ارشاد کا منشاء یہ ہے کہ انہوں نے اپنی سمجھ پر زور کیوں نہ دیا اور صرف أولی الأمر کے حکم پر اللہ کی نافرمانی کرنے کے لئے تیار ہو گئے؟۔

..... اطاعت کے حکم کو انہوں نے عام بنا دیا جس میں وہ چیز بھی داخل کر دی جو شارع کی منشاء کے خلاف تھی بلکہ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ حرکت دین کے خلاف ہے۔

..... باوجود اس کے انہوں نے اعلیٰ بات یا اعلیٰ پہلو سمجھنے کی کوشش نہ کی اور خود کو ہلاک کرنے اور اپنی جانوں پر عذاب کرنے کی ٹھان لی اور وہ بھی بغیر ثبوت اور دلیل کے کہ یہ اللہ ورسول کی اطاعت بھی ہے یا نہیں؟

لہٰذا جب معمولی غلطی پر اس قدر سخت وعید ہے کہ وہ اگر ایسا کر لیتے تو جہنمی بن جاتے تو پھر ان لوگوں کی سزا کا تصور تو بہت بھیانک نظر آتا ہے جو کھلے عام ان احکام کے خلاف فتوے دیں یا کسی عمل سے باز رکھیں جو ہادی برحق نے کر کے دکھا دیا ہو۔

یہی دین کا مزاج ہے اور ہر عمل میں کارفرما ہے۔ اس کے بغیر دین کی صحیح اشاعت نہیں ہو سکتی۔ اولی الامر کی اطاعت کیجئے مگر آنکھیں کھول کر۔ بند آنکھیں کسی گڑھے میں گرا سکتی ہیں اور بے بصیرتی بہت بڑا اندھا پن ہے۔ نیز یہ علم مسلمان کو خواہشات کا بندہ بھی نہیں بننے دیتا اور نہ ہی طوق وسلاسل کے بوجھ تلے دبنے دیتا ہے۔ یہ اتنا آسان دین ہے کہ لوگ فکری ہم آہنگی کے ساتھ شریعت کے جھنڈے تلے جمع ہو سکتے ہیں۔ اس لئے تو شریعت اپنی وسعت کے باوجود فکری اتحاد پر اکساتی ضرور ہے مگر اس کی اجازت نہیں دیتی کہ چار افراد رائے دیں اور پھر ہر ایک کی رائے پر سختی سے جمود اختیار کر کے اسے مذہب بنا لیا جائے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اس انتشار فکر اور تعصب نے مسلمانوں کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔

دوسری طرف ہمارا حال یہ ہے کہ کتاب اللہ کو ہم نے مشکل کتاب کہہ دیا اور اس کے فہم کے لئے سولہ یا ساٹھ علوم کی شرط عائد کر دی۔ عام آدمی یہ سوچتا ہے کہ قرآن اگر سمجھنا اتنا مشکل ہے تو پھر یہ اترا کیوں؟ اور اترا تو کس کے لئے؟ یہ سوچ هدی للناس کا کیا مفہوم دیتی ہے؟

احادیث رسول کو بھی اہل سنت کے ایک بڑے طبقے نے مشکل موضوع بنا دیا۔ روایت ودرایت کا سہارا لے کر صحیح حدیث کی ایسی تاویلات کیں کہ لوگ کیا ایک طالب علم بھی متنفر ہو جائے۔ مگر اپنی فقہ کی انتہائی دقیق، مشکل اور پیچیدہ کتب کو آسان سمجھا دیا اور اس کے مسائل بھی آسان فقہ لگے۔ وہاں اختلاف بھی اتحاد نظر آیا۔ مگر ایسا رویہ حدیث رسول کے ساتھ نہ برتا جا سکا۔ کاش کچھ محنت قرآن وحدیث کی تفہیم پر بھی صرف ہوتی۔ اور آسان قرآن یا

آسان حدیث مسلمان کو باور ہوتی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ان پبلشرز کو جواب قرآن وحدیث کے علم کو سہل اور خالص صورت میں پیش کر کے ایسی غلط فہمیاں دور کر رہے ہیں۔ ان مطبوعہ کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے فقہاء عظام کی آراء میں خدا خوفی اور وسعت علمی ہے۔ وہ محترم بھی رہے اور اختلاف کا حق بھی دیا۔ نہ انہیں ایک دوسرے پر غصہ آیا اور نہ ہی وہ گستاخ ٹھہرے اور نہ ہی کسی نے ان سے تعاون کو حرام قرار دیا۔

دوسرا باب:

تاریخ تدوین فقہ اور اس کے مراحل

اسلام بلاشبہ ایک ترقی پذیر دین ہے زندہ مسائل کا حل پیش کرنا اس کی خصوصیات میں سے ہے۔ اس کے مآخذ میں جتنی تیسیر (facilitation) اور یُسر flexibility ہے وہ شاید انسان کی محدود سوچ میں نہیں سما سکتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ضرورت کے مطابق نزول وحی اس طرح ہوئی کہ وقتی مسئلے حل ہوتے گئے۔ یہی دین کا مزاج ہے کہ وہ اپنا تعارف ایک ثابت، ٹھوس مگر ترقی پذیر دین کی حیثیت سے کراتا گیا اور اسی پر صحابہ وتابعین وغیرہ کی اٹھان ہوئی۔ اس لئے تاریخی اعتبار سے فقہ اسلامی کے عموماً دو ادوار نظر آتے ہیں۔ ترقی پذیر دور اور جمود کا دور۔ ترقی پذیر دور کے تین مراحل ہیں جن میں زمانہ رسالت، دور صحابہ اور دور تابعین وتبع تابعین شامل ہیں۔ جمود کا دور ایک طویل دور انئے کا ہے جو ان ازمنہ ثلاثہ کے بعد سے تا حال جاری وساری ہے جو عہد تقلید کہلاتا ہے۔ ذیل کی مختصر تاریخ کو بہ اختصار سمجھئے۔

تاریخ: عربی زبان میں وقت اور اس کے حالات کا تعارف اور اس سے تفصیلی آگاہی کو تاریخ کہتے ہیں۔ جیسے عرب کہتے ہیں: أَرَّخْتُ الكِتَابَ: میں نے کتاب کو ایک تاریخ بنایا یعنی اس میں تاریخ کو اس طرح بیان کیا کہ اس میں اس کے اختتام کا وقت تک بیان کر دیا۔ اصطلاح میں ایسے علم کو کہتے ہیں جو واقعات وحوادث پر مشتمل ہو۔ ان کے اوقات وزمانہ کا ذکر کرے اور یہ بتائے کہ اس نے حیات انسانی پر کیا اثرات ڈالے ہیں۔

ہر علم کی ایک تاریخ ہوتی ہے جس میں اس علم کی نشو ونما، اس کے ترقیاتی مراحل، اس کے بانی ومددگار اور ان کے افکار وغیرہ کا تفصیلی ذکر ہوتا ہے۔ اسی طرح فقہ اسلامی کی بھی اپنی تاریخ ہے۔

پہلا دور: **زمانہ رسالت میں فقہ:** رسول اکرم ﷺ کا زمانہ، زمانہ وحی تھا۔ شرعی احکام آپ پر نازل ہوتے۔

جنہیں آپ ﷺ صحابہ کرامؓ تک پہنچا دیتے۔ صحابہ کرامؓ کیلئے بھی شریعت کا مصدر Source یہی قرآن وسنت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فہم دین کے ساتھ اطاعت کا بھرپور جذبہ عطا کیا تھا۔ یہی کچھ انہوں نے آپ ﷺ کی صحبت میں رہ کر سیکھا تھا وہ (receptive) قبول کرنے والے تھے۔ اس احسان عظیم کو ان ان پڑھ لوگوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے ان پر کیا تھا:

﴿هوالذى بعث فى الأميين رسولا منهم يتلو عليهم آيته ويزكيهم ويعلمهم الكتب والحكمة وإن كانوا من قبل لفى ضلل مبين﴾ وہی تو ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول کو اٹھایا جو ان پر تلاوت آیات کرتا ہے ان کا تزکیہ بھی کرتا ہے اور انہیں تعلیم کتاب وحکمت بھی دیتا ہے۔ (سورۃ الجمعۃ:۲)

ایمان کے بعد انہوں نے ذہنی ارتقاء کا جو سفر شروع کیا وہ حالات، واقعات اور مسائل کو سمجھا تا گیا۔ انہیں فقہی مسائل کی تمام باریکیوں کا علم بارگاہ رسالت سے معلوم ہو جایا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ بیشتر معمول بہا مسائل کو جاننے کیلئے جہاں آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں سوال کرتے، وہاں بغور سنتے اور بہت باریک بینی سے اسے ملاحظہ بھی کرتے تھے۔ سوال کرنے اور مین میکھ نکالنے کی بجائے وہ آپ ﷺ سے جو سنتے، بس اس پر عمل کر لیا کرتے تھے۔ اس لئے کہ قرآنی آیات اور تعلیمات نبوی سے وہ جان چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کیا چاہتے ہیں اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہمیں کس کی اطاعت ومحبت کرنی چاہئے۔

آپ ﷺ کے زمانہ میں یہی فقہ تھی جو صرف اور صرف وحی پر مبنی تھی۔ یہ فقہ صحابہ کرام کو اہل علم میں شامل کر گئی۔ مگر ظاہر ہے مدوّن نہ تھی۔ ان دنوں شرعی احکام میں صحابہ وتابعین میں وہ بحث وتمحیص نہیں تھی جو بعد کے ادوار میں فقہاء کرام کی امکانی جدوجہد کا نتیجہ بنی۔ جن میں ارکان اسلام اور اس کی فروعات کو چند شروط وقواعد کے ساتھ اصطلاحی نام دیئے گئے۔ تا کہ ان کی اہمیت واضح ہو۔

صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ کو وضوء کرتے، نماز پڑھتے، حج کرتے، روزہ رکھتے اور معاملہ کرتے دیکھا۔ اور آپ ﷺ سے ہر ایک کے بارے میں اہمیت بھی سنی۔ اور اسے وہ حیثیت دی جو ایک باعمل، خداترس اور حب رسول سے سرشار کوئی بھی مومن دے سکتا ہے۔ اور اس کے بہتر نتائج بہ الحاح رب کریم سے چاہتا ہے۔

آپؐ سے انہوں نے سنا: وَيْلٌ لِلأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ خشک ایڑیوں کیلئے آگ کا عذاب ہے۔ یہ بھی آپؐ نے فرمایا:

اِرْجِعْ فَأَحْسِنْ وُضُوءَ كَ. واپس جاؤ اچھی طرح وضوء کرو۔ (أبوداود) نماز کے بارے میں آپ ﷺ سے یہ سنا: صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِيْ أُصَلِّيْ. نماز اس طرح پڑھو جیسے مجھے پڑھتا دیکھو۔ حج کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: خُذُوا عَنِّيْ مَنَاسِكَكُمْ۔ مجھ سے اپنے لئے مناسک حج سیکھ لو۔

یہ سب ارشادات وآثار اپنی جگہ بلاشبہ اہم ہیں۔ مگر صحابہ کرامؓ نے ان تمام عبادات وغیرہ کو بغیر یہ سوچے اور بغیر یہ سنے کہ یہ رکن ہے۔ یہ فرض ہے۔ یہ مستحب ہے یا یہ ادب ہے۔ آپ ﷺ کو بغور دیکھتے گئے۔ اور دل وجان سے ان پر عمل کرتے گئے۔ ان کے بارے میں سوال شاذ ونادر ہی کیا کرتے۔ آپ ﷺ نے نہ تو صحابہ کو بتایا کہ وضوء کے چار فرض ہیں یا چھ۔ اور نہ ہی یہ کہ جہری نماز میں سورہ فاتحہ سے قبل بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھنا فرض ہے یا سنت۔ مگر بلاشبہ آپ ﷺ کے اداشدہ الفاظ اور کیفیت سے صحابہ کرامؓ اس مسئلہ کی اہمیت کو بآسانی سمجھ جاتے تھے۔ آپ ﷺ کے دور میں سنت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے احکام میں صحابہ کرام نے اجتہادات بھی کیے۔ مگر آپ ﷺ نے نہ انہیں ڈانٹا ڈپٹا اور نہ ہی ایسا کرنے کو غلط کہا۔ اس لئے اچانک ایسا معاملہ پیش آنے پر جبکہ وہ آپ سے دور ہوں یا آپ کہیں ہوں تو انہیں اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا کہ وہ سوچیں اور مسئلے کا حل نکالیں۔

☆......نماز عصر بنوقریظہ میں جاکر پڑھنے کا معاملہ ہو یا یمن میں تین شخصوں کا ایک لڑکے کے بارے میں دعوے دار ہونے کا مقدمہ اور قرعہ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ دینا اور باقیوں کو تہائی تہائی دیت ادا کرنے کا کہنا۔ آپ کو جب اس فیصلے کا علم ہوا تو آپ خوب ہنسے یہاں تک کہ مسوڑھے تک نظر آنے لگے۔

☆......سعدؓ بن معاذ نے بنوقریظہ کے بارے میں اپنے اجتہاد سے فیصلہ کیا جسے آپ نے پسند فرما کے کہا: تو نے ان کے بارے میں ٹھیک وہی حکم کیا ہے جو اللہ نے ساتوں آسمانوں کے اوپر فرمایا تھا۔

☆......مجزز مدلجی نے قیاس وقیافہ کر کے جب زید واسامہ کے قدم دیکھ کر کہا کہ آپس میں ایک ہیں یہ دونوں باپ بیٹا ہیں۔ تو حضور اکرم ﷺ اس قدر خوش ہوئے کہ چہرہ مبارک کی رگیں چمکنے لگیں۔ جو اس قیاس کی صحت اور صحیح مطابقت کی وجہ سے تھی۔ بظاہر حضرت زید سفید رنگ کے تھے اور اسامہ سیاہ رنگ کے۔ لیکن قیافہ شناس نے فرع کو اصل سے اور نظیر کو نظیر سے ملا دیا۔ اس لئے فیصلوں میں سیاہی اور سفیدی کا فرق غیر مؤثر ہوتا ہے۔ آپ کی یہ رضا مندی تب ہی ہوتی تھی جب لوگ واپس آکر معاملے کی وضاحت کر دیتے۔ غلط ہوتا تو اسے درست فرما دیتے ورنہ رضامندی ظاہر فرماتے۔ یہ زمانہ نبوت کے سال اول سے لے کر آپ ﷺ کی وفات یعنی سن ۱۱ ہجری تک محیط ہے

زمانہ صحابہ میں: انہوں نے دین کے اصل جلال اور جمال کو دیکھا بھی اور پایا بھی۔ صحابہ کرام نے اللہ تعالیٰ کی اس امانت کو نور نبوت سے حاصل کیا اور اپنا عہد ختم ہونے سے پہلے پہلے بلاکم وکاست پورے کا پورا اگلی نسل کو منتقل کردیا۔ سیرت طیبہ کا علم ہو یا حدیث رسول کا، اگر کسی صحابی کو نہیں تھا تو اس کا علم دوسرے صحابہ کو ہوتا تھا اور یہی حال بعد کی نسلوں کا تھا، ہے اور رہے گا۔ صحابہ قرآن وسنت ہی کے پابند تھے۔ یہی دونوں چیزیں ان کے عہد میں فقہ وشریعت کا کورس اور Source تھیں۔ کسی بھی فقہی مسئلہ کا علم نہ ہوتا تو قرآن سے تلاش کرتے ورنہ حدیث رسول سے۔ بصورت دیگر وہ اجتہاد کرتے۔ یہی ان کے اصول تھے اور اس پر سختی سے عامل تھے۔ کوئی غلط فہمی کا شکار ہوتا تو اس کی اصلاح کے لئے فوراً احدیث رسول پیش کردیا کرتے۔ جدہ کی میراث کا مسئلہ ہو یا استئذان کا، طاعون زدہ علاقہ میں جانا ہو یا نکلنا، یہ سب فقہی مسائل تھے اور دیکھا دیکھی کی طرف جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے حیات رسول ﷺ میں:

هٰذَا قَضَائِیْ مَنْ لَّمْ یَرْضَ بِقَضَاءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ۔ جو رسول اللہ ﷺ کے فیصلے سے خوش نہیں تو پھر عمر کا فیصلہ یہی ہے۔

کہا اور اللہ نے اس کی تائید ساتویں آسمان سے کردی اور منافق کا خون ضائع قرار دیا اور یوں:

﴿وإذا قيل لهم تعالوا إلى ما أنزل الله وإلى الرسول رأيت المنافقين يصدون عنك صدودا﴾ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور اس کے رسول کی طرف، تو تم دیکھتے ہو کہ منافق آپ سے پرے بھاگتے ہیں۔

سیدنا عمرؓ کے اجتہاد کو درست قرار دیا کہ رسول کے فیصلے یا اس کی نص (Text) کے ہوتے ہوئے کسی اور کی بات، فیصلہ یا مسئلہ نہیں مانا جاسکتا۔ ابن عمرؓ نے:

ءَ أَمْرُ أَبِیْ یُتَّبَعُ أَمْ قَوْلُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ

کیا میرے باپ کی بات مانی جائے گی یا جناب رسالت مآب ﷺ کی۔

کہہ کر باور کرادیا کہ فقہ میں اصل مقام قرآن کے بعد رسول اکرم ﷺ کا ہے نہ کہ رجال کا۔ اور جب لوگوں نے انہیں یہ کہا کہ وہ نہ صرف امیر المومنین ہیں بلکہ آپ کے والد بھی ہیں تو یہاں تک کہہ دیا: مَنْ أَبِیْ؟ میرے والد کون ہوتے ہیں؟ (مسند احمد)۔

حالات جیسے بھی بنتے گئے صحابہ کرام اسی اصول کے مطابق فقہ اسلامی کو آگے بڑھاتے گئے کہ مسائل کے حل کے لئے سب سے مقدم قرآن مجید، پھر احادیث رسول ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً:

- ......آپ ﷺ کی وفات پر یہ مسئلہ کھڑا ہوا کہ آپ کو کہاں دفنایا جائے؟
- ......آپ ﷺ فوت بھی ہوئے ہیں یا نہیں؟
- ......آپ ﷺ کے بعد خلیفہ کون ہو؟
- ......لشکر اسامہ کو روانہ کیا جائے یا نہیں؟
- ......رسول اللہ ﷺ کی میراث اور اس کی تقسیم کا معاملہ۔
- ......منکرین زکوۃ کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟
- ......جمع قرآن۔

اس ضمن میں صحابہ کرامؓ کی مختلف آراء نے فہم کے اختلاف کو ظاہر کیا۔ چنانچہ مسائل کے حل کیلئے انہوں نے ایسے اصولوں پر اتفاق کیا۔ جن کی مستقبل میں زمانہ اور حالات کی تبدیلی کے باوجود اساسی وابدی حیثیت برقرار رہے۔ مثلاً یہ اصول:

...... جو مسائل قرآن وسنت میں واضح ہیں انہیں من وعن لیا جائے اور اپنی رائے کا دخل نہ دیا جائے۔

...... کسی بھی پیش آمدہ مسئلہ کے حل کیلئے اولاً قرآن مجید کو دیکھا جائے اگر اس میں مل جائے تو خیر ورنہ

...... حدیث رسول میں اسے تلاش کیا جائے۔ اگر حدیث میں وضاحت ہو تو درست بصورت دیگر

...... صحابہ کرامؓ کی متفقہ رائے واجتہاد پر نظر کی جائے ورنہ

...... اجتہاد کیا جائے۔

یہ اصول بھی دیکھنے میں آیا کہ اگر صحابہ کرام میں سے کسی کا اجتہاد ورائے بعد میں معلوم ہونے والی حدیث رسول کے خلاف ہوتا تو وہ بخوشی اپنے اجتہاد یا رائے واپس لے لیتا۔ جیسے حج تمتع کی ممانعت کا آرڈیننس یا بیک وقت دی گئی طلاق ثلاثہ کے بارے میں آرڈیننس۔ فقہ اسلامی کی یہی وہ اساس تھی جو صحابہ کرام کے دور میں فراہم کردی گئی تھی۔ بعد میں فقہاء وعلماء امت نے بھی اسی کی بنیاد پر فقہ کی عمارت کھڑی کی۔

فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت ص ۶۳۰ میں ہے:

أَجْمَعَ الصَّحَابَةُ عَلَى أَنَّ مَنِ اسْتَفْتَى أَبَابَكْرٍ وَعُمَرَ أَمِيرَيِ الْمُؤمِنِينَ، فَلَهُ أَنْ يَسْتَفْتِيَ أَبَاهُرَيْرَةَ وَمُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ وَغَيْرَهُمَا وَيَعْمَلُ بِقَوْلِهِمْ بِغَيْرِ نَكِيْرٍ۔ یعنی صحابہ کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو شخص

ابوبکرؓ اور عمرؓ سے فتویٰ پوچھے وہ ابو ہریرہؓ اور معاذ بن جبلؓ اور ان کے سوا دیگر حضرات سے بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فتوے پوچھ کر عمل کر سکتا ہے کسی کو اس سے انکار نہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ الإنصاف ص ۵۹ میں فرماتے ہیں:

قَالَ ابْنُ الْهَمَامِ فِي آخِرِ التَّحْرِيْرِ: كَانُوا يَسْتَفْتُونَ مَرَّةً وَاحِدًا، وَمَرَّةً غَيْرَهُ، غَيْرَمُلْتَزِمِينَ مُفْتِيًا وَاحِدًا۔ ابن الہمام نے التحریر کے آخیر میں لکھا ہے: کہ اسلاف کبھی کسی سے فتوے پوچھتے اور کبھی کسی سے۔ ایک مفتی کو انہوں نے لازمی نہیں پکڑا ہوا تھا۔

جن مسائل میں احادیث صحیحہ موجود تھیں اور ان میں بظاہر باہم کوئی تعارض نہیں تھا ان کے مطابق فتویٰ دینا صحابہ کے لئے آسان کام تھا۔ مشکل وہاں تھی جہاں سرے سے حدیث ہی موجود نہ تھی۔ ایسے مسائل کی تدوین کا پہلا طریقہ استنباط اور اجتہاد تھا۔ اس میدان میں صرف سیدنا عمر، سیدنا علی، سیدنا ابن عباس اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہم ہی خاص طور پر ممتاز تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

وأَمَّا غَيْرُ هٰؤُلَاءِ الأَرْبَعَةِ فَكَانُوا يَرَوْنَ دِلَالَةً، وَلٰكِنْ مَا كَانُوا يُمَيِّزُونَ الرُّكْنَ وَالشَّرْطَ مِنَ الآدَابِ وَالسُّنَنِ، وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ قَوْلٌ عِنْدَ تَعَارُضِ الأَخْبَارِ وَتَقَابُلِ الدَّلَائِلِ إِلَّا قَلِيلًا كَابْنِ عُمَرَ وَعَائِشَةَ وَزَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ۔ ان چار کے علاوہ دیگر صحابہ بھی حدیث کے مطلب کو ضرور سمجھتے تھے لیکن وہ ارکان، شروط، آداب اور سنن میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ جن روایات میں تعارض ہوتا یا متضاد دلائل پائے جاتے ان میں بہت کم گفتگو فرماتے تھے۔ جیسے ابن عمرؓ، عائشہؓ، زید بن ثابتؓ رضی اللہ عنہم۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ جو مسائل پیش آتے ان کے متعلق غور وفکر کئی کئی دن کرتے رہتے تا آنکہ وہ حل ہو جاتے۔ بہت سے مسائل باہمی مشورہ سے حل کر لیتے اس طریقہ کی ابتداء سیدنا ابوبکرؓ نے کی اور جناب فاروق اعظم نے اسے پروان چڑھایا۔

دوسرا دور: **زمانہ تابعین و مابعد میں:** اسلامی سلطنت کا پھیلاؤ جب ہوا تو درس وتدریس کی صورت میں علمی حلقے، جابجا قائم ہو گئے۔ صغار صحابہ ہوں یا کبار تابعین انہیں میں علماء کی ایک بڑی کھیپ تیار ہو گئی جن کی حیثیت علم و مرتبے اور تقویٰ واجتہاد میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ اٹھتے مسائل کے حل کے لئے علمی مکالمات ہوئے، تحریریں سامنے آئیں اور یوں ہر عالم کا اپنا اپنا علم واجتہاد ظاہر ہوا مگر یہ سب کچھ وسعت دینی کے لئے ہوا۔ شاہ ولی اللہ محدثؒ دہلوی فرماتے ہیں:

وَكَذٰلِكَ تَابِعُوهُمْ أَيْضًا يَرْجِعُونَ إِلَى الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ، فَإِنْ لَمْ يَجِدُوا نَظَرُوا مَا أَجْمَعَ عَلَيْهِ الصَّحَابَةُ، فَإِنْ لَمْ يَجِدُوا اجْتَهَدُوا، وَاخْتَارَ بَعْضُهُمْ قَوْلَ صَحَابِيٍّ فَرَآهُ الْأَقْوَى فِي دِيْنِ اللّٰهِ تَعَالَى۔
یہی تابعین کی حالت تھی وہ بھی فقہی مسائل میں کتاب وسنت کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اگر وہ کوئی مسئلہ کتاب وسنت میں نہ پاتے تو اس بات کو دیکھتے جس پر صحابہ کا اجماع ہے۔ اگر اجماع بھی نہ پاتے تو اپنے طور پر اجتہاد کرتے۔ بعض تابعین تو صحابی کے اس قول کو لے لیتے جسے وہ اللہ کے دین کے لئے قوی تر سمجھتے۔

ان کے بعد تیسری صدی ہجری کے آغاز سے اس کی انتہاء تک کچھ عالی مقام فقہاء امت کو نصیب ہوئے جنہوں نے اپنی فقہی بصیرت اور فہم کی بنیاد پر اسلامی فقہ کو ایک مستقل فن کی شکل دی اور علم مدون کیا جس کے لئے درج ذیل کوششیں ہوئیں:

① اصول بنے۔
② قرآن وسنت کی نصوص کو اصطلاحات کی شکل دی۔
③ اقوال صحابہ اور ان کے فتاوی سے مدد لی۔
④ جدید اصطلاحات کو متعارف کرایا۔
④ فروعات پر کام ہوا۔ تاکہ نئے مسائل پر وقت اجتہاد کار آمد فروعات سے مدد لی جاسکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان فقہاء کی فقہی حیثیت مسلمہ تھی۔ مگر مسائل کی جدّت، تنوع اور حالات کی تبدیلی کے پیش نظر ان فقہاء کے تلامذہ نے بھی اپنے اپنے دور میں اپنے پیش رو فقہاء کی اجتہادی آراء کے مقابلے میں اپنے اختلافی نوٹ لکھے۔ اور بیان کئے۔ اس فقہی توسع نے مسائل کی سبیل نکالی۔ اور بے جا سختی وتنگ نظری کو خیر باد کہا۔ جن فقہاء کا مزاج حدیث وسنت کی طرف زیادہ مائل رہا ان کا دیگر فقہاء کے نکتہ نظر سے اختلاف باقی رہا۔

قرون اولی میں علماء وفقہاء کا رجحان زیادہ تر نصوص ہی کی طرف رہا۔ عام مجتہدانہ کوششیں بھی براہ راست کتاب وسنت سے ماخوذ ہوتیں۔ اور عدالتی، معاشرتی، معاشی، خانگی معاملات کے فیصلہ جات انہی مذکورہ بالا اصولوں کے مطابق ہی ہوتے رہے۔ ان تمام مسائل پر شرعی دلائل کی روشنی میں غور ہوتا اور باہم اختلاف وغلطی کے امکان کے باوجود تمام اساتذہ، شاگرد، جج حضرات خوب غور وخوض کے بعد ایک دوسرے کی رائے کو قبول فرماتے اور یوں وقت کے مسائل کو حل کر لیا جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ اپنی رائے پر قائم رہتے لیکن حسن ظن اور دینی محبت کے تعلقات بدستور قائم رہتے۔ اور یوں قرآن وسنت کی فقہی بصیرت اس دور کے فقہاء کی کثیر تعداد کو حاصل رہی۔ یہ مجتہدانہ فکر

ان نیک، پاک باز ائمہ اجتہاد کے بعد مختصر عرصہ رہی جس کا اندازہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے چوتھی صدی ہجری کے آخر تک کا لگایا ہے۔

خیر القرون کے آخری دور میں غیر مسلموں کی فلسفیانہ کتب مسلم علماء کے ہاتھ لگیں۔ توان کے تراجم ظاہر ہونے کے بعد مسلم معاشرہ میں بہت سا فکری اختلاف در آیا۔ اجنبی نظریات اور غیروں سے اختلاط نے مسلم علماء کے رجحانات کو عقلی وفکری طور پر تقسیم کر دیا۔ اس طرح علماء وفقہاء کے درمیان شریعت سے مستفید ہونے کے دو نظریات دیکھنے میں آئے۔

① پہلا نظریہ یہ بنا کہ قرآن وسنت کے بیشتر مسائل عقل سے قریب تر ہیں۔ مزید استدلال کی گنجائش ان میں ہے۔ مگر اس گنجائش میں نصوص کو بدلا یا چھوڑا نہیں جا سکتا۔ نصوص کو بہر حال عقل پر ترجیح ہوگی۔ دوسرے معنوں میں استدلال کو نصوص کے تابع رکھا جائے گا۔ یہ لوگ اہل حدیث یا مدنی کہلائے جن کی کوشش یہ رہی کہ قرآن کریم کے ساتھ ساتھ صرف صحیح احادیث کو ہی فقہی مسائل کے استنباط کے لئے چنا جائے اور عمل کے لئے بھی انہی کا انتخاب کیا جائے تا کہ لوگوں کا جناب رسالت مآب ﷺ سے تعلق...... ایمان، محبت اور اطاعت میں صحیح انتخاب پر مبنی ہو۔ اور یوں مستقبل میں بھی در آمد فتنوں سے محفوظ رہیں۔ اس سلسلے میں ان کے ہاں یہ لچک بھی دیکھنے میں آئی کہ صحیح احادیث کی عدم موجودگی میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا اور اس سے استدلال کرنا قیاس یا ذاتی رائے کی نسبت احسن ہے۔

② جب کہ دوسرے نظریے کے قائل یہ کہتے کہ عقلی استدلال کی بہت گنجائش تو ہے مگر ایک صاحب رائے کی فہم و بصیرت کو نصوص کے فہم پر چھوڑا جا سکتا ہے وہ جو سمجھے اس کی اقتداء کی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ اس کی رائے ایک وقیع رائے بھی ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں کوئی فقیہ یا عالم، قرآن وسنت سے بھی استدلال لینا از بس ضروری سمجھتا تھا مگر قرآنی آیات سے استدلال کی صورت میں جو شواہد پیش کرتا یا تو وہ زیادہ تر عقلی ہوتے یا پھر ضعیف احادیث ہوا کرتی تھیں۔ یہ گروہ اہل الرائے یا کوفی کہلایا۔

یہ دور سوچ وفکر میں وسعت لئے ہوئے آیا تھا جس نے مجتہدین کے اجتہاد اوران کے مستنبط مسائل واصول پر نقد و نظر بھی کی اور مزید تحقیق بھی۔ جس نے معاشرہ کو بتایا کہ فقہ اسلامی اب بھی اس کے ہمراہ ہے۔

تیسرا دور: **دورِ جمود**: اس دوسرے نظریہ کو اتفاق کی بات ہے قبولیت عام ہوئی اور یوں جمود کے ایک ایسے دور کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے امت اسلامیہ آج تک سنبھل نہ سکی۔ اور پستی وپسماندگی اس کا مقدر بن گئی۔ تحقیق کو بتدریج معیوب سمجھا جانے لگا۔ احساس کمتری ایسا سمو دیا گیا کہ اجتہاد کا ملکہ پانا آسان نہیں بلکہ اس کے لئے جوکڑی

شرائط رکھی گئیں وہ کوئی غیر انسانی مخلوق کی صفات تو قرار دی جاسکتی ہیں انسانی نہیں۔سبق دیا گیا کہ موجودہ حالات میں اجتہاد کرنا ایک دشوار گزار کام ہے اس لئے اس کے دروازے اب بند ہیں۔

یہ ایک المیہ ہے کہ تحقیق کے دروازے بند کر کے مسلمانوں نے اپنے بہترین دماغ دوسروں کو دے دئیے۔وہ دینی علوم کی طرف رخ نہ کر سکے۔حتی کہ علماء دین کی اپنی اولاد بھی اس علم میں اپنے لئے کوئی کشش نہ پاسکی۔یوں ہماری اچھی نسل،خوبصورت دماغ دوسروں کے دست نگر ہو گئے۔ترقی وپستی صدیوں سے واضح نظر آنے کے باوجود ابھی تک ہمارا معیار یہ ہے کہ کیا نماز کے لئے لاؤڈ سپیکر کا استعمال جائز ہے؟ ٹی۔وی یا اس کے لئے تصاویر وفلم بنانا جائز ہے؟ کنویں میں اگر چوہا گر جائے تو کتنے ڈول نکالنا ہوں گے،تالاب میں اگر ناپاکی گر جائے تو اس کے پانی کو نجس قرار دینے کے لئے تالاب کا سائز اور تالاب کے پانی کی مقدار اتنی ہونی چاہئے وغیرہ۔بس یہی ہماری علمی وفقہی آماجگاہیں ہیں۔وہ فقہ جس پر ہمارے اسلاف نازاں تھے اسی کے بہی خواہوں نے چوتھی صدی ہجری میں دلائل تفصیلیہ سے استدلال لینا بتدریج روک دیا۔اپنی کم ہمتی،سستی،لاعلمی،کند ذہنی،اور علمی بے ذوقی کا ثبوت پیش کر دیا۔روشن دماغ جب دوسروں کے دست نگر ہوں تو ان کی دینی علوم سے نفرت اور دنیاوی علوم سے رغبت لازمی ہے۔اجتہاد کے دروازے بند ہونے کے درج ذیل عوامل تھے:

☆......وہ کتب جنہیں متون (Texts) وشروح (Exegies) کا درجہ دیا گیا انہی پر ہی اکتفاء کرتے ہوئے انہیں قبول کر لیا گیا۔

☆......اصل دلائل (قرآن وسنت) کی طرف توجہ بہت کم دی گئی۔

☆......جو اپنے اکابرین سے منقول تھا اسی پر اکتفاء کیا گیا۔

☆......استدلال واستنباط کی راہ ترک کر دی گئی۔اس کی بجائے اسلاف کی مستنبط فروع کو کافی سمجھا گیا۔

☆......کسی امام یا فقیہ نے کسی آیت یا حدیث کی جزوی تعبیر پیش کی تو اسے ہی شریعت سمجھ لیا گیا۔اور اسے ہی فقہ اسلامی کہا گیا۔جب کہ یہ شخصی فقہ ہے۔

☆......دلائل اصلیہ یعنی قرآن وسنت اور اجماع وقیاس سے مستفید ہونا صرف مجتہد کا وظیفہ قرار دیا گیا۔

☆......چند فقہاء کی رائے کو اجماع کا نام دے دیا گیا۔

یہ دور فقہ التقلید کا نام پا گیا۔اس لئے کہ فقاہت اب فروع کو سمجھنے،پڑھنے اور پڑھانے تک محدود ہو گئی۔

☆☆☆☆☆

فقہ اسلامی کے مصادر

تکمیل دین کے بعد یہ غالب امکان تھا کہ مستقبل میں نئے مسائل پیش آئیں گے۔اس لئے دین اسلام نے ایسے مسائل کا سامنا کرنے اور ان کا مناسب حل بتانے کے لئے کچھ بنیادیں فراہم کردیں تاکہ مسائل کے احکام کی طرف مکلف لوگوں کی راہ نمائی کی جاسکے اور ان کا حل ممکن ہوسکے۔ یہ بنیادیں تفصیلی دلائل کہلاتی ہیں۔ دلائل، دلیل کی جمع ہے جس سے مراد ایسی راہنمائی ہے جس سے عمل کا شرعی حکم معلوم ہوسکے۔خواہ یہ راہنمائی قطعی طور پر معلوم ہو یا ظنی طور پر۔ جو قطعی ہے وہاں عقل کی گنجائش نہیں اور جو ظنی ہے وہ عقل سلیم کے لئے اس صورت میں قابل قبول ہے جب وہ اس کے تقاضے پورا کرتی ہو۔ یہ تفصیلی دلائل دو قسم کے ہیں اصلی اور ذیلی۔

۱۔ **اصلی**:(Original Sources) سے مراد قرآن وسنت کے مآخذ ہیں۔تمام ائمہ مجتہدین کا اس پر اتفاق ہے کہ شرعی احکام کے اصل مآخذ یہی دو ہیں۔ جن کے احکام کی پیروی کرنا لازمی ہے۔ ایسے احکام کو تعبدی (قابل عبادت وثواب) کہتے ہیں۔ان دونوں کا مصدر چونکہ وحی ہے اس لئے انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی یہ کسی صورت میں قابل تغیر ہیں۔

۲۔ **ذیلی**(Secondary Sources): یہ وہ مصادر ہیں جن کا درجہ وحی کا نہیں مگر اس کی تائید ضرور کرتے ہیں۔اور اصلی مآخذ کے تابع ہیں۔اس بناء پر ان کی حیثیت تسلیم کی گئی ہے۔ یہ ذیلی مصادر اور ان کی اصطلاحات دراصل فقہاء کرام کا ابتکار ہیں جو انہوں نے اپنے اپنے ذوق اور فہم کے مطابق متعارف کروادیں۔ان میں بعض فقہاء بعض مصادر کو تسلیم ہی نہیں کرتے مگر ان کی غالب اکثریت(Majority) اجماع اور قیاس کی مصدری حیثیت کو مانتی ہے۔ان میں: اجماع (Consensus) قیاس(Anology) استحسان (Juristic Preference) استصحاب (Presumption of continuity) اقوال صحابہ اور ہم سے ماقبل کی شریعت وغیرہ ہیں۔یادرکھئے ان ذیلی مآخذ کی(validity) اور حیثیت کا تعین اور ان سے احکام کا استخراج(Deduction) بھی قرآن وسنت سے یا ان کے مقاصد سے ٹکراؤ یا عدم ٹکراؤ کی بنیاد پر ہوگا۔مثلاً: اگر کوئی یہ کہے کہ حالات اور زمانہ کی تبدیلی سے حدود کے احکام بھی بدلے جاسکتے ہیں مثلاً سیدنا عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹا تھا۔لہٰذا ہمیں آج بھی حالات اور واقعات کا ادراک کرکے چور کے ہاتھ نہیں کاٹنے چاہئیں۔ یہ غلط قیاس ہوگا اور شریعت کے مقاصد سے ٹکراؤ بھی۔ جب کہ حقیقت حال یہ ہے کہ سیدنا عمرؓ کے دور میں یہ چوری زمانہ قحط میں ہوئی تھی اور محض اپنی یا بچوں کی بھوک

مارنے کے لئے کی گئی تھی۔خلیفہ راشد نے حد کی سزا کو، حدیث رسول کے مطابق اِدْرَؤُا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ شرعی حدود کو شبہات کی بنا پر نافذ نہ کرو۔ یہ ذمہ داری لیتے ہوئے ساقط کر دی تھی کہ بے سہارا لوگوں کی معاشی حالت کو سنوارنا حکومت کا فرض ہے جو ہم نہیں کر سکے۔ اس لئے شبہ کا فائدہ ملزم کو جانا چاہیے۔ کیونکہ گناہ گار کا سزا سے بچ جانا اتنا معیوب نہیں جتنا بے گناہ کا سزا پانا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ شبہ نہیں بلکہ یقین تھا۔ نیز یہ قصور حکومت کا تھا نہ کہ چور کا۔ جس نے لوگوں کو سوشل سیکیورٹی فراہم نہیں کی۔ ہاں سیکیورٹی کی فراہمی کے بعد پھر کوئی چوری کا ارتکاب کرے تو یہ حد کبھی اور کسی صورت میں معاف نہیں ہو سکتی۔ ذیل میں ہم ان مصادر کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں:

پہلا مصدر:

قرآن وسنت

یہی شریعت کے اصل مصادر ہیں۔ اولین مأخذ اور شریعت کا اصل الاصول تو قرآن کریم ہے۔ دونوں کو اکٹھا اس لئے لکھا ہے کہ یہ دونوں وحی ہیں۔ دوش بدوش ہیں۔ باہم جڑے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں انہیں جدا نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں مل کر شریعت بنتے ہیں جن میں عقائد، عبادات اور حقوق کا اجمال بھی ہے اور تفصیل بھی۔ یوں یہ دونوں شریعت کا مصدر اصلی بنتے ہیں۔ بلکہ علماء اہل سنت کے نزدیک لفظ سنت بھی قرآن وسنت کے لئے مستعمل ہوا ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ جیسی اصطلاح میں بھی یہی سوچ کارفرما ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم لوح محفوظ سے قوی وامین فرشتہ جبریل علیہ السلام کے ذریعے رسول خاتم النبیین ﷺ کے قلب اطہر پر بحفاظت نازل ہوا۔ آپ ﷺ اسے کلام اللہ تسلیم کرتے ہوئے اس پر ایمان لائے اور امت کو بھی اس پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ جس نے ارشاد مانا اس نے کلام اللہ کو مانا اور آپ ﷺ کے الفاظ وکلمات کو شریعت گردانا۔

اگر آپ ﷺ کے اس ارشاد میں ذرہ برابر شک کیا جائے تو سارا قرآن اسی طرح مشکوک ہو جاتا ہے جس طرح اس کے کسی لفظ یا آیت میں کمی یا زیادتی کو تسلیم کرنے سے مشکوک ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات اللہ کے اس وعدے کے خلاف ہے۔ معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ اپنے کلام کی حفاظت نہ کر سکا۔

اجماعاً یہ بھی تسلیم کیا گیا کہ اس نقطہ نظر کا حامل ہی اہل السنۃ والجماعۃ سے ہے کیونکہ حضرات صحابہ کا یہی نظریہ تھا۔ مگر جو اس فکر ومنہج سے علیحدہ رہا وہ خارج از اہل السنۃ کہلایا۔ جنہیں ان کے زیغی وانحرافی خیالات کی وجہ سے حسب فکر نام

دیا گیا۔

قرآن کریم: لغت میں اس کا مطلب ہے اکٹھا کرنا اور جمع کرنا۔ قِرَاءَ ةُ الْکَلِمَةِ: جب حروف کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا جائے اور اکٹھا کر دیا جائے۔ پھر یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی کتاب، القرآن پر لاگو ہو گیا اور علم بن گیا۔

اصطلاحاً کلام اللہ ہے غیر مخلوق ہے۔ اسے مخلوق کہنا ہی کفر وضلالت ہے اور دین میں الحاد کی بات کرنا ہے۔ نیز جو کتاب عزیز میں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اس کو بھی جھٹلانا ہے۔ مثلاً: ﴿إنا أنزلنه فی لیلة القدر﴾ (القدر: ۱) یا ﴿تبارک الذی نزل الفرقان علی عبده لیکون للعالمین نذیرا﴾ (الفرقان: ۱) یا ﴿وقرآنا فرقنه لتقرأه علی الناس علی مکث ونزلنه تنزیلا﴾ (الإسراء: ۱۰۶) یہ معجز ہے۔ آپ ﷺ پر بذریعہ جبریل امین نازل ہوا ہے۔ اور ہم تک تواتر سے منقول ہوا ہے مصاحف میں لکھا ہوا ہے جس کی تلاوت عبادت ہے اور سورہ فاتحہ سے شروع ہو کر سورہ الناس تک ختم ہوتا ہے۔ فرشتے یا انسان کا کلام اس میں شامل نہیں۔ حدیث قدسی بھی اس سے خارج ہے۔ توراۃ وانجیل یا زبور وصحف ابراہیم وموسیٰ آپ ﷺ پر نازل نہیں ہوئے اس لئے وہ بھی اس میں شامل نہیں۔ اور قرأت شاذہ بھی۔

اسے بتدریج حالات وضرورت کے مطابق نازل کیا گیا۔ اس لئے اس میں کچھ مکی، کچھ مدنی اور کچھ سفری اور کچھ حضری آیات ہیں۔ کبھی مکمل سورت نازل ہوئی تو کبھی سورت کا کچھ حصہ۔ بعد والا وحی شدہ حصہ جبریل علیہ السلام کی راہنمائی سے ہر مناسب مقام پر سدھار دیا جاتا۔

قرآن کریم اور شرعی احکام: قرآن مجید میں احکام حلال وحرام کی وضاحت کے لئے کچھ اصول موجود ہیں۔ یہ مجمل احکام مقاصد شریعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مجموعہ فتاوی (۱۰/۱۲۷) میں ایک بہت ہی جامع ونافع فصل میں لکھا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں شرعی احکام جن الفاظ کے ساتھ مذکور ہیں وہ تین قسم کے ہیں:

۱۔ وہ الفاظ جو صرف لغت سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ارض، سماء، شجر، حجر، شمس وقمر، بر و بحر وغیرہ۔ اس لئے لغت ہی ان کا معنی متعین کرے گی۔ مثلاً شَجر کی تعریف کیا ہے؟ سَمَاء کس مادہ سے بنا ہے؟ عَین سے کیوں نظر آتا ہے وغیرہ۔ مگر تعلیم کتاب اور اس کی صحیح ترجمانی کے لئے الفاظ کے موقع ومحل کو ضرور سمجھنا ہوگا۔ مثلاً: آزِفَة، ظُلْم، تَوَفّی، یُوْلِجُ یا وِزْر جیسے الفاظ۔ شریعت یہ آگاہی بھی دیتی ہے کہ اگر کوئی پتھر مار کر کسی کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر نقصان

کی تلافی لازمی ہے۔نامحرم عورت پر نگاہ بد ڈالے تو گناہ ہے وغیرہ۔

۲۔بعض وہ الفاظ ہیں جن کا تعلق نہ لغت سے ہے اور نہ شریعت سے۔ بلکہ عرف یا خاندانی عادات سے ہے۔ عادات میں تنوع بھی ہوتا ہے یعنی کسی بھی سوسائٹی یا خاندان و برادری میں وہ ایک جانی بوجھی چیز ہوتی ہے مثلاً نکاح، طلاق، بیع، ھبہ، قبض، وقف، درہم و دینار، امارت، خلافت وغیرہ۔شریعت صرف ان الفاظ سے متعلق احکام کو تو بیان کرتی ہے مگر نکاح، طلاق وغیرہ کیا ہیں یہ بتانا عرف کا کام ہے۔شریعت ان کی تعریف متعین نہیں کرتی۔اور نہ ہی سب اہل زبان ان کی ایک ہی تعریف پر متفق ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کی مقدار اور صفت بھی اختلاف عادات کی وجہ سے مختلف ہوتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ شریعت، غیر مسلموں کے ان سب نکاحوں کو جائز سمجھتی ہے جو ان کے عرف کے مطابق ہوں۔ان کے ہر لین دین کو جائز سمجھتی ہے جو ان کے عرف کے مطابق ہوں۔ان عرفی اصطلاحات کا تعین کرنا شریعت کا کام نہیں۔

۳۔تیسرے وہ الفاظ ہیں جو شریعت کی اپنی اصطلاحات ہیں مثلاً اطاعت، اتباع، صلوٰۃ، زکوۃ، حج، صوم، طواف وغیرہ۔ان الفاظ کے معانی کا تعین کرنا اور ان الفاظ کی وضاحت کرنا صرف شریعت کے دائرہ اختیار میں ہے نہ کہ لغت یا عرف کے۔اس قسم کو اللہ اور اس کے رسول نے بیان کر دیا ہے۔لہٰذا کسی کے لئے مناسب نہیں کہ وہ ان متعین اصطلاحات کی تعریف لغت کی کتب سے تلاش کرے یا اس میں کچھ اضافہ کر دے اس لئے کہ آپ ﷺ نے ان اصطلاحات کا جو حکم تھا اسی کے مطابق مراد لی۔مثلاً لفظ خمر ہے۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ۔ قرآن کی مراد کو آپ ﷺ نے سمجھا اور فرمادیا۔عرب اس سے مراد خواہ ہر نشہ آور شراب کو سمجھتے یا صرف انگور کی شراب کو۔اسے اب جاننے کی ضرورت نہیں۔اور اہل مدینہ کے ہاں خمر صرف خشک کھجور کی نبیذ کو کہا کرتے۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کو شرعی احکام۔۔امر و نہی اور حلال و حرام۔۔۔کے ساتھ جوڑ دیا ہے تاکہ کوئی بھی انہیں کسی اور چیز کے ساتھ۔۔۔بغیر اللہ و رسول کے مفاہیم کے۔۔۔مقید کر کے اپنے اپنے مفاہیم نہ بنالے۔اسی طرح لفظ ماء ہے۔قرآن وسنت میں یہ لفظ مطلق مستعمل ہوا ہے اور آپ نے اسے طاہر و غیر طاہر میں تقسیم نہیں فرمایا۔اسی طرح قصر و فطر کے الفاظ ہیں جنہیں آپ ﷺ نے سفر سے جوڑا ہے مگر اس کی مسافت کا تعین نہیں فرمایا۔اور نہ ہی طویل و مختصر سفر کے مابین فرق کیا ہے اگر سفر کی متعین مسافت ہوتی تو اسے اللہ و رسول ضرور بیان کرتے۔نہ ہی لغت میں اس کی متعین وضاحت بتائی گئی ہے۔جسے اہل لغت سفر کہتے ہیں اس میں قصر و فطر کتاب وسنت کی رو سے جائز

ہوگا۔ جیسے اہل مکہ نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ عرفات تک جا کر قصر کیا جبکہ یہ مکہ سے ایک برید (بارہ میل) کے فاصلے پر ہے۔ اس لئے سفر کی تحدید ایک دن یا تین دن سے کرنا شرعی نہیں بلکہ لغوی وقیاسی ہے۔

ان تینوں اقسام کی پہچان ومراتب کے بغیر یہ امکان ہے کہ War of Terminology سے متأثر کوئی بزرگ شرعی اصطلاحات کو لغت کی کتابوں سے اور لغت کو شریعت سے اور عرف کو لغت یا شریعت سے تلاش کرتا پھرے۔ ظاہر ہے یہ غلط تعبیر وتشریح ہے اور گمراہی کا سبب بھی۔ مثلاً: لفظ خلافت ایک سیاسی اور عرفی اصطلاح ہے نہ کہ شرعی۔ سیدنا داؤد وسلیمان علیہما السلام بادشاہ بھی تھے اور خلیفہ بھی۔ مگر ہمارے پیارے رسول ﷺ نے ان دونوں میں سے کوئی لفظ اپنے لئے استعمال نہیں فرمایا۔ جناب صدیق اکبرؓ خلیفہ رسول کہلوائے اور سیدنا عمر فاروقؓ کچھ عرصہ اپنے آپ کو خلیفہ کہلوانے کے بعد امیر المومنین کی اصطلاح زیادہ پسند فرمانے لگے۔ اگر یہ لفظ شرعی ہوتے تو انہیں کوئی بھی تبدیل نہ کرتا۔ اس لئے بادشاہ، یا خلیفہ جیسے لفظ قرآن مجید میں آنے سے شرعی نہیں بن گئے ہاں ان کے ساتھ شرعی احکام ضرور وابستہ ہیں۔ حیثیت ان کی ہے نہ کہ لفظ بادشاہ، وزیر اعظم، صدر، چیف ایگزیکٹو یا امیر وخلیفہ جیسے دوسرے الفاظ کی۔

ان الفاظ کی صحیح تعبیر کے لئے ائمہ ومجتہدین کے ہاتھ میں قرآن وسنت کا چراغ دے دیا گیا کہ وہ ان کی روشنی سے زمان ومکان میں ہونے والے نت نئے واقعات کی جزئیات تک کا حکم بتائیں۔ یہی تو وہ راز ہے جس سے امہ کو دوام ملا ہے۔ یہ ثبوت ہے کہ شریعت کے اصول انتہائی جامع (comprehensive) ہیں۔ نیز جہاں کہیں اختلاف اور جدال کا اندیشہ تھا وہاں قرآن مجید نے بعض ضروری تفاصیل دے دیں تا کہ اختلاف باقی نہ رہے۔ مثال کے طور پر عقائد وعبادات کے اصول، یا پھر ایسے اسباب کی بنیاد رکھ دی جس میں ان اصولوں میں اختلاف نہ ہونے پائے اور نہ ہی زمان ومکان کی تبدیلی سے یہ تبدیل ہوں مثلاً میراث کے مسائل، محرمات ابدیہ کا ذکر اور بعض جرائم کی سزا وغیرہ۔

قرآن کریم کو اسلامی قانون میں تقریباً ویسی ہی حیثیت حاصل ہے جو ملکی قوانین میں دستور کو حاصل ہوتی ہے۔

وہ احکام جن کا تعلق انسانی اعمال سے ہے مثلاً: نماز، روزہ، حج اور زکوۃ، خرید وفروخت یا معاملات حدود، جرائم اور خاندانی امور سے متعلق۔۔۔ بقول امام ابن العربی اور امام غزالی رحمہم اللہ۔۔ پانچ سو آیات ہیں اور دو ہزار آیات اوامر ونواہی (Do's&Don't) پر مشتمل ہیں یہ سب فقہ اسلامی کی بنیاد ہیں۔ انہیں احکام شریعت کہا جاتا ہے۔ (ارشاد

الغول:٥٦٦)۔ورنہ عقائد کے باب میں تو قرآن سارا بھرا ہوا ہے۔

قانون الأسرۃ یعنی فیملی لاز کے بارے میں ستر آیات ہیں اور معاملات مالیہ یعنی سوشل لاء کی بھی اتنی۔عدالتی نظام کے لئے تیرہ آیات ہیں جسے عربی میں قانون مرافعات بھی کہتے ہیں۔جرائم وسزا جیسے فوجداری قانون کے بارے میں تیس آیات ہیں۔حکومت اور رعایا کے بارے میں دستور دینے والی دس آیات اور بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں پچیس آیات ہیں۔اسی طرح مالی احکام کے بارے میں دس آیات قرآن کریم میں موجود ہیں۔

سنت: ہر وہ قول، فعل یا تقریر جس کی نسبت آپ ﷺ سے صحیح یا حسن حدیث سے منسوب ہو۔وحی خفی سے اس سنت کا تعلق ہے جو اولین مأخذ کا ساتھی ہونے کی وجہ سے حجت ہے کیونکہ اس میں قرآن کے اجمال کی تفصیل اور اشکال کی توضیح ہے۔عقلاً بھی اسے محدثین کے اصول تحقیق وتنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد قبول کرنا چاہئے ورنہ اسے رد کردینا چاہئے۔کتب سنن، مصنفات، موطآت، عمدۃ الاحکام اور بلوغ المرام اپنی شروح سمیت اس کی دلیل ہیں۔مزید صحیحین کا علم بھی موضوع سنت کو سمجھنے میں خاصا وقیع ہے۔سنت میں تین ہزار احادیث، احادیث احکام (Legal) ہیں اور ڈھائی ہزار احادیث اوامر ونواہی پر مشتمل ہیں۔ابن العربیؒ نے ان کی تعداد تین ہزار لکھی ہے۔خبر متواتر اس میں نادر ہیں اور خبر واحد ہی اس کی اصل ہیں۔ان سے نہ صرف عقائد ثابت ہوتے ہیں بلکہ احکام خمسہ بھی جو صحابہ وعلماء امت نے خبر واحد سے اخذ کئے۔اصولی احادیث احکام بارہ سو ہیں۔

سنت رسول ﷺ قرآن کی طرح فقہ اسلامی کا ایک اور مصدر ہے۔اس لئے اس کے متعدد معانی علماء نے مراد لئے ہیں۔

۱۔مکمل دین: قرآن مجید میں ہے: ﴿ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا﴾۔جو اللہ کا رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے روکے اس سے باز رہو۔(الحشر: ۷) رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ دینا ہے وہ دین ہے ۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے: مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي۔جس نے میری سنت سے منہ موڑا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔اس حدیث میں لفظ سنت سے مراد سارا دین ہے یعنی Way of Life۔

۲۔صحیح عقیدہ: امام سفیان ثوری فرماتے ہیں: السُّنَّةُ سُنَّتَانِ۔سنت دو ہیں۔

أ۔اسے چھوڑنا حرام نہ ہوگا۔جو واجب کے برعکس ہے مثلاً فقہاء کی اصطلاح میں سنت سے مراد وہ نفلی کام اور عبادات ہیں جو رسول اکرم ﷺ سے منقول ہوں یعنی وہ جو فرض نہ ہوں بلکہ مندوب ہوں۔جیسے عشاء کے فرضوں

کے بعد دو رکعت سنت۔ فقہاء کرام نے ایسی سنت کی دو اقسام بیان کی ہیں۔ سنت مؤکدہ اور سنت غیر مؤکدہ۔

ب۔ اس کا چھوڑنا کفر ہوگا۔ اس سے مراد وہ صحیح عقیدہ ہے جس پر صحابہ کرام کی جماعت تھی۔ بہت سے علماء نے السنۃ کے نام سے عقیدہ کے موضوع پر کتب لکھیں۔ جیسے: کتاب السنۃ از ابی بکر الخلال از ابن عاصم اور از امام احمد بن حنبل یا شرح السنۃ از شیخ بربہاری رحمہم اللہ۔ اسی لئے علماء عقیدہ نے سنت کا لفظ بدعت کے مقابلے میں بھی استعمال کیا ہے مثلاً وہ یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص سنت پر ہے یعنی اس کا عمل رسول اکرم ﷺ کے عمل کے مطابق ہے یا یہ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص بدعت پر ہے یعنی اس کا عمل آپ ﷺ کے عمل کے خلاف ہے۔ یا طلاق سنت اور طلاق بدعت کے الفاظ۔

۳۔ لفظ سنت، خوارج کی فکر کے مقابلہ میں بھی مستعمل ہوا۔ اور ان Intellectuals عقل پرستوں کے خلاف بھی جو سنت کے تارک اور بدعمل تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو ماڈرن مسلم کہا۔ یہ نام انہوں نے اس لئے Hijack کیا تاکہ وہ سمارٹ بن کر سنت رسول کی مخالفت کرنے والوں کی تائید کریں اور جو سنت کا مخالف ہے اسے یہ کہہ سکیں کہ وہ ماڈرن مسلم ہے۔

۴۔ اس لفظ کی نسبت اگر کسی انسان کی طرف ہو تو اس سے مراد وہ طریقہ وعمل ہیں جو اس سے صادر ہوتے ہوں اور وہ انہیں لازم سمجھتا ہو اور ان پر اس کی مداومت ہو۔ خواہ یہ اعمال ایسے ہوں جن کی وجہ سے اس کی تعریف کی جاتی ہے یا ان سے ہو جن کی وجہ سے اس کی مذمت کی جاتی ہے۔ اہل لغت سنت کا یہ معنی لیتے ہیں۔

۵۔ سنت سے مراد رسول اکرم ﷺ کا قول، فعل اور سکوت ہے اس اعتبار سے سنت، علماء اصول کے ہاں احکام شرعی کا ایک مأخذ ہے۔ جیسے امام شافعی رحمہ اللہ نے بغداد چھوڑتے وقت امام احمد رحمہ اللہ کو یوں خراج تحسین پیش کیا: إِمَامٌ فِي الْقُرْآنِ، وَالْحَدِيثِ، وَالسُّنَّةِ، وَالْفِقْهِ، وَإِمَامٌ فِي اللُّغَةِ، إِمَامٌ فِي الْفَقْرِ وَالْوَرَعِ۔

۶۔ یہ لفظ جب قرآن کے ساتھ مستعمل ہو تو پھر اس سے مراد حدیث رسول ہوا کرتی ہے۔ حدیث سے جب کسی مسئلے کا علم ہوتا ہے تو اسے سنت کہہ دیتے ہیں۔

۷۔ سنت سے مراد فرد واحد کا یا چند افراد کا وہ طریقہ بھی لیا جاتا ہے جو انہوں نے ذاتی فہم یا ذوق کی بناء پر اختیار کیا ہوا ہو۔ اس معنی میں مجتہد خلفاء راشدین کا اجتہاد بھی ایک سنت کہلاتا ہے جو انہوں نے کسی آیت یا حدیث رسول یا حالات کو دیکھ سمجھ کر کیا ہوتا ہے۔ مثلاً: سنت خلفاء راشدین یا فلاں خلیفہ کی سنت، جیسے الفاظ جو کتب میں مل جاتے

ہیں۔ظاہر ہے یہ لفظ اور سنت رسول ایک معنی نہیں رکھتے۔ایسا نہیں ہوسکتا کہ سیدنا ابوبکرؓ کا اجتہادی قول وفعل، رسول اللہ ﷺ کی سنت کے برابر درجہ رکھتا ہو یا کسی بھی خلیفہ راشد کے اجتہادی قول کی اہمیت سنت رسول کے برابر ہو۔ اس بناء پر خلفاء راشدین کی سنت سے مراد، وہ طریقہ جس پر رسول اللہ ﷺ چلے اور ان خلفاء نے بھی اس پر چلنے کی کوشش کی۔اس سے مراد اسلاف کے جزوی اقوال اور فتاوی نہیں۔

۸۔لفظ سنت، احکام خمسہ میں بمعنی مندوب، مستحب یا مسنون استعمال ہوتا ہے جو فرض کے مقابلہ میں ہے۔

سنت کی اہمیت: رسول اکرم ﷺ کو قرآن وسنت دونوں اکٹھے دیئے گئے تھے۔جسے صراط مستقیم کہا گیا ہے۔اس لئے قرآن وسنت کی راہ ایک ہی ہے کیونکہ دونوں کا مصدر وحی ہے۔وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید اکیلا اپنے احکام کو واضح نہیں کرسکتا جب تک اس کے ساتھ سنت کا بیان نہ ہو۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے بارے میں خود ارشاد فرمایا:

﴿وما ينطق عن الهوى، إن هو إلا وحي يوحى﴾۔(النجم:۳،۴) اور یہ رسول اپنی طرف سے بات نہیں کیا کرتا جو کہتا ہے وہ وحی ہوتی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔

اس لئے دونوں متحد ہوکر ایک اصل یعنی نص بن جاتے ہیں۔شرعی احکام کی توضیح میں یہ دونوں ایک دوسرے کے معاون ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿واذكرن ما يتلى في بيوتكن من آيات الله والحكمة﴾.(الأحزاب:۳۴) اللہ کی آیات اور حکمت میں سے جو کچھ بھی تمہارے گھروں میں تلاوت کیا جاتا ہے اسے یاد رکھو۔

۹۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے:﴿ ويعلمهم الكتاب والحكمة﴾۔(الجمعۃ:۲) اور وہ رسول انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔امام شافعی، یحییٰ بن کثیر اور امام قتادۃ رحمہم اللہ کا کہنا ہے: ان آیات میں حکمت سے مراد سنت ہے۔کیونکہ جو چیز بیت رسول میں پڑھی جارہی ہے وہ یا تو قرآن ہے یا سنت۔اور رسول اللہ ﷺ کتاب کے علاوہ جو سکھارہے ہیں وہ سنت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔(الرسالہ:۷۸)

۱۰۔فقہ اسلامی میں سنت کا مقام اجماع وقیاس سے کہیں بڑھ کر ہے۔جہاں سنت ہو وہ اجماع کی ضرورت ہی نہیں۔یہی حال قیاس کا ہے۔

☆ ......**سنت**: اس کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے ہیں مگر معنی رسول اللہ ﷺ نے پہنائے ہیں یہ بھی منزل من اللہ

ہیں۔اس لئے کہ سنت بھی آپ ﷺ پر اسی طرح نازل ہوا کرتی جس طرح آپ ﷺ پر قرآن نازل ہوا کرتا۔ قرآن کریم میں یہی تو فرمایا گیا: ﴿من یطع الرسول فقد أطاع الله﴾۔جو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرے گا وہ گویا اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔اس لئے قرآن کریم میں وارد الفاظ اتباع، اطاعت، ہدایت وراہنمائی، صراط مستقیم کی دریافت میں رسول اکرم ﷺ کو پیش کیا گیا ہے۔آپ ﷺ ہی ہادی ورہنما ہیں۔آپ ﷺ ہی صراط مستقیم پر ہیں اور آپ ﷺ ہی صراط مستقیم دکھاتے ہیں۔آپ ﷺ ہی کی اطاعت واتباع کرنا ہے۔آپ ﷺ ہی کا اسوہ حسنہ قابل رشک وقابل اتباع ہے۔وغیرہ۔اللہ تعالیٰ نے اس شریعت کا افہام واستفہام رسول اللہ ﷺ کے ساتھ منسلک کردیا اور ہر مقام پر آپ ﷺ ہی کو پیش کیا ہے تاکہ کسی اور کو یہ مقام نہ دیا جاسکے اور نہ ہی کوئی اسے پانے یا دلوانے کی کوشش کرے۔لہٰذا شارع بھی آپ ﷺ ہیں۔اور مفسر قرآن بھی آپ ﷺ۔اس لئے قرآن اور سنت رسول اپنے نزول سے تا قیامت انسانوں کے لئے قطعی حجت ہے۔

مصدر اصلی کی حیثیت سے قرآن مجید کے متعدد مقامات مجمل ہیں مثلاً: نماز، بیع، ربا، زکوۃ وغیرہ کا حکم اجمالی ملتا ہے مگر ان کی تفصیلات سنت رسول میں مذکور ہیں۔بعض اوامر ونواہی صراحت سے اتباع کا مطالبہ جہاں رسول اللہ ﷺ سے کر رہے ہیں وہاں ساری امت کو بھی ان کی اتباع کا مطالبہ ہے: مثلاً:

﴿آمن الرسول بما أنزل إلیه والمؤمنون﴾۔رسول کی طرف جو کچھ نازل کیا گیا وہ اس پر ایمان لایا اور اہل ایمان بھی۔(البقرۃ:۲۸۵)

﴿اتبع ما یوحی إلیک ولا تتبع أهوائهم﴾۔آپ کی طرف جو وحی کی جاتی ہے آپ اسی کی پیروی کیجئے اور ان کی خواہشات کے پیچھے مت جایئے۔

﴿اتبعوا ما أنزل إلیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونه أولیاء﴾ (الأعراف:۳) تم پیروی کرتے رہو اس کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور کو دوست بنا کر پیروی مت کرو۔

ان قوانین کا احترام اور تسلیم ورضا کے علاوہ کسی بھی قسم کے تجاوز سے بھی منع کرتے ہوئے فرمایا:

﴿تلک حدود الله فلا تعتدوها ومن یتعد حدود الله فأولئک هم الظلمون﴾ (البقرۃ: ۲۲۹) یہ اللہ کی حدود ہیں تو ان سے تجاوز نہ کرو جو بھی ان حدود سے تجاوز کرے گا وہی ظالم ہوں گے۔

کیا اس کے حکم میں کوئی اور شریک ہوسکتا ہے یا کسی اور کو یہ مقام دیا جاسکتا ہے؟ اس کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا:

﴿ولا یشرک فی حکمه أحداً﴾ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

فقہ اسلامی میں سنت کا مقام: دین کے صحیح فہم کے لئے شریعت کا یہ اولین مطالبہ ہے کہ سنت رسول پر اس اعتبار سے ایمان اور محبت رکھے کہ یہی میرے لئے سچ رول ماڈل ہے جس سے مجھے دل و جان سے بڑھ کر محبت ہے اور ہر قیادت وسیادت سے بڑھ کر قابل اطاعت ہے۔ اس لئے ہر مسلمان آپ ﷺ کی تعلیمات سے واقف ہو اور اسی پر ہی جان چھڑکے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تشریعی اختیارات تا ابد عطا کئے۔ اس لئے آپ کے اوامر ونواہی دراصل اللہ تعالیٰ ہی کے اوامر ونواہی کہلاتے ہیں جن کی حقیقت درج ذیل آیات میں واضح کی گئی ہے۔ مثلاً:

☆...... **ہر صورت میں آپ ﷺ کی اطاعت:** قرآن کریم نے اس کا اہل ایمان کو حکم دیا۔ فرمایا:

﴿ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا واتقوا اللہ﴾. (الحشر: ۷) جو اللہ کا رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے تمہیں روکیں اس سے باز رہو اور اللہ کی نافرمانی سے بچو۔

☆...... **اسی طرح عدم اطاعت کی صورت میں یہ بھی فرمادیا:**

﴿قل أطیعوا اللہ و الرسول فإن تولوا فإن اللہ لا یحب الکافرین﴾ (آل عمران: ۳۲)

آپ کہئے اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ منہ موڑیں تو بلاشبہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

☆...... **اطاعت رسول کا درجہ اطاعت الٰہی کا درجہ ہے** آپ ﷺ کی اطاعت کے بغیر اطاعت الٰہی کا تصور ہی موجود نہیں۔

﴿من یطع الرسول فقد أطاع اللہ﴾ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے گویا اللہ کی اطاعت کی۔

☆...... **آپ ﷺ کی غیر مشروط اطاعت کا مظاہرہ** جب صحابہ کرام نے بیعت الرضوان میں کیا تو قرآن کریم نے ہی کہا:

﴿لقد رضی اللہ عن المؤمنین إذ یبایعونک تحت الشجرۃ..﴾ یقیناً اللہ تعالیٰ ان مومنوں سے راضی اور خوش ہوگیا جب وہ آپ سے درخت تلے بیعت کر رہے تھے۔ (الفتح: ۱۸)

☆...... **قرآن کریم نے آپ ﷺ کے حکم وفیصلے کی مخالفت کرنے سے ہمیں ڈرایا اور فرمایا:**

﴿فلیحذر الذین یخالفون عن أمرہ أن تصیبھم فتنۃ أو یصیبھم عذاب ألیم﴾: (النور: ۶۳)

جو اللہ کے رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہئے کہ کہیں انہیں کوئی آزمائش نہ گھیر لے یا ان کے پاس کوئی

دردناک عذاب نہ آ جائے۔

☆......آپ ﷺ کے حکم کے آگے ہماری پسند وناپسند کو ختم کر دیا اور فرمایا:

﴿ وما كان لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضى الله ورسوله أمرا أن يكون لهم الخيرة من أمرهم.. ﴾. (الأحزاب:۳۶) کسی مومن اور نہ کسی مومنہ کے لئے یہ مناسب ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو ان کے پاس اپنے معاملے کا کوئی اختیار ہو۔

☆......ان تمام احکامات کو ایمانیات قرار دیا اور فرمایا:

﴿فلا وربک لا يؤمنون حتى يحكموک فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في أنفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما﴾ (النساء: ۶۵) تمہارے رب کی قسم! لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ اپنے اختلافات میں آپ ﷺ کو حکم نہ مان لیں پھر آپ کے اس فیصلے کے بارے میں اپنے دل میں کوئی تنگی نہ پائیں اور کلی طور پر اپنے آپ کو جھکا دیں۔

☆......آپ ﷺ کی محبت واطاعت ہر عزیز ترین رشتے سے بھی بڑھ کر کرنے کی متقاضی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

لَا يُؤمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔ تم میں کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں۔ (متفق علیہ)

آپ ﷺ ہی ارشاد فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَو بَدَا لَكُمْ مُوسٰى فَاتَّبَعْتُمُوهُ وَتَرَكْتُمُونِيْ لَضَلَلْتُم عَنْ سَوَاءِ السَّبِيْلِ، وَلَوْ كَانَ حَيًّا وَأَدْرَكَ نُبُوَّتِي لَاتَّبَعَنِيْ۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر موسیٰ علیہ السلام بھی تم میں تشریف لے آئیں پھر تم ان کی اتباع کرنا شروع کر دو اور مجھے چھوڑ دو تو تم سیدھی راہ سے بلاشبہ بھٹک جاؤ گے۔ اور اگر موسیٰ علیہ السلام آج زندہ ہوں اور میری نبوت کو وہ پائیں تو وہ بھی ضرور میری اتباع کریں۔ (مقدمہ دارمی:۴۳۵)

☆......آپ ﷺ نے بغیر حدیث وسنت کے قرآن مجید سے شرعی مسائل معلوم کرنا ناممکن فرمایا:

لَا أُلْفِيَنَّ أَحَدَكُمْ مُتَّكِئًا عَلٰى أَرِيكَتِهِ يَأتِيهِ الأَمْرُ مِمَّا أَمَرْتُ بِهِ أَو نَهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُولُ: بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْقُرآنُ فَمَا وَجَدْنَا فِيهِ مِنْ حَلَالٍ اسْتَحْلَلْنَاهُ وَمَا وَجَدْنَا فِيهِ مِنْ حَرَامٍ حَرَّمْنَاهُ۔ أَلَا وَإِنِّيْ أُوتِيْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ۔ (سنن ابی داؤد باب لزوم السنۃ:۴۶۰۴) میں تمہارے کسی شخص کو اس حال میں

نہ پاؤں کہ وہ مسند پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو، اس کے پاس میرے احکامات میں سے کوئی حکم آتا ہے جس میں میں نے کوئی حکم دیا ہوتا ہے یا میں نے اس سے روکا ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے: ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن ہی کافی ہے۔ تو جو کچھ ہم اس میں حلال پائیں گے اسے حلال سمجھیں گے اور جو کچھ حرام پائیں گے اسے حرام جانیں گے۔ لوگو! ہشیار رہنا، بلاشبہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس سے ملتی جلتی بات بھی اس کے ساتھ دی گئی ہے۔

☆......خرافات و بدعات اختیار کرنے والے بھی سنتوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ مشہور تابعی فقیہ حسان بن عطیہ رحمہ اللہ کا کہنا ہے:

مَا ابْتَدَعَ قَوْمٌ بِدْعَةً فِي دِيْنِهِمْ إِلَّا نَزَعَ اللّٰهُ مِنْ سُنَّتِهِمْ مِثْلَهَا ثُمَّ لَا يُعِيْدُهَا إِلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ جس قوم نے بھی دین میں کوئی بدعت اختیار کی، اللہ تعالیٰ نے ان سے اسی قدر سنت اٹھالی۔ پھر وہ سنت قیامت تک ان لوگوں میں نہیں پلٹتی۔ (دارمی)

امام سفیانؒ ثوری فرماتے ہیں:

الْبِدْعَةُ أَحَبُّ إِلَى إِبْلِيْسَ مِنَ الْمَعْصِيَةِ، اَلْمَعْصِيَةُ يُتَابُ مِنْهَا وَالْبِدْعَةُ لَا يُتَابُ مِنْهَا۔ بدعت، ابلیس کو گناہ سے زیادہ پسندیدہ ہے اس لئے کہ معصیت پر انسان توبہ کر لیتا ہے مگر بدعت پر وہ توبہ نہیں کرتا۔ (شرح السنۃ: ۲۱۶)

یہ آیات اور احادیث اس شک کی جڑ کاٹ دیتی ہیں کہ سنت رسول، شرعی دلیل نہیں۔ ایک مومن ان آیات کو پڑھنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو نہ صرف دلی احترام دیتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنا بڑا مقام مل جانے کے بعد اس کے ایمان میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر معمولی نمائندے ہیں جن کے بارے میں اتنی شد ومد سے آیات میں سمجھایا گیا ہے کہ اگر رسول کو ہر لحاظ سے اہمیت نہ دی تو پھر ہر کوئی اپنے ایمان کی خیر منائے۔

یہی وجہ ہے کہ انہی آیات اور احادیث رسول ﷺ کو پیش نظر رکھ تمام ائمہ کرام نے سنت رسول کی موجودگی میں اپنے اقوال اور رائے کو ترک کر کے سنت رسول پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔

☆......سچ ہے اگر علماء اہل سنت کی یہ غیر معمولی اور دقیق علمی سرگرمیاں جاری نہ رہتیں تو کون تھا جو ان احادیث کے بارے میں یہ مطلع کرتا کہ یہ صحیح حدیث ہے اور یہ ضعیف وموضوع یا اس میں یہ علت خفیہ ہے اور اس میں شذوذ۔ جب کہ حفاظت دین کے معیارات ہی مختلف ہوں اور ضعیف وصحیح احادیث کے مابین فرق کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ یہی کامیاب کوششیں ہی تو تھیں جن کی وجہ سے ہر ایک کو محتاط رہنا پڑا اور پختہ دلیل کے بغیر استنباط، اجتہاد اور افتاء سے باز بھی۔ یہ ذوق لطیف بن گیا کہ مسائل کے استنباط یا مسائل کی تصحیح کے لئے صحیح حدیث ہی کو معیار بنادیا

جائے۔ یوں ضعیف وموضوع حدیث کو صحیح حدیث سے جدا کرنے کے اصول بنے۔ اور کار حدیث میں نا اہل اور بد نیت لوگوں کا عمل دخل ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ یہ بھی کوشش ہوئی کہ آپ ﷺ کی طرف منسوب ہر قول وفعل کو اصول حدیث کے میزان پر تولا جائے۔ محض ظن وقیاس کی بناء پر انہیں رد نہ کیا جائے۔ یہ جہد مسلسل محض اس لئے ہوئی کہ قرآن مجید کے چند پیچیدہ مقامات کی وضاحت جو ہادی برحق نے اپنے قول، عمل اور تقریر کے ذریعے فرمادی تھی اور جسے اللہ تعالیٰ نے شریعت کا مصدر اساسی بھی قرار دیا تھا اس کی بخوبی حفاظت کر لی جائے۔

سنت کا انکار قرآن کا انکار: سنت کا انکار نہ صرف رسالت کے منصب کا انکار ہے بلکہ قرآن کریم کو نہ ماننے کا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکار سنت سے قرآن کریم کے بے شمار احکام لایعنی ہو جاتے ہیں۔ نماز، روزہ، حج اور زکوۃ وغیرہ کی تفاصیل ہوں یا بیع وشراء کے معاملات۔ کیا انہیں حالات وزمانہ کی تبدیلی کے سپرد کر دیا جائے یا انہیں شخصی رائے پر اسی طرح چھوڑ دیا جائے۔ اس شخص کی اپنی حیثیت کا تعین کون کرے؟ اور کیسے کرے؟ اور کیوں کرے؟ سنت رسول ہی ایک ایسی حجت ہے جس کے انکار سے قرآن مجید کی بیشتر آیات کا انکار لازم آتا ہے۔ اوپر بیان کردہ آیات میں کیا ہماری مرضی، اختیار، پسند ناپسند، کسی اور کی اتباع وغیرہ کی کوئی گنجائش نکلتی ہے؟ کیا اس نظریہ کے پس پردہ جدید جاہلیت سے وابستہ رہنے کی خواہش تو نہیں؟

سنت رسول مثالی تہذیب وثقافت کی ایک مشعل راہ ہے۔ انکار سنت تو مسلط کردہ تہذیبی لڑائی کا ساتھ دینا ہے۔ اپنی مثالی تہذیب کے تحفظ کا نعرہ تو فرعون اور اس کے گماشتوں کا ہے۔ عمل قوم لوط کو بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر عورت کی عورت سے شادی کو قانونی تحفظ دینا قدیم جاہلیت کی دین ہے۔ بغیر نکاح کے بچوں کا پیدا ہونا، جوان لڑکی کو ایک سے زیادہ بوائے فرینڈز رکھنے پر اکسانا، بزرگوں کو اولڈ ہومز میں بھیج دینا اور بچوں کو چلڈرن ہومز میں چھوڑ دینا اسلامی تہذیب نہیں۔ سنت رسول نے جو تہذیب برپا کی اس میں نکاح کی ترغیب، زنا سے پرہیز، جوان بچیوں کو شرم وحیا کی تعلیم، بوڑھے والدین کا ادب واحترام اور ان کا بھرپور خیال، بچوں کی پرورش اور ان کی دینی، دنیوی اور اخلاقی تعلیم وغیرہ پر ہی اکسایا ہے۔

سنت رسول ﷺ کی قانونی حیثیت پر آپ ﷺ کی زندگی میں اور آپ کی وفات کے بعد تمام صحابہ کرام کا اجماع تھا کہ چھوٹے بڑے تمام کاموں میں سنت رسول کی پیروی کی جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے قرآن وسنت کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا۔ (اعلام الموقعین ۴/۳۷۵)

اس لئے شریعت یا ریاست وقضاء کے کسی بھی پہلو سے جو کچھ بھی ہمیں صحیح سند کے ساتھ سنت مل جائے وہ اہل اسلام پر حجت ہے۔ اسے ہی شرعی مصدر سمجھنا اور اس سے ہی استنباط احکام کرنا مجتہدین کرام کا فرض ہے۔ قرآن کریم کی طرح اس کی اتباع بھی واجب ہوگی۔

سنت میں کچھ تو قطعی الثبوت احادیث ہیں جو متواتر کہلاتی ہیں اور کچھ ظنی الثبوت جنہیں فقہاء آحاد کہہ دیتے ہیں۔ متواتر یا آحاد دونوں میں قطعی الدلالت احادیث ہوسکتی ہیں اور ظنی الدلالت بھی۔ مگر سبھی سنت خواہ وہ متواتر ہو یا آحاد جب صحیح ہوگی تو وہ حجت ہوں گی، اور قابل عمل بھی۔ ورنہ نہیں۔

قرآن وسنت میں تفریق ناجائز: قرآن وسنت کے درمیان اس معنی میں تفریق کرنا کہ اگر ایک مسئلہ حدیث صحیح میں ہو مگر وہ قرآن کریم کے خلاف ہو تو حدیث کو چھوڑ دیا جائے گا، درست نہیں۔ قرآن وسنت میں اولاً تو تضاد ثابت کرنے کا سوچنا ہی نہیں چاہئے۔ اس لئے کہ جس رسول محترم پر قرآن اترا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی سنت قرآن کے خلاف ہو۔ کیا یہ اختلاف کسی دماغ کا پیدا کردہ تو نہیں؟ مزید یہ کہ سنت کا جو تعلق قرآن وحدیث سے ہے وہ شخصی رائے سے نہیں ہے۔ اس لئے یہ ہم پر فرض ہوگا کہ کتاب وسنت سے بیک وقت استفادہ کریں اور انہیں ایک ہی مصدر جانیں۔ من حیث الثبوت (Constancy, Steadiness) تو سنت یوں ہے۔ استدلال کی حیثیت سے اس کی اتباع بھی اسی طرح واجب ہے جس طرح قرآن کریم کی ہے۔

سنت، قرآن کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ ہے؟ قرآن کے احکام کی مختلف صورتیں علماء نے بیان کی ہیں۔ سنت رسول یا تو ان کی مکمل تائید کرتی ہے یا ان کی وضاحت یا پھر وحی کے ذریعے اضافہ۔ ان کے علاوہ کوئی اور صورت ہے ہی نہیں۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اعلام الموقعین: ۲/۳۰۷ میں لکھا ہے کہ قرآن کے احکام کے ساتھ سنت کے احکام کی وضاحت تین طرح سے آئی ہے:

ا۔ سنت موافقت: قرآن جو پیش کر رہا ہے سنت بھی وہی کچھ پیش کر رہی ہے۔ جیسے زکوۃ، نماز، حج، اعلانیہ وچھپے فواحش کی حرمت، زنا وشراب کی حرمت اور مردار، خنزیر کا گوشت کھانے کی حرمت، اسی طرح وضوء کے فرض ہونے کا بیان شرائط وارکان کے ذکر کے بغیر وغیرہ۔ جو کچھ قرآن میں ہے سنت اس کے حکم کی تائید اور اسے مزید پختہ کر رہی ہے۔ جیسے آپ ﷺ کا ارشاد: إِنَّ دِمَائَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ۔ بے شک تمہارے خون اور تمہارے مال تم پر حرام ہیں۔ اب یہ حدیث اس آیت کے موافق ہے: ﴿يأيها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل﴾ (البقرۃ: ۱۸۸) اسی

طرح اس کے بھی:﴿ ومن یقتل مؤمنا متعمدا فجزاؤہ جھنم﴾(النساء:۹۳)اسی طرح دیگر آیات جس میں مومن کے مال وجان کے تحفظ کی بات کی ہے۔ آپ ﷺ کے ارشادات میں انہی کی تائید ملتی ہے۔سنت کے احکام اس اعتبار سے قرآن مجید کے سوفی صد موافق ہیں۔

۲۔سنت جو کتاب کی تفسیر کرتی ہو: اس کی مراد بتاتی ہو۔اس کے مطلق کو مقید کرتی ہو اور اس کے عام کو خاص کرتی ہو۔جیسے ظلم کو بیان کرنا:﴿ولم یلبسوا ایمانھم بظلم﴾(الأنعام:۸۲)ظلم سے مراد شرک ہے۔یا **الخیط الأبیض اور الأسود** کو واضح کرنا اور اس کی تفسیر صبح کی سفیدی اور رات کی سیاہی کرنا۔اور یہ اس ارشاد میں ہے:﴿وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الأبیض من الخیط الأسود من الفجر﴾۔(البقرۃ:۱۸۷)

یہ وہ احکام ہیں جو قرآن مجید میں مجمل(summarized) آئے ہیں۔یعنی وہ تفصیل طلب ہیں۔انہیں رسول اکرم ﷺ نے اپنے قول اور عمل سے واضح فرمادیا اس لئے کہ از روئے قرآن ایسا کرنا آپ ﷺ کی ذمہ داری ہے۔ارشاد باری تعالی ہے:﴿ وأنزلنا إلیک الذکر لتبین للناس ما نزل إلیھم﴾(النحل:۴۴) ہم نے آپ کی طرف قرآن اس لئے اتارا ہے کہ آپ ﷺ اسے اچھی طرح واضح فرمادیں۔جیسے نماز کے اوقات کی تفاصیل، نماز کی رکعات، اور دیگر احکام نماز، اموال اور زکوۃ کی مقدار، مناسک حج، ذبح، شکار، کس جانور کا گوشت کھایا جائے اور کس کا نہیں؟۔نکاح کی تفاصیل، بیع وشراء، جرائم اور ان کی حدود وغیرہ۔یعنی جہاں قرآن نے مطلق بات کی تو سنت نے اسے مقید کردیا، مجمل کہی تو سنت نے اس کی تفصیل بتادی۔یا قرآن کی بات عام ہے تو سنت نے اس کی تخصیص کردی۔مثلاً احکام نماز، روزہ، حج، زکوۃ، لین دین اور خرید وفروخت کے بارے میں قرآن مجید میں پوری تفصیلات نہیں ہیں۔سنت رسول نے انہیں مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کردیا ہے۔

۳۔سنت وہ حکم پیش کرے جس کے بارے میں قرآن کریم خاموش ہو: سنت کے وہ احکام جن میں قرآن خاموش ہے جیسے پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی کو بیک وقت نکاح میں رکھنے کو حرام قرار دیا، شادی شدہ زانی زانیہ کو سنگسار کرایا، اور دو گواہ نہ مل سکنے کی صورت میں قسم کے ساتھ ایک ہی گواہی کو قبول کرلیا۔ایسے احکام کسی بھی صورت میں قرآن کے ساتھ نہیں ٹکراتے البتہ وہ قرآنی احکام پر اضافہ ہیں۔یہ بھی شریعت ہے جسے ماننا فرض ہے اور نہ ماننا کفر۔یہ نہ قرآن سے آگے بڑھنے والی بات ہے اور نہ مخالفت بلکہ قرآن کے حکم کے عین مطابق ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کرو جو عمل اور ایمان کا نام ہے۔اس سنت کی جو پیروی کرے گا وہ گویا کہ آیات الٰہی کو ماننے کا اقرار کرے گا۔

یاد رکھئے! کسی بھی ضعیف یا موضوع حدیث کو یا احادیث کے ظاہری اختلاف کو بنیاد بنا کر یا قرآن وحدیث میں بظاہر اختلاف کو پا کر یہ اصول بنانا درست نہیں کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے یا قرآن پر اضافہ ہے بلکہ ایسے مواقع پر قرآن وسنت کے بارے میں مزید آگاہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ قرآن مجید میں بھی بہت سی آیات ایسی مل جائیں گی جن میں باہم اختلاف ہے اور تضاد بھی۔

☆......علم مصطلح بھی عظیم علم ہے جس سے ہم صحیح وضعیف، مرفوع وموقوف، مقطوع ومنقطع، متصل ومرسل، اور تدلیس وغیرہ کی پہچان حاصل کر سکتے ہیں اور مراتب حدیث وسنت میں امتیاز بھی قائم کر سکتے ہیں۔ ورنہ حق وباطل گڈ مڈ ہو جائے گا۔

کتابت حدیث: رسول اکرم ﷺ نے ابتدا میں قرآن کے ساتھ کچھ اور لکھنے سے منع فرما دیا تھا مگر جب صحابہ کرام اچھی طرح یہ جان گئے کہ قرآن اور حدیث کی کتابت میں فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے تو آپ ﷺ نے اپنی احادیث لکھنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ خود بھی لکھوائیں۔ آپ ﷺ کے خطوط، جو آج مل گئے ہیں اور جو حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں دونوں کو ملا کر دیکھا جا سکتا ہے کہ حدیث کی کتابت کے ساتھ اس کو یاد کر کے اور اسے زبانی روایت کر کے کس قدر محتاط طریقے سے روایت کیا گیا ہے۔ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ آپ کی احادیث تقریباً پچاس صحابہ کرام نے لکھ کر اپنے پاس محفوظ کر لی تھیں۔ موطا امام مالکؒ دوسری صدی ہجری کی کتاب حدیث آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ سیدنا ابو ہریرہؓ، کے شاگرد رشید کا صحیفہ اور انہی کے معاصر معمر بن راشد کا صحیفہ دونوں طبع ہو چکے ہیں یہ پہلی صدی ہجری کی یادگار ہیں۔

☆......حدیث وسنت کی تین اقسام ہیں: سنت قولیہ، سنت فعلیہ اور سنت تقریریہ۔

☆......سنت ہمیں جس طرح وصول ہوتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ **متواتر:** جسے راویوں کی ایک جماعت نے دوسری جماعت سے تمام طبقات میں آخیر تک اس طرح روایت کیا ہو کہ عادتاً ان کا جھوٹ پر اتفاق ہونا یا موافقت ہو جانا ناممکن ہو۔ یہ سب روایت حسی یعنی مشاہدہ یا سماع سے ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ لفظی ومعنوی۔

۲۔ **خبر واحد:** جسے کم از ایک اور زیادہ سے زیادہ تین راوی سند کے ہر حصے اور طبقے میں یکے بعد دیگرے بغیر کسی انقطاع کے روایت کریں۔ سند کی صحت کے بعد متن کی مخالفت کو ئی اوثق نہ کر رہا ہو اور نہ ہی سند ومتن میں کوئی علت

ہو۔ ایسی حدیث میں روایت کردہ سنت یقینی ہوگی اور اس پر عمل کرنا لازمی ہوگا۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔ **مشہور، عزیز اور غریب۔**

خبر واحد ایسا علم ہے جس کا بیان کرنا یا روایت کرنا ممنوع و حرام نہیں۔ از روئے قرآن اسے مسترد کرنا بھی ممنوع ہے۔ ہاں تحقیق کرنا ضروری ہے۔ اگر راوی عادل وضابط ہو تو اسے قبول کیا جائے اور اگر فاسق وفاجر ہو تو تحقیق کے بعد اگر اس کی خبر غلط ثابت ہو جائے تو پھر اسے رد کر دینا چاہئے۔ ضروری نہیں کہ فاسق کی ہر خبر غلط ہو۔

متواتر: فقہاء کرام نے لفظ متواتر کے حوالہ سے متعدد معنی لئے ہیں۔ کسی نے سنت متواترہ لیا اور کسی نے متواتر کا دعوی کسی فقیہ یا امام کی طرف منسوب کر دیا۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ مختلف ائمہ فقہاء متواتر کی اصطلاح کو اس معنی میں استعمال ہی نہیں کرتے جو معنی اصولی حضرات نے لئے ہیں۔

اصولی حضرات کے ہاں متواتر کی تعریف یہ ہے کہ ہر دور میں اسے ایک کثیر تعداد نے کثیر تعداد سے روایت کیا ہو کہ ان سب کا جھوٹ پر اتفاق محال ہو۔ ایسی متواتر سے علم ضروری حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً استنبول ترکی کا ایک بڑا شہر ہے اور سورج روزانہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ ان دونوں کے علم میں فرق یہ ہے کہ پہلا تواتر کے ساتھ سننے میں آرہا ہے جب کہ دوسرا مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔

احناف کے ہاں اس خبر کو ایسے لوگ اپنے ہی جیسے لوگوں سے رسول اللہ ﷺ تک روایت کریں جن کی کثرت تعداد اور اختلاف اماکن کی وجہ سے جھوٹ پر اتفاق یا اکٹھ کا وہم بھی نہ کیا جا سکے۔ ان کا پہلا طبقہ اپنے آخری طبقہ کی طرح ہو اور درمیانہ اپنے دونوں بازوؤں کی طرح۔ (اصول السرخسی: ۲۸۲)

امام مالکؒ سنت متواترہ کی اصطلاح استعمال فرماتے ہیں جو ان کے نزدیک عمل اہل مدینہ ہے نہ کہ اصولیوں کی تعریف۔ دیگر فقہاء اپنے اسلاف کے عمل کو سنت متواترہ کا نام دے دیتے ہیں۔

امام شافعیؒ نے اس اصطلاح کا استعمال اپنی کتاب الرسالہ میں کیا ہی نہیں۔ بلکہ وہ خبر واحد کے لئے السُّنَّةُ المُجْتَمَعُ عَلَيْهَا اور خَبَرُ العَامَّةِ مِنَ العَامَّةِ کے لفظ استعمال کرتے ہیں اور اس کا مد مقابل خَبَرُ الخَاصَّةِ لکھتے ہیں۔ اصولیوں کے ہاں ان دونوں الفاظ سے مراد غیر متواتر ہے کہ وہ معاملہ جو کتاب اللہ میں نہیں اور اس پر امت اس طرح مجتمع ہوگئی کہ دو شخص یا عالم بھی اس سے اختلاف نہ کر سکیں جیسے نماز ظہر کی چار رکعتیں ہیں اس پر امت کا مجتمع ہونا ایسا ہے جو اصولی حضرات کے ہاں متواتر سے بھی بڑھ کر ہے بلکہ متواتر سے بھی اعلی قسم حدیث ہے۔ کیونکہ متواتر میں کچھ علم خواص پر مخفی ہوتا ہے چہ جائے کہ عوام ہوں۔ اور علم متواتر بھی مخفی ہو جاتا ہے۔ جیسا

کہ متواتر کی مذکورہ مثالوں سے جانا جا سکتا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ ایسی متواتر حدیث کا وجود بھی ہے جس کی تعریف اہل اصول کرتے ہیں؟ علماء اصول وحدیث اس کی شاہد صرف دو احادیث پیش کر سکے ہیں۔ پہلی حدیث: إنما الأعمال بالنيات ہے اور دوسری من كذب علي متعمدا۔۔۔ والی۔ پہلی حدیث میں متواتر کی بیان کردہ شروط موجود ہی نہیں۔ اس لئے کہ محدثین بالاتفاق اس کی سند کو غریب کہتے ہیں۔ جو آحاد کی ایک قسم ہے۔ اس میں عدد رواۃ کا تواتر سند کے درمیان میں واقع ہوا ہے سند کے آغاز میں نہیں۔ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

> نَعَمْ قَدْ تَوَاتَرَ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ : فَحَكَى مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ سَعِيْدِ النَّقَّاشِ الْحَافِظِ أَنَّهُ رَوَاهُ عَنْ يَحْيَى مِائَتَانِ وَخَمْسُوْنَ نَفْسًا وَسَرَدَ أَسْمَائَهُمْ أَبُو الْقَاسِمِ بْنُ مَنْدَةَ فَجَاوَزَ الثَّلاثَ مِائَةٍ۔
> ہاں یہ حدیث یحییٰ بن سعید سے متواتر روایت کی گئی ہے محمد بن علی بن سعید النقاش حافظ نے لکھا ہے کہ اسے یحییٰ بن سعید سے دو سو پچاس افراد نے روایت کیا ہے اور ابوالقاسم بن مندۃ نے اس کے تین سو سے زائد نام گنوائے ہیں۔ (فتح الباری ج ۱ ص: ۱۱)

رہی دوسری حدیث کی دلیل کہ اسے صحابہ کی بڑی تعداد نے روایت کیا ہے اور صحیحین میں صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے یہ مروی بھی ہے حافظ ابوبکر البزار نے اپنی مسند میں لکھا ہے کہ تقریباً چالیس صحابہ نے اسے آپ ﷺ سے روایت کیا ہے اور بعض دیگر حفاظ نے اس کی تعداد باسٹھ بتائی ہے جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔

دوسری رائے اس حدیث کے متواتر ہونے سے انکاری ہے امام زبیدی لکھتے ہیں: بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ حدیث متواتر نہیں ہے کیونکہ اگر فرض کرلیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک ایسی جماعت نے اسے نقل کیا ہے جن کی روایت سے علم ضروری حاصل ہوتا ہے تو دوسری جماعت کے سماع کے بارے میں علم ضروری کے حصول کا دعوی ممکن نہیں۔ اسی طرح تیسری سے چوتھی اور چوتھی سے پانچویں کے سماع کے بارے میں علم ضروری کے حصول کا دعوی بھی نادرست ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ خبر بہت مشہور ہو چکی ہے جسے متواتر اور علم ضروری کا مصدر سمجھ لیا گیا ہے۔ (لقط اللآلی: ۲۲)

زبیدی کہتے ہیں کہ بعض علماء یہ جواب دیتے ہیں کہ آخری طبقہ تک مسلسل سماع کی وضاحت اس میں ملتی ہے۔ اگر اسے متواتر تسلیم نہ کیا جائے تو پھر دنیا میں کوئی حدیث بھی متواتر نہیں۔ اسی لئے بعض علماء نے احادیث متواترہ پر

مستقل کتب تالیف کی ہیں۔

صحیح میزان: متواتر لفظی کے بارے میں تو شک نہیں کہ سوائے ایک دو کے شاید ہی کوئی حدیث ہو جو اس کی تعریف پر پورا اترتی ہو۔ ہاں متواتر معنوی کے بارے میں علماء کا اتفاق ہے کہ وہ بکثرت پائی جاتی ہیں۔ جس پر بحث آگے آ رہی ہے۔

☆ ..... مزید یہ کہ متواتر کے سلسلے میں حدیث کے مشہور و معروف اصولوں کو ہم پیش نظر رکھیں اور اسے تعصب، تمذہب اور ہوی سے خالی ہو کر اپنائیں۔ میزان یہ نہیں ہے کہ جو حدیث ہماری خواہش و اغراض کے خلاف ہوا سے ہم معتبر ائمہ سمیت غلط قرار دے دیں اور تعصب کی بناء پر اپنے امام یا فقیہ کا قول یا ضعیف و موضوع روایت کو صحیح حدیث کے مقابلے میں عملاً حجت اور قابل عمل سمجھیں۔ شیخین اور ائمہ سنن کی روایات سے اغماض برتیں۔ کیونکہ یہ احادیث بھی انہی محدثین نے روایت کی ہوتی ہیں جنہوں نے صیام وحج اور صلاۃ و زکوۃ کی روایت کی ہیں۔

☆ ..... رہا متواتر کا استعمال تو ایسی متواتر احادیث بے شمار ہیں جو ضعیف ہیں اور موضوع بھی مگر بعض مذاہب میں ان کا استعمال بڑا ہمدردانہ اور ان پر مسائل کا دار و مدار بڑا فیاضانہ ہے۔ فضائل اعمال ہوں یا مناقب شخصیات، تفسیر قرآن ہو یا شرح حدیث، فقہی مسائل ہوں یا دعوتی ان سب کو تواتر کا نام دینے میں یہی مذاہب ہی کار فرما ہیں۔

☆ ..... ائمہ مذاہب اور ان کے شاگردوں کے مابین اصولی و فقہی اختلاف تواتر کے ساتھ کتب فقہ میں مذکور ہے۔ کہیں امام محترم کی رائے کو تواتر کے ساتھ قبول کر لیا گیا ہے اور شاگردوں کو چھوڑ دیا گیا ہے اور کہیں اس کے برعکس۔ اسے بھی تواتر کا نام دیا گیا ہے۔ تواتر اگر علماء و ائمہ کے اجتہادات کو قبول کرنے کا نام ہے تو کس دور کے وہ علماء ہیں جنہوں نے تواتر کے ساتھ صرف اپنے سے پہلے دور کے علماء و ائمہ کے عمل یا قول کو قبول کیا ہے یا قابل عمل سمجھا ہے؟

☆ ..... تواتر اگر اس چیز کا نام ہے کہ تخریج کا قاعدہ قابل عمل سمجھ کر ہر دور میں پہلے سے مختلف مگر نیا فقہی مسئلہ استنباط کر لیا جائے اور درج کر دیا جائے تا کہ مختلف عملی صورتیں نفرت و حقارت اور تعصب کی موجودگی میں ..... پھر بھی رحمت ثابت ہوں۔ تو ایسے تواتر کو کس نے متعارف کرایا ہے؟

☆ ..... نیز ہر مذہب کی جدا جدا فقہیات اور تقریباً ہر مسئلہ میں تواتر کے ساتھ دوسرے سے مختلف نظریہ یا مختلف عمل جہاں نظر آتا ہو اسے متواتر نام دے دینا علم اصول سے مذاق نہیں تو سنجیدگی بھی نہیں۔

☆ ..... محسوس یہی ہوتا ہے کہ تواتر کا فلسفہ حدیث کی اہمیت کو کم کرنے اور مذاہب و مسالک کے تقلیدی تسلسل کو تقویت دینے اور ان کی سیادت قائم کرنے کے لئے گھڑا گیا ہے۔ تاریخی حقائق اس کا کھل کر انکار کرتے ہیں۔ قرآن وحدیث میں اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ روایت حدیث ہو یا روایت عمل ان دونوں میں کہیں بھی تواتر نظر نہیں آتا۔

☆ ..... خود امام ابوحنیفہؒ تواتر کے قائل نہیں تھے۔ مزید یہ کہ کوئی روایت، کوئی نام نہاد سنت متواترہ، نہ ہی کوئی عمل اور نہ ہی

کوئی اجتہاد واستنباط اس تواتر کے ساتھ ثابت ہے جس کی تعریف علماء اصول نے کی اور متاخر محدثین نے اس سے متأثر ہوکر اپنی کتب میں اسے جگہ دے دی۔

☆......درجہ بالا حقائق کے پیش نظر یہی مسلک ہی معتدل اور دینی نظر آتا ہے کہ: إِذَا صَحَّ الْحَدِيثُ فَهُوَ مَذْهَبِي۔ جب حدیث صحیح ہوتو میرا مذہب بھی وہی ہے (امام ابوحنیفہؒ)۔ اس سے علم یقین تک بندہ پہنچ جاتا ہے کیونکہ حدیث کی صحت کو جانچنا...... دراصل ظن سے نکل کر یقین تک پہنچنے کا نام ہے اس لئے خبر واحد اور خبر متواتر کی معتزلانہ تقسیم ہی غلط ہے۔

☆......متواتر ہو یا خبر واحد کی تمام اقسام، احکام شرعی میں وجوب، مندوب، حلال وحرام اور مکروہ مباح سبھی کو فراہم کرتی ہیں۔ اوران سے مسائل کا استخراج واستنباط ہوسکتا ہے۔ نیز عقیدہ وایمان بھی ان سے ثابت ہوتا ہے۔ ضعیف، مرسل یا منقطع روایت سے فقہی مسائل کا استخراج فقہاء کرام کے نزدیک درست نہیں الا یہ کہ حدیث کے بارے میں بتادیا جائے کہ یہ ضعیف وموضوع یا مرسل ومنقطع ہے۔

☆☆☆☆☆

اجماع

جمہور علماء کے نزدیک فقہ اسلامی کا تیسرا ماٗخذ اجماع ہے۔ اس کے حجت ہونے کے دلائل قرآن وسنت سے ثابت ہیں۔ کیونکہ غلط چیز پر اہل علم کا متفق ہوجانا ناممکنات میں سے ہے۔ امت کو صحیح اور حق دین دیا گیا ہے اس لئے وہ گمراہی پر مجتمع نہیں ہوسکتی۔ البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ مبالغہ آرائی سے ہٹ کر اجماع کی تعریف کیا کی جائے؟ استنباط احکام کا اس امت میں ایک تسلسل ہے اور وہی مفہوم ہی قابل حجت اور معتبر ہوگا جو قرآن وسنت کی منشا اور مطالب کے عین مطابق ہو اور جسے ائمہ اسلام نے سراہا ہو۔

تعریف:

لغت میں: عربی میں اس کا معنی کسی چیز کے بارے میں متفقہ طور پر پختہ عزم وارادہ کرنے کے ہیں۔ جیسے أَجْمَعَ الْقَوْمُ عَلَى هٰذَا الأَمْر. لوگ اس معاملے پر عزم مصمم کے ساتھ متفق ہوگئے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿ فلما ذهبوا به وأجمعوا أن يجعلوه... ﴾ جب وہ یوسف کو لے گئے اور سب نے پختہ ارادہ کرلیا کہ اسے ڈال دیں۔ اتفاق یا اکٹھے ہونے کے معنی میں بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے: أَجْمَعُوا عَلَى كَذَا۔ کہ وہ اس بات پر متفق ہوگئے۔ ایسے میں اس کی ضد اختلاف ہوگا۔

اصطلاح میں: جمہور علمائے اصول کے نزدیک اجماع کی تعریف یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد امت اسلامیہ کے تمام مسلم مجتہدین کا زمانہ حال کے کسی عملی مسئلہ کے شرعی حل پر اتفاق کر لینا۔ یہ اجماع، اجماع مجتہدین کہلاتا ہے۔ اجماع کی یہ ایک ایسی خیالی تعریف وصورت ہے جس کا وجود نہیں۔ اس لئے کہ ایک معاملہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ جس کے بارے میں صحت سے یہ ثابت کیا جاسکے کہ اس میں اس تعریف کے مطابق اجماع کا مفہوم ملتا ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اجماع نام کا ہی انکار کر دیا جائے۔ نہیں نام صحیح ہے اور اجماع کتاب وسنت کی طرح ایک دلیل ہے۔ جس سے ہدایت یا ضلالت متعین کی جاسکتی ہے۔ مگر یہ قرآن وسنت کی طرح احکام کی مستقل دلیل نہیں بلکہ قرآن وسنت کے تابع ہے۔ ایسی صورت میں اجماع کی پھر تعریف یہ ہوگی: **کتاب وسنت سے ثابت شدہ احکام پر مسلمانوں کا متفق ہو جانا۔** اس کا تعلق مسلمان کے امور ومعاملات سے ہوتا ہے۔ یہ اجماع دلیل قطعی کی حیثیت رکھتا ہے۔ دین اسلام کے معلوم ضروری دینی مسائل جیسے: پانچ نمازیں، رمضان کے روزے، حج بیت اللہ، حرمت زنا وشراب وغیرہ۔ ان کے احکام کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت شدہ ہیں۔ اس اجماع کا مخالف اسلام سے نکل جاتا ہے۔ مگر کتاب وسنت کی کسی نص میں اختلاف کی بناء پر اسے خارج از ملت قرار نہیں دیا جائے گا۔

اجماع کی دلیل: کتاب وسنت میں بے شمار دلائل ایسے ہیں جو اجماع کی حجیت پر دلالت کرتے ہیں۔ اور سبھی یہ شہادت بھی دیتے ہیں کہ معتبر اجماع وہی ہے جو کتاب وسنت کے ثابت شدہ احکام پر اہل اسلام کو متفق کر دے۔ مثلاً:

﴿ومن يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدى ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ما تولى ونصله جهنم وسائت مصيرا﴾ جو بھی رسول کی نافرمانی کرے جبکہ اسے ہدایت واضح ہو چکی اور وہ اہل ایمان کے راستہ کو چھوڑ کر اور کوئی راستہ اپنائے تو ہم بھی اسے اسی طرف پھیر دیتے ہیں جس طرف وہ پھرتا ہے اور اسے جہنم میں پہنچائیں گے اور وہ بہت ہی بری لوٹنے کی جگہ ہے۔ (النساء: ۱۱۵)

علم آجانے پر سبیل المؤمنین کی مخالفت پر یہ سخت وعید بتاتی ہے کہ اہل ایمان کا راستہ الہدی ہے۔ اور لفظ مؤمنین ایک جامع لفظ ہے جو زندہ ہیں وہ اور جو فوت ہو گئے ہیں وہ بھی سب اس میں شامل ہیں۔ سب اسی بات پر ہی متفق ہوا کرتے جو ایک معلوم دینی ضرورت ہوتی۔ جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اجماع کے منعقد ہونے کی شرط: جس مسئلہ پر اجماع ہو اس کی اولین شرط یہ ہے کہ وہ مسئلہ قرآن وسنت میں

مذکور نہ ہو۔ یا مبہم وغیر واضح ہو یا وہ نص تاویل کے قابل ہو۔ پھر اجماع کرنے والے مجتہد حضرات ہوں۔ نیز ان کے خیالات وافکار قرآن وسنت کے موافق ہوں۔ بدعتی یا روشن خیال اور بدعت کی طرف بلانے والے حضرات نہ ہوں۔ جنہوں نے اجماع کیا ہو وہ سب کسی مستند دلیل کی بنیاد پر متفق ہوئے ہوں۔ ان صورتوں میں تو اجماع منعقد ہوسکتا ہے ورنہ نہیں۔ اگر اتفاق کے بعد کوئی مجتہد کسی دلیل کے مل جانے سے رجوع کر لیتا ہے اور اس کی رائے بدل جاتی ہے تو ایسی صورت میں وہ اجماع نہیں ہوگا۔

☆.....نصوص کے ہوتے ہوئے اجماع نہیں کیا جاسکتا۔

☆.....اجماع، مجتہدین کے اتفاق کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اور اگر کچھ مجتہدین اختلاف کریں تو وہ اجماع نہیں ہوگا۔ ایسی صورت میں نہ وہ حجت ہوگا اور نہ ہی قابل اتباع۔ اور نہ ہی اس کا دعوی کرنا مناسب ہے۔

☆.....غیر مجتہدین جو استنباط احکام پر قدرت نہ رکھتے ہوں ان کا کسی مسئلہ پر متفق ہوجانا اجماع نہیں کہلاتا۔

☆.....اسی طرح یہ کہنا کہ اس مسئلے پر ائمہ اربعہ کا اجماع ہے درست نہیں اور نہ ہی یہ اجماع امت ہے۔ ایک تو یہ معاصر نہیں تھے اور دوسرا یہ کہ انہیں باہم مل بیٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ مزید یہ کہ ایک مسئلے میں ان کی دو یا تین آراء بھی ہوتی ہیں۔ اسی طرح خلفائے راشدین کے اتفاق کو اجماع نہیں سمجھا گیا۔ یہ بھی کہ کسی مسئلہ میں ان چاروں ائمہ کا اتفاق نادرست بھی ہوسکتا ہے اور ایسا کئی مسائل میں ہے۔ مثلاً چاروں ائمہ طلاق ثلاثہ کو مؤثر قرار دیتے ہیں جو کہ کتاب وسنت کے خلاف ہے۔ کئی علماء نے اسے خلاف قرآن وخلاف سنت قرار دیا ہے۔ المبسوط میں ہے: إنَّ مَوقِعَ الثلاثِ جُمْلَةً مُخَالِفٌ لِلْعَمَلِ بِمَا فِي الكِتَابِ (ج ص ۵) بیک وقت تین طلاقیں دینے والا قرآن میں دیئے گئے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے قول کے مطابق امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبل بھی بیک وقت تین طلاق دینا کتاب وسنت کی نافرمانی، شیطان کی اطاعت اور ظلم سمجھتے ہیں۔ اگر چاروں ائمہ کا اتفاق حجت اور اجماع مان لیا جائے تو اس کا کیا کیا جائے کہ یہ اجماع رسول اللہ ﷺ کی سنت کے خلاف ہے؟۔ مزید ان ائمہ کے شاگردوں کی اختلافی رائے کو نیز ان کے ارشد تلامذہ اگر اس اجماع سے متفق نہ ہوں تو اسے کیا کہا جائے؟

☆.....رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں اجماع کی ضرورت نہ تھی۔ مزید یہ کہ اگر آپ ﷺ کی رائے مجتہدین کی رائے سے مل جاتی تو یہ ایک سنت قرار پاتی اور اگر خلاف ہوتی تو شریعت میں اس کی کوئی اہمیت نہ ہوتی۔ اجماع کے شرعاً ہونے کی دلیل امام شافعیؒ کو اللہ نے جو سجھائی اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

اجماع کا موضوع: اجماع کے لئے ضروری ہے کہ زیر بحث مسئلہ مسلمانوں کے شرعی امور و معاملات سے تعلق رکھتا ہو۔ جس کی بنیاد عقیدہ پر ہو یا اس سے ملتی جلتی ہو یا اس سے متفرع ہوتی ہو۔

کیا اجماع ہوتا بھی ہے؟ اکثر فقہاء کرام کی رائے یہ ہے کہ اجماع ہونا ممکن ہے۔ ذیلی مسائل میں نص موجود تھی مگر اس سے لاعلمی کی وجہ سے صحابہ کی اپنی اپنی رائے تھی۔ چنانچہ جب نص مل گئی تو انہوں نے اپنی رائے ترک کردی اور ان مسائل پر اتفاق کرلیا۔ جسے متاخر علماء نے اجماع کا نام دے دیا۔ مثلاً:

...... نانی کو چھٹا حصہ دینے پر اجماع

...... خنزیر کی چربی کی حرمت پر اجماع

...... مانعین زکوۃ کے خلاف جنگ پر اجماع

...... سگے بہن بھائی نہ ہوں تو باپ کی طرف سے ہونے والے بہن بھائی سگے بہن بھائیوں کی جگہ لے لیں گے۔

...... مسلمان عورت کا نکاح کسی غیر مسلم سے نہیں ہوسکتا۔

...... مفتوحہ اراضی کو مجاہدین کے درمیان اس طرح نہیں بانٹ دیا جائے گا جس طرح دوسرے اموال غنیمت بانٹے جاتے ہیں وغیرہ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: زمانہ صحابہ کے بعد اجماع کہیں نظر نہیں آتا۔ بلکہ ایسا ناممکن، مشکل اور غیر یقینی ہے۔ کیونکہ جن کا اجماع معتبر تھا وہ مختلف ممالک میں پھیل گئے اور بعد میں کبھی مل نہ سکے۔ یہی حال بعد کے علماء کا ہے۔ ان کی بات دل کو لگتی ہے اس لئے کہ چاروں مسلکوں کے اجماع کا دعوی تو مبالغہ ہے بلکہ ایک ہی مسلک میں اصول وفروع کے اختلاف نے اس کی حقیقت بتادی ہے۔ امام احمدؒ بن حنبل کی رائے یہ ہے: جو شخص اجماع کا دعوی کرتا ہے وہ جھوٹا ہے۔ یہی رائے امام ابن حزمؒ، امام ابن تیمیہؒ اور امام شوکانی رحمہم اللہ کی بھی ہے۔

شیخ الاسلام امام ابنؒ تیمیہ فرماتے ہیں: اجماع کا معنی یہ ہے کہ علماء اسلام کسی حکم پر متفق ہوجائیں اور جب کسی حکم پر اجماع ثابت ہوجائے تو اس کی مخالفت جائز نہیں۔ اس لئے کہ پوری امت گمراہی پر متفق نہیں ہوسکتی۔ لیکن بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں اجماع کا دعوی کیا جاتا ہے جو حقیقت کے برعکس ہوتا ہے۔ اور دعوی اجماع کے خلاف جو قول ہوتا ہے وہ کتاب وسنت کی رو سے راجح ہوتا ہے۔ لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی میں تمام صحابہ اس بات پر متفق ہیں کہ حالات ابھی نازک ہیں اس لئے اسے روانہ نہ کیا جائے۔ مگر اکیلے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا

موقف یہ ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ جس لشکر کو رسول اللہ ﷺ نے روانگی کے لئے تیار کیا ہوا ابوبکر اسے واپس نہیں بلا سکتا۔ ان کے پاس رسول اللہ ﷺ کا عمل بطور ایک دلیل کے تھا۔ جسے سبھی نے تسلیم کیا۔ اور اکثریت کا اجتہاد یا اجماع، اقلیت اور نص صحیح کے مقابلے میں کوئی حیثیت اختیار نہ کر سکا۔ اہل اسلام متفق ہیں کہ ائمہ کرام کے اقوال حجت لازمہ ہیں اور نہ ہی اجماع ہیں۔ بلکہ انہوں نے اپنی تقلید سے منع کرتے ہوئے یہ حکم دیا تھا کہ ان کے اقوال کو کتاب وسنت کے مقابلے میں چھوڑ دیا جائے۔ ان کے اکابر طلبہ نے یہی کچھ کیا اور کتاب وسنت کی دلیل ملتے ہی ان کے اقوال کو چھوڑ دیا۔ جس کی مثال مسافت قصر ہے تین دن یا سولہ فرسخ کی تحدید ایک ضعیف قول ہے۔ اس لئے کئی حنبلی اور دیگر علماء نے یہ کہا کہ سفر کی حد اس سے بھی کم ہو تو نماز قصر کرنا جائز ہے جیسا کہ اہل مکہ نے عرفہ اور منی میں نبی ﷺ کے ساتھ نماز قصر ادا کی تھی۔ (فتاوی ابن تیمیہ ج ۲۰ ص ۱۰)

اجماع کی اقسام: فقہاء نے اس کی دو اقسام بیان کی ہیں۔ جن میں پہلی قسم کمزور شمار ہوتی ہے اور دوسری قوی۔ یہ یاد رہے کہ اجتہاد کے لئے مجتہدین کی خاص تعداد مقرر نہیں۔ مسلمانوں کا کوئی مسئلہ دنیا کے کسی خطے میں اٹھے اس بارے میں اجتہاد ہو سکتا ہے۔

اجماع سکوتی: ایک دو مجتہد علماء کسی مسئلہ کے بارے میں شرعی حکم بیان کریں پھر اس مسئلہ کا سبب اور علم دوسرے علماء کو بھی ہو جائے۔ اور انہی علماء کے زمانہ میں اسے خاصی شہرت بھی مل جائے لیکن دوسرا مجتہد اس پر کوئی اعتراض نہ کرے یا صراحت سے اس کا انکار نہ کرے اور نہ ہی تائید کرے بشرطیکہ اظہار رائے میں اس کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ایسا اجماع، اجماع سکوتی کہلاتا ہے۔ کچھ ائمہ کرام اسے اجماع کی بجائے حجت کا نام دیتے ہیں۔ بہت سے شرعی مسائل میں اسی اجماع کے ہونے کا دعوی بھی کیا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک فقیہ نے اس مسئلہ میں صحابہ وتابعین سے منقول کوئی اثر یا خبر کی خوب چھان بین کی۔ اسے معلوم ہوا کہ ان تمام آثار میں سب کے سب ایک حکم پر متفق ہیں اور معاصرین میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اس مسئلہ میں ان سے اختلاف کرتا۔ یوں ان کی زبان پر اجماع کا لفظ جاری ہو گیا جو اجماع سکوتی ہی کی نوع قرار دیتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ چندے معدود فقہاء کرام کی ایک رائے ہوتی ہے۔ جسے اجماع کا نام دے دیا جاتا ہے۔ نیز یہ کیسے مناسب ہو سکتا ہے کہ دس یا بیس فقہاء کی رائے کا امت کو پابند کر دیا جائے کہ اب ان کی مخالفت نہیں ہو سکتی اور اسے تا قیامت حجت بنا دیا جائے۔ معاصرین کے بے شمار اختلافی اقوال ان اجماعی دعووں کو مزید دھچکا دیتے ہیں۔

اجماع صریح: اجماع کی اوپر بیان کردہ تعریف یہی اجماع ہے۔اصولی علماء نے اس کا نام اجماع صریح رکھا ہے۔ایسا اجماع حجت قطعی ہوگا۔

نوٹ: اجماع کی تعریف جس انداز سے کی گئی ہے اور جو اس پر بحث کی گئی ہے پھر بھی ضرورت اس بات کی رہتی ہے کہ تعریف اجماع کو بغیر کسی اختلاف باقی رکھے حل کیا جائے۔دیکھنے میں تو یہ بھی آ رہا ہے کہ ایک ہی مسلک ومذہب کی کتب میں معمولی سے مسائل پر جو ہر مذہب میں اختلافی ہیں انکے بارے میں بھی یہ دعوی موجود ملتا ہے کہ اس پر اجماع ہے۔

☆☆☆☆☆

قیاس

کتاب وسنت کی روشنی میں فقہ اسلامی کا تیسرا ماٗخذ: صحیح قیاس ہے۔جس کی دلیل سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جس میں آپ ﷺ نے اپنی وفات سے تھوڑا عرصہ قبل تقریباً ۱۰ ہجری میں انہیں یمن کا گورنر مقرر کرکے روانہ کیا۔جس میں انہوں نے کہا تھا: اَجْتَھِدُ رَاٗیِیْ وَلَا آلُو۔قرآن وسنت میں مسئلے کا حل نہ ملنے پر اپنی رائے سے کام لوں گا اور صحیح رائے قائم کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کروں گا۔قیاس عموماً اجتہاد سے ہی برآمد ہوتا ہے۔علماء فقہ کے نزدیک صحیح قیاس، اجماع کی بہ نسبت وسیع تر اور آسان تر ماٗخذ شریعت ہے اور بآسانی اس پر عمل ہوسکتا ہے۔مجتہد کا اخلاص اور کوشش ہی اس میں زیادہ کارفرما ہوتی ہے جس کی بناء پر وہ صحیح فیصلہ پر دوگنا اور غلطی پر ایک اجر کا مستحق بھی ٹھہرتا ہے۔صحابہ کرام بھی نئے مسائل پر اجتہاد سے کام لیتے اور بعض احکام کو بعض پر قیاس کرتے اور نظائر کو معتبر سمجھتے تھے۔

لغوی معنی: عربی زبان میں قیاس کا لفظ عام طور پر دو چیزوں کے برابر کرنے کے لئے بولتے ہیں مثلاً قِسْتُ هٰذِهِ الْوَرَقَةَ بِهٰذِهِ الْوَرَقَةِ میں نے اس ورق کو دوسرے کے ساتھ برابر کیا۔یا عِلْمُ فُلَانٍ لَا یُقَاسُ بِعِلْمِ فُلَانٍ فلاں کا علم فلاں شخص کے برابر کہاں؟ یا ایک چیز کو دوسری چیز سے ناپنے یا مقدار معلوم کرنے کو کہتے ہیں۔جیسے قِسْتُ الْقِمَاشَ بِالْمِیْتَرِ میں نے کپڑے کو میٹر سے ناپا۔یا قَایَسْتُ بَیْنَ هَاتَیْنِ الْوَرَقَتَیْنِ میں نے ایک ورق کا دوسرے سے مقابلہ کیا۔

اصطلاحی معنی: علماء اصول کی اصطلاح میں اس کی تعریف درج ذیل ہے:

هُوَ حَمْلُ فَرْعٍ عَلٰی أَصْلٍ فِی حُکْمٍ بِجَامِعٍ بَیْنَهُمَا۔ فرع کو اصل پر ایسے حکم سے محمول کرنا جو ان دونوں

کے مابین ایک ہی جیسا ہو۔ یعنی ایک ایسا واقعہ جس کے حکم کے بارے میں کوئی نص نہیں اسے حکم میں ایک ایسے واقعہ سے جا ملانا جس کا حکم نص میں آچکا ہے۔ اس کی وجہ اس حکم میں واقع علت میں دونوں کا مشترک ہونا ہے۔

جیسے، ہیروئن، چرس وغیرہ کا شراب پر قیاس کرنا۔ کتاب اللہ میں شراب کی حرمت کا حکم موجود ہے اب شراب کی علت نشہ ہے جو ہیروئن، چرس، وغیرہ میں بھی پایا جاتا ہے اس علت میں اشتراک کی وجہ سے یہی حکم ہیروئن اور چرس کو بھی شامل ہوگا۔ مجتہد کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ حکم کی علت کو پہچانتا ہے اور پھر اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ مقیس اور مقیس علیہ دونوں علت میں مشترک ہیں پھر دونوں کے بارے میں حکم واضح کر دیتا ہے۔ نص جو مفہوم دے رہی ہوتی ہے کسی مجتہد کا اس سے کسی اور حکم شرعی سے آگاہ کرنا ہی اصل میں قیاس ہے۔ اس سلسلے میں وہ نصوص کو غیر نصوص کے لئے بطور مثال پیش کرتا ہے۔ قیاس بغیر اصول کے شرعی حکم بتانے کا نام نہیں بلکہ حکم موجود ہوتا ہے بظاہر نظر نہیں آتا جسے مجتہد بذریعہ قیاس منکشف کر دیتا ہے۔ اس لئے قیاس ایک اجتہادی کوشش کا نام ہے جو کتاب وسنت کی معین حدود میں رہتے ہوئے سرانجام پاتا ہے۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

﴿یأیها الذین آمنوا إذا نودی للصلوة من یوم الجمعة فاسعوا إلی ذکر الله وذروا البیع﴾ اے ایمان والو! جب جمعہ کے روز اذان دی جائے تو دوڑو اللہ کے ذکر کی طرف اور چھوڑ دو بیع کو۔

یہ آیت اذان سننے کے بعد خرید وفروخت کو روک رہی ہے۔ جس کی علت یہ ہے کہ اس میں پڑ کر جمعہ میں تاخیر کا ہونا یا اس کا فوت ہو جانا ہے۔ یہی معنی غیر بیع یعنی عقود (Contracts) وغیرہ میں بھی لیا جا سکتا ہے جیسے اجارہ، وکالہ یا اس سے ملتے جلتے اور معاہدے۔ گو یہ صورتیں نص میں مذکور نہیں مگر ان میں بھی وہی مفہوم تاخیر وتفویت آسکتا ہے جس کی وجہ سے بیع ممنوع قرار دی گئی تھی۔ اس لئے انہیں بھی حکم ممنوع میں شامل کیا جائے گا۔

قیاس کے ارکان:

قیاس کی تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ قیاس کے چار ارکان ہیں۔ جو یہ ہیں۔ اصل، فرع، حکم اور علت۔

اصل: اسے مقیس علیہ یا مشبہ بہ یا منصوص مسئلہ بھی کہتے ہیں۔ کسی مسئلہ کے بارے میں کوئی حکم جس نص سے ثابت ہو اس نص کو اصل کہتے ہیں۔ یعنی وہ جگہ جہاں حکم پایا جاتا ہے جیسے اوپر دی گئی شراب (خمر) یا بیع کی مثالیں

فرع: اسے مقیس یا مشبہ یا غیر منصوص مسئلہ بھی کہتے ہیں۔ وہ مسئلہ جسے اصل پر قیاس کر کے اس کا حکم معلوم کرنا ہوتا ہے مگر نص سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا قیاس کے طریقہ کار پر عمل کر کے اصل میں جو حکم موجود ہو اس کا اطلاق اس

پر کیا جاتا ہے۔اس کی شرط یہ ہے کہ اس کا موضوع اصل کے موضوع سے مختلف نہ ہو۔جیسے بیع کا قیاس نکاح پر کرنا کیونکہ موضوع میں اختلاف ہونے کے سبب یہ صحیح نہیں۔کیونکہ بیع بھاؤ تاؤ پر اپنی بنیاد رکھتی ہے اور نکاح باہمی احترام اور آسانی پر مبنی ہوتا ہے۔

حکم: اسے حکم شرعی بھی کہتے ہیں۔جس سے مراد وہ شرعی حکم ہے جو اصل میں آیا ہے۔اور جسے فرع میں ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے۔جیسے شراب کی حرمت اصل میں آئی۔فرع میں جو حکم ثابت ہوتا ہے وہ بذریعہ قیاس ہی ثابت ہوتا ہے جس کی مثال چرس کی حرمت ہے۔عقائد، رویے اور تہذیب نفس، ایمان، توکل، انابت، خوف، رجاء، حب اور بغض وغیرہ۔کا تعلق دل سے ہے اس لئے ان احکام میں قیاس کا دخل نہیں ہوا کرتا اس لئے کہ یہ عملی احکام نہیں۔ نیز جس حکم کی علت کا ادراک ممکن ہو۔جیسے: حرمت ربا، یا قاتل نے جسے قتل کیا ہے اس کی وراثت سے محروم ہونا۔ان میں بھی قیاس کرنا درست نہیں کیونکہ یہ احکام عملی ہیں۔نیز عبادت سے بھی ان کا تعلق ہے۔اسی کے بارے میں کہا جاتا ہے: لَا قِيَاسَ فِي الْعِبَادَاتِ۔عبادات میں قیاس نہیں ہوا کرتا۔

علت: قیاس کا اہم ترین رکن ہے۔جس سے مراد اصل اور فرع کے درمیان مشترک وصف کا پایا جانا ہے۔یہی تو وصف ہے جس کی وجہ سے فرع کو اصل کا حکم ملتا ہے۔اگر یہی وصف یا اس سے مشابہ وصف نئے واقعہ میں موجود ہو تو اسے بھی اصل کے مشابہ سمجھا جائے گا۔جیسے چرس میں نشہ کا وصف جو شراب اور چرس دونوں میں پایا جاتا ہے۔

قیاس کی شرائط: قیاس اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک اس میں یہ اہم شرطیں موجود نہ ہوں۔

۱۔ اصل حکم شرعی ہو نہ کہ لغوی۔کیونکہ لغات میں قیاس نہیں ہوا کرتا۔

۲۔ اصل ثابت ہو منسوخ نہ ہو۔یعنی ایسا نہ ہو کہ کسی موقع ومناسبت سے ایک حکم دیا گیا پھر اس مناسبت کے ختم ہونے کے بعد دوسرا حکم آ گیا اب یہ اصل ثابت نہیں ہے اس لئے کہ اب موقع ومحل اور ہے اس لئے سابق حکم پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

۳۔ اصل کا حکم کتاب وسنت کی نص سے ثابت ہو یا وہ مجمع علیہ ہو۔

۴۔ حکم اصل کی علت فرع میں پائی جائے اور کسی قسم کا کوئی فارق نہ ہو یا کوئی مانع نہ ہو جو اسے حکم اصلی سے الگ کر دے یا اس کے حکم سے ملنے نہ دے۔اگر علت صرف اصل میں ہی منحصر ہو یا اصل تک ہی محدود ہو اور کسی دوسری چیز میں اس کا وجود ممکن نہ ہو تو اس پر قیاس کرنا منع ہے۔کیونکہ قیاس کے لئے یہ ضروری ہے کہ حکم کی علت میں فرع

اور اصل دونوں شریک ہوں۔

۵۔ قیاس کی ان حدود و شرائط کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے یعنی نص میں حکم کی علت تلاش کرنا۔ جہاں حکم کی علت نہ ہو وہاں مجتہد کو یہ علت از خود تلاش کرنا پڑتی ہے۔ یہی وہ قیاس کی قسم ہے جس میں مجتہد اور فقیہ سے بکثرت خطا ہوتی ہے۔ وہ اسے حکم کی علت سمجھتا ہے جب کہ وہ اس حکم کی علت ہوتی ہی نہیں ہے۔ مثلاً جنگ جمل میں فتح کے بعد سیدنا علی مرتضے رضی اللہ عنہ کے بعض حامیوں نے (جو بعد میں خوارج کہلائے) خون پر جان اور مال کو قیاس کیا اور کہا: جب مخالفین کا خون بہانا حلال ہے تو ان کا مال بطور غنیمت اور ان کی جانیں بطور غلام اور لونڈیاں بنانا بھی ہمارے لئے حلال ہیں۔ یہ فاسد قیاس جب سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے سنا تو فرمایا: ٹھیک ہے سب سے پہلے سیدہ عائشہؓ رضی اللہ عنہا پر قرعہ ڈالو وہ کس کے حصہ میں آتی ہیں۔ انہوں نے کہا معاذ اللہ! وہ تو ہماری ماں ہیں۔ امیر المومنین نے یہ بات اس لئے فرمائی کہ جب ماں کو لونڈی بنانا جائز نہیں تو مال غنیمت سمجھ کر ان کا مال لینا بھی جائز نہیں۔ اس طرح سیدنا علیؓ نے خوارج کے فاسد قیاس کے مقابلہ میں صحیح قیاس سے استدلال کیا اور ان کے قیاس کو رَدّ کر دیا۔ یہی وہ احتیاط ہے جو مجتہد کو قیاس کرتے وقت ملحوظ رکھنا ہوگی ورنہ فرضی اور فاسد قیاس و مسائل کے ڈھیر لگ جائیں گے جو اسلامی شریعت کو بدنام کرنے کا باعث بن سکتے ہیں۔

امام ابن القیمؒ فرماتے ہیں: ایسی علتوں کا سہارا لینا جن سے خدانخواستہ صحیح حدیث رد ہو جائے شدت پسندی ہے۔ اگر سنن رسول ﷺ کو ان علتوں کے سبب ترک کرنا شروع کر دیا جائے تو صحیح احادیث و سنن کا تقدس پامال ہو جائے گا۔ (شرح سنن ابی داؤد لابن القیم مع عون المعبود ج ۱۰ / ص ۳۴)

یہ اصول شاید اس لئے بنایا گیا ہے کہ اگر غیر فقیہ صحابی کی روایت، قیاس کے خلاف ہو تو قیاس پر عمل درآمد اولی ہوگا۔ مگر حدیث مصراۃ جو سیدنا ابو ہریرہؓ نے روایت کی ہے وہی تو سیدنا ابن مسعودؓ نے روایت کی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کون ان میں غیر فقیہ ٹھہرا؟۔

اسی طرح فرضی مسائل کا بعض حیلوں سے یوں قیاس کرنا کہ اگر اسلامی احکام کی زد میں فلاں فلاں مسئلے آ جائیں تو ان سے کیسے خلاصی حاصل کریں۔ یہ اور ان سے ملتے جلتے قیاس فاسد ہوں گے اور شریعت کا استہزاء بھی۔

حجیت قیاس: جمہور علماء کے نزدیک قیاس اصول فقہ کا ایک اہم ستون ہے۔ اسے دلیل و حجت تسلیم کیا جانا چاہئے کیونکہ قرآن و سنت، اقوال صحابہ سے اس کے دلائل ملتے ہیں۔ مثلاً:

قرآنی دلائل:

﴿فاعتبروا یا أولی الأبصار﴾...(الحشر:۲) اے دیدہ بینا رکھنے والو! عبرت حاصل کرو۔

﴿قل یحییها الذی أنشأها أول مرة وهو بکل خلق علیم..﴾. (یس:۷۹) کہہ دیجئے کہ اسے وہی دوبارہ زندہ کرے گا جس نے اسے پہلی بار پیدا کیا تھا اور ہر تخلیق کے بارے میں خوب جانتا ہے۔

﴿الله الذی أنزل الکتاب بالحق والمیزان.﴾. (الشوری:۱۷) اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ کتاب اتاری اور میزان بھی۔

میزان سے مراد وہ چیز جس سے معاملات کا وزن کیا جاتا ہے اور پھر ان کے درمیان اندازہ کیا جاتا ہے۔

﴿کما بدأنا أول خلق نعیده﴾۔(الأنبیاء:۱۰۴) جس طرح ہم نے پہلی تخلیق کی ابتداء کی تھی اسی طرح ہم اسے لوٹائیں گے بھی۔

اللہ تعالیٰ نے اعادہ مخلوق کو اس کی ابتداء سے تشبیہ دی ہے۔

﴿والله الذی أرسل الریاح فتثیر سحابا فسقناه إلی بلد میت فأحیینا به الأرض بعد موتها کذلک النشور﴾۔ (فاطر:۹) اور اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے پھر وہ بادل کو اٹھاتی ہیں پھر ہم اسے اس بنجر علاقے میں ہانکتے ہیں پھر ہم اس سے زمین کی خشکی کے بعد سرسبز و شاداب کر دیتے ہیں اسی طرح ہی اٹھنا ہوگا۔

یہ سب آیات قیاس اور قیاس میں موجود ارکان اور شرائط کو پورا کر رہی ہیں۔ جو قیاس کے حجت ہونے اور اس کے جواز کا اشارہ دیتی ہیں۔

حدیثی دلائل:

آپ ﷺ کا جہینہ کی عورت کو ارشاد جس نے اپنی والدہ مرحومہ کی منت حج کے بارے میں پوچھا تھا کہ وہ حج کیے بغیر فوت ہوگئی۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کرلوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل حج کرو۔ بھلا بتاؤ! اگر تمہاری والدہ پر قرض ہوتا تو کیا تم اسے ادا کرتی؟ یہ تو پھر اللہ کا قرض ہے اور اللہ زیادہ حق دار ہے کہ اس کا قرض ادا کیا جائے۔ صحیح بخاری، کتاب الصوم: ۲۱۰

اسی طرح:

ایک آدمی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کے عرض کرتا ہے۔ میری بیوی نے سیاہ رنگ کا بچہ جنا ہے۔ میں اسے اپنا

بچہ نہیں مان سکتا۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: کیا تمہارے پاس کچھ اونٹ ہیں؟ اس نے عرض کی: جی ہاں! ہیں۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ان کا رنگ کیا ہے؟ اس نے کہا: سرخ۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا: کیا ان میں بھورے رنگ کا بھی کوئی اونٹ ہے؟ اس نے کہا: جی وہ بھی ہے۔ فرمایا: وہ کہاں سے آیا؟ اس نے نے کہا: شاید کوئی رگ ابھری ہوگی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر تمہارے ہاں جو بچہ ہوا ہے شاید یہ بھی کوئی رگ ابھری ہے۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب إذا عرض بنفي الولد: ۲۲۷

اقوال صحابہ: صحابہ کرام نے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کو نماز میں ان کی امامت پر قیاس کیا۔ مانعین زکوۃ کو تارکین صلاۃ پر قیاس کیا۔ شراب پینے پر کیا حد ہو؟ اسے حد قذف پر قیاس کیا کہ یہ بھی بہتان لگانے کے مترادف ہے۔ سیدنا فاروق اعظمؓ نے سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ کو قضاء کے بارے میں خط لکھا: پھر اگر کوئی ایسا معاملہ آپ کو پیش آئے جس کا حکم قرآن وسنت میں نہ ملے تو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کیجئے پھر قَايِسِ الْأُمُورَ عِنْدَكَ پھر معاملات کو ایک دوسرے پر قیاس کیجئے اور ایک جیسے معاملات پہچانئے۔ (اعلام الموقعین ۱/۸۶، اخبار القضاۃ ۱/۷۰)

ظاہر ہے صحابہ کرام کے یہ وہ قیاسات ہیں جہاں کتاب وسنت میں کوئی نص نہیں۔ اس لئے جہاں نص نہ ہو، یا اجماع نہ ہو اور نہ ہی کسی صحابی کا قول ہو، وہاں قیاس کو اختیار کرنا اور اسے حجت ماننا ضروری ہے امام شافعیؒ نے سب سے پہلے قیاس پر گفتگو فرمائی اور اسے اجتہاد کے ہم معنی قرار دیا ہے۔

قیاس کیوں؟ وجوہات اور اسباب

قیاس علم وتحقیق کا نام ہے اور احکام شریعت کی پہچان کا راستہ بھی۔ نصوص یا اجماع کی عدم موجودگی میں اسے ہمارے فقہاء کرام نے اس طرح اپنایا ہے جیسے پانی کی عدم موجودگی میں تیمم کیا جاتا ہے۔

کتاب وسنت کی نصوص محدود ہیں اور مسائل وحوادث لامحدود۔ جن کا احاطہ اگر نصوص کرتیں تو شریعت ایک ضخیم شکل میں ہوتی۔ اس لئے نصوص میں جو علتیں اور مخفی مقاصد ہیں یا جن مقاصد کی طرف اسے اشارہ ملتا ہے یا ان سے استنباط ہوسکتا ہے۔ ان پر ایک فقیہ غور کرتا ہے یا کسی واقعہ کے بارے میں منصوص حکم موجود ہے اس کا اطلاق اسی جیسے واقعے میں جہاں علت مشترک پائی جاتی ہو وہاں قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کوئی نیا واقعہ یا صورت حال پیش آجائے جو اس سے پہلے نہ تھی اور اس بارے میں کوئی منصوص حکم بھی نہیں تو قیاس کے ذریعے سے ایسے واقعات کے حکم کے لئے شریعت کا دامن تنگ نہیں ہوتا۔

اللہ کے عدل وحکمت کا تقاضا ہے کہ احکام شریعت کے متعین طریقوں میں قیاس بھی ہو اور شریعت کے مطابق ہو۔ اس لئے شریعت کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر ایک چیز حرام ہے تو اس کی نظیر بھی حرام ہوگی وہ مباح نہیں ہوگی۔ اور اگر ایک چیز مباح ہے تو اس کی نظیر بھی مباح ہوگی حرام نہیں ہوگی۔ اس لئے قیاس فقہ اسلامی کا ایک مأخذ ہے۔ اس سے استغناء نہیں برتا جاسکتا۔ صحیح قیاس عقلاً، قانوناً اور شرعاً عمل کا متقاضی ہے اور قابل ثواب وعبادت بھی۔

قیاس ایک ایسی چیز ہونی چاہئے جس کا فطرت تقاضا کرتی ہو اور کوئی ضرورت بھی داعی ہو۔ احکام شریعت میں جب بندوں کی مصلحتیں پوری ہوں تو اسے ہی شرعی ضرورت کہتے ہیں۔ قیاس کو اختیار کرنے سے یہ غرض پوری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ قیاس کا مطلب ہی یہ ہے کہ کسی معین واقعہ کے بارے میں قرآن یا سنت میں جو حکم موجود ہے اس کے مشابہ دیگر واقعات میں اگر علت مشترک نظر آتی ہو تو وہی حکم ان واقعات کے لئے بھی ہوگا۔

قیاس کرنے کا اہل ایسا عالم ہوتا ہے جو کتاب اللہ کے احکام جاننے کے علاوہ قرآن کے فرائض وآداب، ناسخ ومنسوخ اور قرآن کے عام وخاص کا ماہر ہو۔ سنت رسول ﷺ کے علم کے بعد سلف کے اقوال، اور ان کے اجماع واختلاف اور عربی زبان کے علم سے بھی آراستہ ہو۔ مزید اس کی عقل سلیم اسے مشتبہات سے بھی آگاہ کر سکے۔ اسے یہ علم ہو کہ اس نے یہ قیاس کیوں کیا؟ کہاں سے کیا؟ اور اگر قیاس کے دوران فلاں فلاں دلیل وغیرہ کو ترک کیا تو کیوں کیا؟۔ اشباہ ونظائر کا باہمی ربط اور مناسبت بھی ضرور دیکھے اور قیاس کی تمام تر شرائط کو ملحوظ رکھ کر قیاس کرے۔ اشباہ ونظائر کے باہمی ربط میں عدم احتیاط، لاعلمی اور جہل مرکب ہے۔ جس سے ہر فقیہ کو بچنا چاہئے۔

نوٹ:

۱۔ اجماع اور قیاس کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قیاس، اجماع سے زیادہ مؤثر ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قیاس صحابہ کرام کے دور میں ہوا اور اجماع بھی۔ مگر خلفائے راشدین کے اتفاق کو اجماع نہیں سمجھا گیا جب کہ اس دور میں قیاس کی زیادہ مثالیں ملتی ہیں۔

۲۔ ان چاروں مصادر کا استعمال حفظ مراتب کے اعتبار سے ہوگا۔ قرآن وسنت کو اولین حیثیت دیجئے۔ نیز یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے کہ سنت، قرآن کی تشریح ووضاحت ہے نہ کہ اس کے مخالف۔ پھر اجماع مجتہدین کو اور پھر قیاس کو۔ اجتہاد نئے ایشوز کے شرعی حل کی تلاش کا نام ہے جن کی کوئی نص یا اصل نہ ملتی ہو۔

☆☆☆☆☆

اجتہاد

شریعت میں اجتہاد کو بھی غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔علماء کے علم، تحقیق اور دانش کو رواں دواں رکھنے کے لئے یہ مہمیز دینے کا ایک دروازہ ہے جو امت اسلامیہ میں بہتے پانی اور ابلتے چشموں کی حیثیت رکھتا ہے۔ نہ کہ ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح دین کو سمجھ لیا جائے جس میں تعفن، بدبو اور غیر شفافی آ جاتی ہے۔اہم معاصر مسائل کے حل کی سبیل فراہم کرتا ہے۔ یہ عمل ایک عالم کو مجتہد کے مرتبے تک پہنچا کے اس کا مرتبہ اور وزن بھی قائم کرتا ہے۔علماء فقہ نے اس کی تعریف متعین کر کے چند دیگر شرائط بھی اجتہاد کے لئے ضروری قرار دی ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

لغوی معنی: اجتہاد کا مادہ ج ہ د ہے۔ ہمت وطاقت یا کوشش کرنا کو جہد کہتے ہیں۔امام شوکانیؒ فرماتے ہیں:

الاِجْتِهَادُ فِي اللُّغَةِ مَأْخُوذٌ مِنَ الْمَشَقَّةِ وَالطَّاقَةِ۔ لغت میں اجتہاد کا لفظ مشقت اور طاقت سے ماخوذ ہے۔یعنی کسی کام کے سرانجام دینے میں حتی الامکان کوشش کرنا اور سخت محنت کرنا ہے۔ جیسے چٹان کو اٹھانے میں طاقت کا استعمال کر کے سخت کوشش کرنا۔مگر کسی گٹھلی کو اٹھانے کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا۔

اصطلاحی معنی: علماء اصول نے اپنی اصطلاح میں اس کا معنی یہ کیا ہے:

بَذْلُ الْوُسْعِ فِي نَيْلِ حُكْمٍ شَرْعِيٍّ عَمَلِيٍّ بِطَرِيْقِ الاسْتِنْبَاطِ۔ کسی عملی شرعی حکم کے استنباط کے لئے اولہ میں پوری صلاحیت صرف کرنا تا کہ مجتہد کو علم اور ظن حاصل ہو جائے کہ اس مسئلہ میں اللہ کا حکم کیا ہے۔اجتہاد کہلاتا ہے۔

اس اصطلاحی تعریف سے مندرجہ ذیل چھ نکات واضح ہوتے ہیں جو مجتہد کے تعین ومقام کو واضح کرتے ہیں:

چھ نکات:

۱۔ اجتہاد کے لئے مجتہد کی معمولی نہیں بلکہ سخت محنت درکار ہوتی ہے ایسی کہ اس کی ہمت وطاقت سے باہر ہو جائے۔

۲۔ جو شخص شرعی حکم معلوم کرنے کی استعداد رکھتا ہو یعنی اسے قرآن وسنت اور اس کے لوازمات کا پہلے سے علم ہو وہ اجتہاد کر سکتا ہے اس استعداد سے محروم، مجتہد نہیں کہلائے گا۔اور اس کا اجتہاد نا قابل قبول ہوگا۔

۳۔ مسئلہ کی نوعیت شرعی ہو۔مگر جن مسائل کا تعلق لغت، سیاست اور دیگر دنیوی معاملات سے ہو ان میں

جدوجہد کرنے والے کو مجتہد نہیں کہا جا سکتا۔

۴۔اجتہاد کے لئے ضروری ہے کہ زیرِ غور مسئلہ کا تعلق عملی مسائل سے ہو اور اس کی واقفیت سے غرض ہو۔ محض مشق نہ ہو۔ الدِّینُ یُسْر کا نسخہ اجتہاد میں مجتہد کے سامنے ہو۔ اس کے اجتہاد کی وہی تعبیر صحیح و دینی قرار پائے گی جو آسان ہو اور قابل عمل ہو۔ مشکل تعبیر جس پر سرے سے عمل ہی نہ ہو سکے وہ اجتہادی تعبیر درست نہیں ہوگی۔ نظریاتی مسائل مثلاً توحید ورسالت اور آخرت وغیرہ میں اجتہاد نہیں ہو سکتا۔

۵۔ جو مسئلہ کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہو وہ اجتہادی مسئلہ نہیں اور نہ ہی اسے اجتہادی مسئلہ بنایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ایسے مسائل قطعی طور پر ثابت شدہ ہیں جیسے نماز ادا کرنے، روزہ رکھنے، سچ بولنے، شادی شدہ زانی یا زانیہ کو سنگسار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جو شخص یہ شرعی احکام بیان کرتا ہے وہ مجتہد نہیں ہے اور نہ ہی یہ مسائل اجتہادی مسائل کہلائے جا سکتے ہیں۔

۶۔جن مسائل کی نصوص موجود ہیں انہی کا نفاذ ضروری ہے۔ کسی اور کا نام لینے کی ضرورت ہی نہیں کہ اس مسئلہ میں فلاں مجتہد کی رائے یہ ہے۔

میدان اجتہاد: اہل علم نے اجتہاد کہاں اور کس مسئلے میں کرنا ہے؟ اس کی بھی وضاحت کی ہے۔ اور وہ ہے: هُوَ كُلُّ حُكْمٍ شَرْعِيٍّ لَيْسَ فِيْهِ دَلِيْلٌ قَطْعِيٌّ۔ جن احکام ومسائل میں دلیل قطعی نہیں ان میں اجتہاد ہو سکتا ہے۔ اس لئے جو ضروری دینی مسائل ہیں جیسے پانچ نمازیں، وجوب حج، صوم، زکوۃ وغیرہ ان میں اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح وہ احکام بھی اس سے خارج ہیں جو دلیل قطعی ثبوت یا قطعی دلالت سے معلوم ہوتے ہیں جیسے: تحریم خمر، وسرقہ، یا لڑکے کو لڑکی کے مقابلے میں دوگنا حصہ۔

جن مسائل میں کوئی شرعی نص موجود نہ ہو یا نص اپنی دلالت میں ظنی ہو چاہے وہ قرآن کی کوئی آیت ہو یا خبر واحد۔ یا جن مسائل میں کوئی اجماع نہ ہو سکا ہو۔ وہاں اجتہاد کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں مجتہد کا کام یہ ہوگا کہ وہ خبر واحد کے لئے محدثین کی طے شدہ شرائط کے مطابق، روایت اور اس کے راویوں پر غور کر کے یہ بتائے کہ وہ روایت کس درجہ کی ہے؟ تاکہ ظن سے نکل کر یقین وثبوت میں آیا جائے۔ اجتہاد بھی قرائن کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ اس لئے مجتہد کو یہ راہیں تلاش کرنا ہوں گی۔ محض متن حدیث کو دیکھ کر رائے اور اجتہاد سے اس کے صحیح اور غیر صحیح ہونے کا فیصلہ کرنا درست نہیں ہوگا۔ اگرچہ بعض فقہاء اسے کافی سمجھتے ہیں اور اسے اجتہاد قرار دے دیتے ہیں مگر علمی، تحقیقی اور دیانتداری کے اعتبار سے ایسا اجتہاد، اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ یا مجتہد قرآنی آیت میں لفظ کی ظنی دلالت پر غور کر کے اس

کے معنی کو متعین کرتا ہے اور ایک دلالت کو دوسری دلالت پر ترجیح دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی دونوں مقامات ایسے ہیں جن سے احکام مستنبط کرنے میں فقہاء کے درمیان اختلافات رونما ہوتے ہیں ایسے مواقع پر کہا جاتا ہے کہ اس مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے اور امام مالکؒ یا امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے۔ اس معنی میں چاروں فقہ کو مذاہب اربعہ کہا جاتا ہے اور یہاں مذہب کا معنی اجتہاد ہے کہ فلاں امام کا یہ اجتہاد ہے۔

اجتہاد کی اہمیت وثبوت: اسلام کے مکمل دین اور مکمل ضابطہ حیات ہونے کی وجہ سے آخری شریعت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہر زمان ومکان کے لئے انتہائی مناسب بنادیا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ تمام پیش آنے والے حوادث وواقعات کی تفاصیل قرآن وسنت میں موجود ہوں۔ کیونکہ حوادث وواقعات نئے نئے پیش آتے رہیں گے مگر ادلہ وہی باقی رہیں گے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں۔ یعنی قرآن وسنت کی نصوص میں احکام کی تعداد محدود ہے۔ جب کہ مسائل غیر محدود ہیں۔ علاقائی اور عصری مسائل اس پر مستزاد ہیں۔ اس لئے غیر منصوص مسائل میں رائے اور اجتہاد کی طرف رجوع کرنا ازبس ضروری ہوگا۔ اور اجمالی ادلہ اور ان کے عام قاعدوں پر غور وفکر کرنا ہوگا تا کہ نظیر کو نظیر کے مطابق حکم دیا جائے۔

☆......ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے اس وقت بھی اجتہاد کی حوصلہ افزائی کی جب قرآن نازل ہو رہا تھا۔ اور راہنمائی دی کہ قرآن وسنت جو اسلام کے اصل مصادر ہیں ان پر غور کرکے قیاسی یا استنباطی طور پر شریعت کے نئے احکام معلوم کئے جائیں۔ مثلاً: ﴿يحكم به ذوا عدل منكم﴾ (المائدۃ:۹۵) اس کا فیصلہ تم میں دو صاحب عدل کریں۔ اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد صحیح حدیث میں ہے:

> إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ فَأَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ **مجتہد کسی حال میں اجر سے محروم نہیں رہتا۔ اگر اس کا اجتہاد درست ہے تو اسے دو اجر ملیں گے ایک اس پر کہ اس نے اجتہاد کیا اور دوسرا اس پر کہ اس کا اجتہاد صحیح ہوا۔ اور اگر اس کا اجتہاد غلط ہوا تو اسے اجتہاد کرنے کا ایک اجر پھر بھی ملے گا۔**

اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اگر مجتہد کو غلطی کرنے پر کوئی اجر نہ ملتا تو کوئی شخص اس اندیشہ سے کبھی اجتہاد نہ کرتا کہ اس کا وقت بغیر کسی اجر کے یونہی ضائع جائے گا اور گناہ گار بھی ہوگا۔

☆......صحابہ رسول بھی متفق نظر آتے ہیں کہ اجتہاد ہونا چاہئے۔ جب ان کے پاس نئے مسائل آتے اور ان کا حل کتاب وسنت سے جب وہ نہ پاتے تو اجتہاد ہی کیا کرتے۔

☆......حقیقت میں مجتہد قرآن وحدیث کی نصوص پر غور وفکر کر کے براہ راست احکام کا استنباط کر کے اللہ ورسول کی اطاعت کرتا ہے۔ اجتہاد سے مراد وہی فکری عمل ہے جس کو قرآن نے استنباط کہا ہے (النساء:۸۳) فقہاء کی اصطلاح میں اسی کا نام قیاس ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ اجتہاد سے مراد بالواسطہ اخذ احکام ہے جب کہ براہ راست اخذ احکام کی بظاہر صورت موجود نہ ہو۔

رسول اکرم ﷺ کا اجتہاد اور اس کا حکم: اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کے لئے دنیوی مصالح اور جنگی تدابیر کے لئے اجتہاد کرنا روا ہے۔ کیونکہ جناب رسالت مآب ﷺ نے خود کئی مسائل میں اجتہاد فرمایا تا کہ امت کو اجتہاد کی شرائط بتا کر اس کا دروازہ کھلا رکھا جائے۔ مثلاً: اساری بدر، متخلفین تبوک کو اذن دینا، تأبیر نخل کے بارے میں اشارہ دینا، وغیرہ۔ کیا دنیوی مصلحت اور جنگی تدابیر کے علاوہ آپ ﷺ نے کسی اور دینی یا شرعی مسئلے میں اجتہاد کیا ہے؟ اہل علم مختلف الرائے ہیں۔ مثلاً:

ایک قول یہ ہے کہ عقلاً آپ ﷺ اجتہاد کر سکتے ہیں۔ جو فعلاً آپ سے ہو بھی گیا۔ یہ جمہور علماء کا **قول** ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے:

﴿فاعتبروا یا أولی الأبصار﴾ (الحشر:۲) یہاں اعتبار سے مراد قیاس ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم اہل بصیرت کو دیا ہے۔ اور نبی ﷺ لوگوں سب سے زیادہ بصیرت والے تھے۔ اور قیاس کی حقیقت اور شروط کے بارے میں زیادہ خبر رکھتے تھے۔ بلکہ آپ بطریق اولی اس پر مامور بھی تھے۔

☆..... آپ ﷺ نے اجتہاد کیا بھی۔ جیسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو آپ کا یہ فرمانا: أَرَأَيْتَ لَوْ تَمَضْمَضْتَ؟ بھلا بتاؤ اگر تم کلی کرو تو؟ جس صحابی نے اپنے فوت شدہ والد کے بارے یہ پوچھا کہ وہ حج نہیں کر سکے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: أَرَأَيْتَ لَوْ كَانَ عَلَى أَبِيكَ دَيْنٌ أَكُنْتَ تَقْضِيهِ؟ اسی طرح حجۃ الوداع میں آپ کا یہ فرمانا: لَوِ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِي مَا اسْتَدْبَرْتُ، لِمَا سُقْتُ الْهَدْيَ۔ اگر کسی معاملے کو میں کرنے کا فیصلہ کرلوں تو پھر میں پیچھے ہٹنے والا نہیں کیونکہ میں اپنی ہدی قربانی ہانک چکا۔

اجتہاد پر عمل، نص پر عمل کی بہ نسبت زیادہ مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ثواب بھی زیادہ بڑا ہے۔ اگر آپ ﷺ اجتہاد پر عامل نہ ہوتے تو پھر ہم یہی سمجھتے کہ امت کے جن حضرات نے اجتہاد کیا فضیلت تو انہیں حاصل ہوگئی مگر آپ ﷺ اس سے محروم ہو گئے۔ جو انتہائی غلط بات ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آپ ﷺ کے لئے شریعت میں اجتہاد کرنا جائز ہی نہیں۔ کیونکہ ارشاد باری تعالی میں ہی آپ ﷺ کے بارے میں ہمیں بتادیا گیا ہے کہ: ﴿وما ینطق عن الهوی إن هو إلا وحی یوحی﴾۔ اور آپ ﷺ صرف وحی کے پابند ہیں۔ ﴿ولا أقول لكم إنی ملک إن أتبع إلا ما یوحی إلی﴾۔ اس لئے آپ ﷺ کا اجتہاد کرنا مناسب نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ ﷺ سے کسی نئے واقعہ کے بارے میں سوال کیا جاتا تو بجائے جواب دینے کے آپ توقف فرماتے اور وحی کا انتظار کرتے یا پھر آپ ﷺ فرماتے: اس بارے مجھ پر ابھی تک کچھ نازل نہیں ہوا۔

تیسرا قول: ان علماء نے توقف کیا ہے اور کوئی مسلمہ بات نہیں کہی۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کو کسی مسئلہ میں اجتہاد کرنے کی اجازت دے دی جائے اور یہ بھی کہ وحی ہی کی طرف آپ ﷺ لوٹیں۔

تنبیہ: جب جمہور کا یہ قول بیان کیا جاتا ہے: کہ آپ ﷺ کو اجتہاد کا حق ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا آپ ﷺ کا یہ اجتہاد شریعت اسلامیہ میں قرآن وسنت کے علاوہ ایک مصدر بن جائے گا؟ اس کا جواب یہی ہے کہ: نہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کا اجتہاد وحی کا پابند ہوتا ہے اگر وہ درست ہوتو وحی اسے برقرار رکھتی ہے اور اگر اس میں کوئی خطأ ہوتو وحی اس خطا سے آگاہ کر کے درست رخ بتاتی ہے۔ قرآن مجید سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد کا یہی طریقہ انبیاء سابقین کے لئے بھی استعمال ہوا۔

اسلام نے اجتہاد کی ترغیب دی۔ عہد نبوی میں صحابہ رسول نے اجتہاد کیا۔ گو اس بارے میں مختلف نکتہ ہائے نظر ہیں مگر صحیح اور درست یہی ہے کہ صحابہ کرام نے آپ ﷺ کی موجودگی میں اور عدم موجودگی میں اجتہاد کیا ہے اور کبھی آپ ﷺ کی اجازت سے اور کبھی آپ ﷺ کے حکم سے۔ اور کبھی صحابی رسول، خود اجتہاد کر بیٹھے آپ ﷺ کو معلوم اور آپ ﷺ نے اسے برقرار رکھا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی پسند وناپسند کا اظہار بھی فرمایا ہے۔ مثلاً:

سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ کرتے وقت آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: فیصلے کے لئے جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو کیا کرو گے؟ تو انہوں نے عرض کی: اَقْضِیْ بِمَا فِی کِتَابِ اللّٰہِ۔ میں جو کتاب اللہ میں ہے اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: اگر اس میں نہ ہوتو؟ تو فرمانے لگے: فَبِسُنَّةِ رَسُولِ اللّٰہِ۔ پھر سنت رسول اللہ ﷺ سے۔ آپ نے فرمایا: اگر سنت رسول میں بھی نہ ہوتو؟ عرض کی: أَجْتَهِدُ وَلَا آلُو۔ اجتہاد کروں گا اور کوئی

کسر نہیں اٹھا رکھوں گا۔ آپ ﷺ نے ان کے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا: الحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُولِ اللهِ إِلَى مَا يُرْضِي رَسُولَ اللهِ ﷺ۔ اس اللہ کا شکر جس نے رسول اللہ کے قاصد کو اس چیز کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول خوش ہو سکے۔

اسی طرح سعد بن معاذ کا یہود بنو قریظہ کے بارے میں جو فیصلہ تھا۔ آپ ﷺ نے اسے انتہائی مناسب اور صحیح قرار دیا۔

آپ ﷺ نے عمرو بن العاص کو فریقین کے درمیان فیصلہ کرنے کا جب حکم دیا تو انہوں نے عرض کی: اللہ کے رسول آپ کی موجودگی میں کیا اجتہاد کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل! اگر تمہارا فیصلہ درست ہوا تو دو اجر ورنہ ایک کے مستحق ہو گے۔

غزوہ حنین کے موقع پر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد جب ابوقتادہ نے ایک شخص کو قتل کیا تو وہ اس کے مال غنیمت کے مستحق ٹھہرتے تھے مگر کوئی اور اسے لے گیا۔ سیدنا ابوبکرؓ نے آپ ﷺ سے عرض کی ابوقتادہ کو مال غنیمت میں سے کچھ دے کر خوش کیا جائے۔ ابوبکرؓ نے اس موقع پر کہا: واللهِ لا نعمدُ إلى أَسَدٍ مِن أُسُودِ اللهِ يُقَاتِلُ عنِ الله ورسولِهِ، فَنُعطِيْكَ سَلْبَهُ۔ بخدا ہم کبھی ایسا نہیں کریں گے کہ اللہ کے شیروں میں ایک شیر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے قتال کرے اور اس کا مال غنیمت ہم تجھے دے دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: صَدَقَ أبو بكر۔

حکمت اجتہاد: آپ ﷺ نے اجتہاد کیوں کیا اور صحابہ کرام کو اس کی اجازت کیوں دی؟ اس میں درج ذیل حکمتیں تھیں:

۱۔ امت کو بتانا مقصود تھا کہ اجتہاد کرنا جائز ہے۔ جب وہ حکم کی علت پالیں تو وہ نوازل میں اجتہاد کر لیں۔ اور اسے منصوص علیہ کا حکم دیں۔

۲۔ صحابہ کی تربیت ہو اور ان کے بعد امت یہ جان لے کہ ادلہ سے اخذ احکام کی کیفیت کیا ہونی چاہئے۔ آپ ﷺ کے بعد امت کے اہل فقہ ونظر بھی اپنے حوادث ونوازل میں عمومات کتاب وسنت کو دیکھ کر اجتہاد کریں۔

☆......اس لئے شریعت میں کوئی ایسی چیز نہیں آئی جو اجتہاد کو کسی جگہ یا کسی زمانہ میں موقوف یا مقید کرتی ہو بلکہ شریعت کی نگاہ میں اجتہاد ایسی چیز ہے جو ہر زمانہ میں ممکن ہے۔ عصر حاضر میں جو سہولتیں میسر ہو چکی ہیں یہ پہلے زمانہ کے مجتہدین کو کہاں میسر تھیں۔ شاید اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

لَا يَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِيْ مَنْصُورِيْنَ عَلَى الْحَقِّ۔۔۔ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ۔ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔

☆......حنابلہ، ظاہریہ اور محدثین کے نزدیک اجتہاد کا دروازہ تا قیامت کھلا ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ اجتہاد کی شریعت میں اجازت ہے مگر یہ اجازت چند سخت شرائط کے تابع ہے۔ تا کہ وحی اور اجتہاد میں نمایاں فرق برقرار رہے اور یہ دونوں آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں اور نا اہل لوگوں سے بھی بچا جائے۔

حکم اجتہاد: جب اس میں امت کے چند علماء مصروف ہوں تو پھر یہ فرض کفایہ ہے۔ باقی مسلمانوں سے یہ حکم ساقط ہو جائے گا۔ اور اگر سبھی اس میں کوتاہی کریں تو اجتہاد کو ترک کرنے پر سبھی گناہ گار ہوں گے۔

اجتہاد اور تفقہ: صحیح بخاری میں یہ حدیث ہے: مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ۔ اللہ تعالیٰ جس سے بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اسے دین میں فقیہ بنا دیتے ہیں۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے یہ چاہا ہے کہ جو دین میں تفقہ حاصل نہیں کرے گا اللہ اس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دین میں تفقہ حاصل کرنا فرض ہے اور دین میں تفقہ حاصل کرنے کا معنی یہ ہے کہ شرعی احکام کو سمعی دلائل سے معلوم کرنا۔ جو سمعی دلائل سے آگاہ نہیں ہے وہ دین میں فقیہ نہیں ہے۔ اس لئے اجتہاد ایک آلہ ہے اور افتاء ایک تخصص۔ نیز مفتی کا فتوی ایک اجتہادی علم ہے اس لئے اس کا مجتہد ہونا ضروری ہے۔

سمعی دلائل سے مراد قرآن وسنت سے احکام معلوم کرنے کا وہ طریقہ ہے۔ جس میں صحیح ذوق اور عقل سلیم کی گنجائش ہو مگر فاسد قیاس، وہم وظن اور باطل رائے کی جگہ نہ ہو اسی طرح مختلف حیلوں اور غیر معقول اعذار سے سمعی دلائل کو بھی رد کرنے کا نام فقہ نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہؒ اپنے فتاوی میں ارشاد فرماتے ہیں:

وَالِاجْتِهَادُ لَيْسَ هُوَ أَمْرًا وَاحِدًا لَا يَقْبَلُ التَّجَزِّيْ وَالِانْقِسَامُ بَلْ قَدْ يَكُوْنُ الرجل مجتهدا في فن أو باب أو مسئلة دون فن وباب ومسئلة، وكل أحد فاجتهاده بحسب وسعه۔۔۔ اجتہاد کوئی ایسا کلیہ نہیں ہے جو تقسیم در تقسیم کو قبول نہ کرے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی فن، باب یا مسئلہ میں مجتہد ہو اور کسی دوسرے میں نہ ہو۔ ہر شخص کا اجتہاد اس کی ہمت ووسعت کے مطابق ہے۔ (فتاوئی ج ۲۰ ص ۲۱۲)

یعنی یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص ہر فن مولا ہو یا اسے دیگر فنون کی بھی لازماً مہارت ہو بلکہ ہر کوئی اپنے اپنے فن میں

مجتہد بن سکتا ہے۔ ایک ماہر لسانیات ہو سکتا ہے تو دوسرا ماہر اقتصادیات، ایک علم الفرائض میں مجتہد بن سکتا ہے تو دوسرا عبادات میں۔ اکثر مجتہدین ایسے ہی مجتہد ہیں۔ بعض مسالک میں عبادات میں فتوی ایک مجتہد کا ہے، قضاء میں کسی اور مجتہد کا قابل ترجیح ہے اور سیر میں کسی اور کا۔ بہر حال مجتہد کے لئے اتنا جاننا ضروری ہے کہ جس فن، جس باب اور جس مسئلہ میں وہ اجتہاد کرنا چاہتا ہے اس فن، باب اور مسئلہ میں اس کے سامنے سمعی دلائل کون سے ہیں۔ باقی مجتہد کے لئے دو تین درجن شرائط حقیقت میں غیر متعلقہ ہیں جو شاید اس لئے ہیں کہ مسلمان خوف زدہ رہیں اور بعض مذاہب کی قید سے نجات نہ پاسکیں۔

اجتہاد کی اقسام: اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ عام اجتہاد ۲۔ خاص اجتہاد

۱۔ عام اجتہاد سے مراد وہ اجتہاد ہے جو احوال ظاہری سے تعلق رکھتا ہو۔ اور

۲۔ خاص اجتہاد سے مراد وہ اجتہاد ہے جس کا تعلق احوال باطنی سے ہو یعنی وہ حالات جو اوپری سطح (Face value) پر دکھائی نہ دیتے ہوں مگر وہ گہری سطح (under cuurent) میں موجود ہوں۔ پہلے کا تعلق بصارت سے ہے اور دوسرے کا بصیرت سے۔ مثلاً صلح حدیبیہ کے وقت جو بظاہر حالات تھے وہ تمام تر اہل اسلام کے خلاف تھے کیوں کہ دس سالہ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ مخالفین کی یک طرفہ شرطوں کو مان کر کیا جا رہا تھا۔ صلح کے اس ظاہری پہلو کی بناء پر اسے قبول کرنا صحابہ کے لئے سخت گراں تھا حتی کہ عمر فاروقؓ نے اس معاہدہ کو دَنِيَّة قرار دیا۔

قرآن کی اس آیت نے اس معاملہ پر تبصرہ کر کے حقیقت کو یوں واضح کیا: ﴿فعلم ما لم تعلموا﴾۔ پس اللہ نے جانا جو تم نے نہ جانا۔ جس کا مطلب ہے کہ تم صرف دکھائی دینے والی باتوں کو جانتے تھے مگر اسی کے ساتھ کچھ بظاہر نہ دکھائی دینے والی باتیں بھی وہاں موجود تھیں اور اللہ کی راہنمائی سے اللہ کے رسول نے ان بظاہر نہ دکھائی دینے والی باتوں کی بنیاد پر صلح کا یہ معاہدہ کر لیا۔ چنانچہ دو سال سے بھی کم مدت میں اہل اسلام کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے بڑھ کر دس ہزار تک پہنچ گئی۔ نیز

اجتہاد کی یہ دو قسمیں بھی ہیں۔

انفرادی اجتہاد **اجتماعی اجتہاد**

۱۔ زمانہ سابق میں مجتہد اپنے تمام تر وسائل کے باوجود کسی بھی مسئلے میں اجتہاد انفرادی طور پر کرتا۔ جس میں دیگر

مجتہدین کی شرکت ناممکن ہوتی۔ ایک فرد کا اجتہاد مقامی سطح پر یا جہاں تک اس کے شاگردوں اور اتباع کا اثر رسوخ ہوتا وہ پہنچ پاتا۔ اس لئے اس زمانہ میں دیگر مجتہدین کی موجودگی انہیں ایک جگہ اکٹھا نہ کر سکی تا کہ باہمی نقاش سے کوئی متفقہ رائے بن پاتی۔ ایسے اجتہاد کو انفرادی اجتہاد کا درجہ حاصل ہے مگر اس کی آج ضرورت نہیں۔

۲۔ اجتماعی اجتہاد جو دنیا بھر میں پھیلے مختلف علماء وفضلاء کی اجتہادی آراء سے مستفید ہونے کا نام ہے۔ موجودہ دور میں جدید آلات ووسائل اس میں بڑے معاون ہیں۔ یہاں استدلال ونقاش کی بڑی گنجائش ہے اور افہام وتفہیم کی بھی۔ اور آپس میں مل بیٹھ کر متفقہ رائے قائم کرنا بھی ممکن ہے۔ اس لئے عصر حاضر میں انفرادی اجتہاد کی بجائے اجتماعی اجتہاد کی ضرورت واہمیت ہے۔ حکومت سعودیہ نے مکہ مکرمہ میں جو علماء کا بورڈ بنایا ہے اس میں دنیا بھر کے متخصص علماء اس کے ممبر ہیں جو کسی بھی ایسے مسئلہ کو جس کی وضاحت قرآن وحدیث میں نہ ہو اس پر ان کے اجتہادات قابل تحسین ہیں۔ مثلاً: بینکنگ میں سود شامل ہے اس بورڈ کی کوشش ہے کہ ایسا بینکنگ نظام بنایا جائے جس میں سود کسی بھی صورت میں داخل نہ ہو سکے۔ یہی حال انشورنس کا ہے۔ نیز کلوننگ، تبدیلی اعضاء وغیرہ یہ ایسے مسائل ہیں جن پر اجتہاد ہوا ہے اور ہو رہا ہے کیونکہ ان کی وضاحت قرآن وسنت میں موجود نہیں۔

اجتہاد ومجتہد کی شرائط:

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے عِقْدُ الْجِیْدِ میں اجتہاد اور مجتہد کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجتہد میں پانچ قسم کے علوم کا ہونا ضروری ہے:

اَلْمُجْتَهِدُ مَنْ جَمَعَ خَمْسَةَ أَنْوَاعٍ مِنَ الْعِلْمِ، عِلْمُ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ، وَعِلْمُ سُنَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، وَأَقَاوِيْلِ عُلَمَاءِ السَّلَفِ مِنْ إِجْمَاعِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ، وَعِلْمُ اللُّغَةِ وَعِلْمُ الْقِيَاسِ۔ مجتہد وہ ہے جس میں پانچ علم ہوں۔ کتاب اللہ کا علم، سنت رسول کا علم، علماء سلف کے اجماعی اور اختلافی اقوال، لغت کا علم اور قیاس واستنباط کا علم۔

اس تعریف کی مزید تفصیل کے لئے ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جو شخص اجتہاد کا راستہ اپنانا چاہتا ہے وہ یہ یاد رکھے کہ اجتہاد چونکہ فہم وفراست اور ذہانت کے استعمال کا نام ہے اور اس میں غلطی کا امکان بھی ہے۔ اس لئے اس کے لئے یہ ضروری ہے:

ا۔ وہ نیک نیت ہو اور صحیح عقیدہ والا بھی، اللہ اور رسول کے علاوہ کسی شخصیت یا گروہ کے تعصب میں مبتلا نہ ہو۔

۲۔ وہ اپنے اجتہاد کی ذمہ داری خود قبول کرے۔ اپنے اجتہاد کو اللہ و رسول کی طرف منسوب نہ کرے۔ اس لئے کہ اللہ و رسول کی طرف غلط بات منسوب کرنا شرعاً حرام ہے۔ یہ قطعاً جائز نہ ہوگا کہ اجتہاد، مجتہد کا ہو اور اسے اللہ و رسول کا حکم قرار دے دیا جائے۔ ایسا کہنا گویا خود کو معصوم کہلوانا ہے۔ قرآن و حدیث کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کرام جیسی برگزیدہ ہستیاں بھی کئی بار اجتہادی خطا سے دوچار ہوئیں۔ اللہ چاہتا تو ان سے یہ غلطی نہ ہوتی مگر اللہ تعالیٰ نے از خود یہ غلطی کروائی تاکہ دنیا یہ سمجھ لے کہ نبی بشر ہوتا ہے کوئی مافوق الفطرت مخلوق نہیں اور نہ ہی خدائی اختیارات رکھتا ہے دوسرا یہ کہ نبی سے اجتہادی غلطی ہو سکتی ہے تو امتی تو بالاُولی خطا کر سکتے ہیں۔ جب نبی کی خطا اللہ تعالیٰ کی بات نہیں ہے تو غیر نبی کی اجتہادی خطا کو اللہ کی بات کہنا بالاُولی حرام ہے۔ ہماری اس ساری گفتگو کی دلیل ملاحظہ کیجئے:

... سیدنا نوح علیہ السلام نے أهل سے مراد۔ نسبی اہل سمجھا تو ان کی خطا پر اللہ نے مطلع کیا اور فرمایا: ﴿إني أعظك أن تكون من الجاهلين﴾۔ یہ باتیں نادانوں کی سی ہیں دوبارہ مت کیجئے گا۔

... سیدنا داؤد علیہ السلام کے اس فیصلہ پر کہ بچہ بڑی عمر والی خاتون کو دے دیا جائے جناب سیدنا سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ بچہ کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر عورت کو ایک ایک حصہ دے دیا جائے جس پر بڑی عمر والی عورت بخوشی راضی ہوگئی مگر چھوٹی عمر والی خاتون نے کہا یہ بچہ میرا نہیں ہے یہ بڑی کا ہے اسے کاٹو مت بلکہ بڑی کو ہی دے دو۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے وہ بچہ چھوٹی کو ہی دے دیا۔ چونکہ سیدنا داؤد علیہ السلام کے فیصلے کی اساس بڑی عمر والا ہونا تھا جو کہ درست نہیں تھی اس لئے ان کا اجتہاد درست نہیں تھا اور ﴿ففهمنها سليمان﴾ ہی قابل تسلیم ٹھہرا۔

... اساری بدر کے معاملے میں سیدنا ابوبکرؓ کا مشورہ معاف کرنے کا تھا اور سیدنا عمرؓ کا قتل کرنے کا۔ مگر رسول اکرم ﷺ نے مشورہ صدیقؓ کو پسند فرما کر ان قیدیوں سے فدیہ لیا اور رہا کر دیا۔ آیات جو بعد میں اتریں ان سے واضح ہوا کہ آپ ﷺ اور جناب صدیق اکبرؓ کی رائے مبنی بر رضاء الٰہی نہ تھی۔ قرآن نے اس کی نشان دہی کر دی۔

ان واقعات و اجتہادات سے یہ معلوم ہوا کہ:

☆.... اگر اجتہادی خطا کا ازالہ ممکن ہو تو اس کا ازالہ فوری ہونا چاہئے جیسا کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے کیا۔ اور اگر ناممکن ہو تو پھر وہ اجتہاد نافذ العمل رہے گا جیسا کہ جنگ بدر کے قیدیوں کے معاملہ میں ہوا۔ عدالت بھی اپنے

فیصلہ کی اجتہادی غلطی معلوم ہونے پر اپنا فیصلہ واپس لے سکتی ہے۔

☆۔۔۔ سیدنا داؤد علیہ السلام کی موجودگی میں سیدنا سلیمان علیہ السلام نے اجتہاد کیا اور جناب رسول اکرم ﷺ کی موجودگی میں شیخین محترمین نے اجتہاد کیا۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام اور جناب عمرؓ کا اجتہاد درست تھا جب کہ دونوں دوسروں کی نسبت چھوٹے تھے۔ داؤد علیہ السلام والد اور سلیمان علیہ السلام ان کے بیٹے تھے۔ علم میں داؤد علیہ السلام اپنے بیٹے سے بڑھ کر تھے مگر جزوی فہم میں سلیمان علیہ السلام اپنے والد سے بڑھ گئے۔ رسول اللہ ﷺ ہر لحاظ سے سیدنا عمرؓ سے بڑھ کر تھے اور ابوبکرؓ بھی۔ مگر اجتہادی معاملہ میں چھوٹے لوگوں کی رائے مبنی بر صواب ثابت ہوئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ضروری نہیں کہ بڑے امام کی رائے بھی بڑی ہو اور صرف نام کو اہمیت دیتے ہوئے ان کے مقابل کسی چھوٹے کی رائے کو نظر انداز کر دیا جائے۔

☆۔۔۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ مجموعی فہم میں قاضی ابویوسفؒ سے برتر ہیں اسی طرح امام شافعیؒ اپنے شاگرد امام مزنیؒ سے۔ مگر ہر ایک کے فقہی مسائل کو دیکھا جائے تو بیشتر مسائل میں ان شاگردوں کا فہم اپنے اساتذہ کے فہم سے زیادہ صائب نظر آتا ہے۔ مثلاً قاضی ابویوسفؒ اپنی کتاب الخراج میں لکھتے ہیں:

مال غنیمت کی تقسیم میں امام محترم جناب ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ جو مجاہد گھوڑے پر سوار ہو اسے دو حصے ملیں گے ایک اس مجاہد کا اور دوسرا اس کے گھوڑے کا۔ اس کے بعد قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے *گھڑ سوار کو تین حصے دیئے۔ ایک حصہ مجاہد کا اور دو حصے گھوڑے کے۔ امام ابوحنیفہؒ نے یہ حدیث سن کر مسترد کر دی اور* فرمایا: لَا أُفَضِّلُ بَهِيْمَةً عَلَى رَجُلٍ مُسْلِمٍ۔ میں کسی چوپائے کو مسلمان مرد پر فضیلت اور برتری نہیں دے سکتا۔ قاضی ابویوسفؒ لکھتے ہیں: خود ہمارے شیخ محترم نے بھی تو چوپائے اور مجاہد کو برابر کا درجہ دے دیا ہے۔

☆۔۔۔۔۔ یعینہ امام شافعیؒ نے اپنے شیخ محترم امام مالکؒ کے کئی مسائل کی تغلیط کی ہے۔ یہ جزوی فہم کا اختلاف ہے جو فقہی کتب میں جا بجا آیا ہے۔ اور بعض اوقات مجموعی فہم پر اہمیت حاصل کر لیتا ہے اور اسے ماننا پڑتا ہے۔ مزید یہ کہ ائمہ کرام میں سے کسی نے اپنے اجتہاد کو شریعت قرار نہیں دیا ہے کیونکہ کوئی مجتہد نہیں جانتا کہ اس کی اجتہادی رائے عین اللہ کی رضا کے مطابق ہے یا کہ نہیں ہے۔ ان کے اقوال اس بارے میں شاہد ہیں۔

☆۔ اس لئے فقہ حنفی، فقہ شافعی، فقہ مالکی، فقہ حنبلی اور فقہ جعفری کی اسی معنی میں کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے کہ وہ عین شریعت ہے۔ اسلامی شریعت کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تضاد نہیں جب کہ فقہی اجتہادات میں تضادات نہ صرف

قولی ہیں بلکہ اصولی ہیں۔ایک چیز اگر فقہ حنفی میں حرام ہے تو فقہ شافعی میں وہ حلال ہے۔فقہ حنفی میں ایک عمل نکاح ہے یا زنا، تو فقہ شافعی میں وہ زنا ہے یا نکاح۔ اگر ان اجتہادات کو شریعت مانا جائے تو خدانخواستہ شریعت تضادات کا مجموعہ ہوئی جو بالکل غلط ہے۔ یہ ناممکنات میں سے ہے کہ شریعت مطہرہ میں ایک چیز بیک وقت حلال بھی ہو اور حرام بھی۔ نکاح بھی ہو اور زنا بھی۔لہٰذا یہ فقہی مذاہب مختلف آراء کا مجموعہ تو ہیں مگر شریعت نہیں۔

دیگر شرائط اجتہاد و مجتہد:

۳۔ مجتہد کو عربی زبان کا اتنا علم ہو کہ وہ عبارات، الفاظ اور کلام میں وارد مختلف اسالیب کو سمجھ سکتا ہو۔ کیونکہ قرآن مجید شریعت کا اصل منبع ہے،اور سنت رسول اس کی شارح، دونوں عربی زبان میں ہیں۔

۴۔ اسے کتاب وسنت کی نصوص جیسے آیات احکام وناسخ ومنسوخ کا اتنا علم ہو کہ ان سے احکام اخذ کر سکتا ہو۔ اگر کوئی مسئلہ درپیش آ جائے تو وہ اس سے متعلق قرآن میں جتنی آیات اور سنت میں جتنی احادیث ہیں ان سب کو اپنے ذہن میں تازہ کر سکتا ہو۔ اگر اسے قرآن وسنت کا اتنا علم نہ ہو تو وہ مجتہد نہیں ہو سکتا اور نہ اسے اجتہاد کرنا چاہئے۔

۵۔ صحیح اور ضعیف حدیث کی پہچان کا اسے علم ہو جیسے اسناد کی معرفت اور علم رجال وغیرہ۔

۶۔ اجماع اور مواقع اجماع کا علم ہو مبادا کہ وہ کسی ایسے مسئلہ میں فتوی دے بیٹھے جس پر اجماع موجود ہو۔

۷۔ اسے صحابہ کرام، تابعین اور بعد کے فقہاء کے مابین مسائل میں اختلاف، اس کے اسباب اور دلائل کا علم ہو تا کہ وہ ان میں صحیح کو غیر صحیح سے اور کتاب وسنت سے قریب تر کو غیر قریب سے الگ پہچان سکے۔

۸۔ اسے اصول فقہ اور ان کے مابین اختلاف کا اور شریعت کے مآخذ سے احکام کو صحیح طور پر اخذ کرنے کے طریقے کا علم ہو۔ وجوہ قیاس، اس کی معتبر شرائط اور فقہی قواعد کی بھی اسے معرفت ہو۔ مقاصد شریعہ کا بھی صحیح ادراک اسے ہو

۹۔ اسے شریعت کے مقاصد، اس کے احکام کی علتوں اور ان کے پیچھے کارفرما حکمتوں کا علم ہو اور وہ یہ جان سکتا ہو کہ لوگوں کے مفادات میں سے کون سے شریعت کی نگاہ میں معتبر ہیں اور کون سے غیر معتبر؟۔

۱۰۔اجتہاد کرتے وقت وہ کسی مخصوص فکر، شخصیت سے متاثر یا تعصب مذہبی کا شکار نہ ہو۔

درجہ بالا شروط بعض علماء کے ہاں مقید اجتہاد کی ہیں۔ مثلاً مسئلہ مسح علی الخفین کی جو رعایت شریعت میں رکھی گئی ہے کیا وہ رعایت آج کے صنعتی موزوں کے لئے بھی ہے؟ یا انجکشن کی سوئی جسم میں داخل ہونے سے وضوء ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ تو ایسے مسائل کے حل کے لئے اور اجتہاد کے لئے مذکورہ پانچ علوم کافی ہیں۔ایسا آدمی اپنے علم کی بنیاد پر

قدیم فقہی ذخیرہ میں ایک ایسا جزئیہ پاسکتا ہے جس میں فقیہ نے یہ فتوی دیا ہو کہ بچھو کسی کے جسم میں ڈنک داخل کردے تو اس کی وجہ سے اس کا وضوٹوٹے گا یانہیں۔ مگر غیر مقید اجتہاد کے لئے یہ شروط کافی نہیں۔ ایسے اجتہاد کے لئے ان شروط کے علاوہ ایک مزید شرط بھی حدیث میں آئی ہے وہ یہ کہ: وَعَلَى الْعَاقِلِ أَنْ يَكُونَ بَصِيرًا بِزَمَانِهِ (جامع العلوم والحکم از ابن رجب حنبلی ص: ۹۸) عقل مند ودانا کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانے کو خوب جاننے والا ہو۔ یعنی حالات زمانہ سے واقفیت رکھتا ہو اور ملکہ اجتہاد رکھتا ہو۔

اختلاف ہو تو حق ایک کے ساتھ ہوگا: بعض فقہاء کہتے ہیں اجتہاد کرنے والوں کے جتنے اقوال ہیں وہ سب درست اور صحیح ہیں۔ ان کا استدلال یہ حدیث ہے: أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيِّهِمْ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ۔ میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے تم جس کی بھی پیروی کروگے ہدایت پا جاؤگے۔ یہ حدیث محدثین کے نزدیک موضوع اور من گھڑت ہے اور نتائج کے اعتبار سے بھی ناقابل تسلیم۔ کیونکہ اگر اختلاف رحمت ہوتا تو پھر اتفاق ایک زحمت ہی ٹھہرتا۔ اس بارے میں صحیح مسلک امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور دیگر جمہور فقہاء کا ہے اور وہ یہ کہ مختلف اقوال میں سے حق صرف ایک قول میں ہے۔ جو اگر چہ ہمارے لئے غیر متعین ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں متعین ہے کیونکہ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک چیز کسی شخص کے لئے بیک وقت حلال بھی ہو اور حرام بھی۔ صحابہ کرام اختلافی مسائل میں ایک دوسرے کی غلطی واضح کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے پر اعتراض بھی کیا کرتے تھے۔ اگر ہر مجتہد کا اجتہاد صحیح اور برحق ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو غلط ٹھہراتے اور آپس میں اعتراضات کرتے۔ مسلک اعتدال والی بات یہی ہے نہ کہ سب کو حق پرست کہہ کر سیاسی بات کہنا یا عوامی بننا۔

شیخ لکھنویؒ کا فیصلہ: اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کہ مسلم علماء فقہاء کے ہاں ہر دور میں اجتہاد ہوا ہے۔ ان اجتہادی کوششوں میں آپس میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ بعد کے ادوار میں بھی ایسا ہو رہا ہے۔ اس لئے فتوی دینے میں فقہاء کے مختلف اقوال اجتہادات مفتی کے سامنے آجائیں تو ایسی صورت میں مفتی کو کیا کرنا چاہیے؟

مولانا عبدالحی لکھنویؒ امام الکلام میں فرماتے ہیں:

> جو نظر انصاف رکھتا ہے اور کتب فقہ واصول کے سمندروں میں غوطہ زن ہوتا ہے وہ یقیناً جان لے گا کہ بیشتر فروعی واصولی مسائل میں علماء کا اختلاف ہے۔ لہٰذا محدثین کرام کا نکتہ نظر ہی اوروں کے نقطہ نظر سے قوی تر ہوتا ہے۔ میں جب بھی اختلافی مسائل سے گزرتا ہوں تو مجھے محدثین کا فیصلہ ہی انصاف کے قریب ترین نظر آتا ہے۔ بخدا

ان کا کیا کہنا، اللہ ہی ان کو جزا دے گا۔ وہ کیوں نہ دے یہی تو سچے وارث نبی ہیں اور شریعت کے کھرے نمائندے۔ اللہ ہمارا حشر ان کے ساتھ کرے اور ان کی محبت وسیرت پر ہی ہمیں دنیا سے اٹھائے۔

اس لئے بقول بعض کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے غیر تحقیقی بات ہے۔ علماء نے اسے مستقل ایک عمل سمجھا ہے اور امت میں روز اول سے ہی جاری ہے اور جاری رہے گا۔ مولانا بحر العلوم عبد العلی حنفیؒ نے ایسے لوگوں کے بارے میں لکھا ہے جو کہتے ہیں کہ اجتہاد مطلق ائمہ اربعہ تک تھا اب وہ ختم ہو گیا ہے: یہ سب محض بے عقلی کی باتیں ہیں جس پر وہ کوئی دلیل نہیں دے سکے۔ هٰذَا كُلُّهُ هَوَسٌ مِنْ هَوَسَاتِهِمْ، لَمْ يَأْتُوا بِدَلِيْلٍ وَلَا يَعْبَأُ بِكَلَامِهِمْ (فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت، جلد۲)۔ ہمارے ایک معاصر دانش ور لکھتے ہیں: عجیب بات ہے کہ دور عباسی کے جن علماء کے نام پر کچھ لوگ اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کا دعوی کرتے ہیں انہوں نے خود کبھی صراحۃً یا کنایۃً ایسی بات نہیں کہی۔ بلا تشبیہ میں کہوں گا کہ رسول اللہ ﷺ کو ہم نبی آخر الزمان مانتے ہیں کیوں کہ آپ ﷺ نے خود اپنی زبان سے یہ اعلان فرمایا کہ میں آخری نبی ہوں لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَخُتِمَ بِيَ النَّبِيُّوْنَ مگر فقہاء اربعہ یا اس دور کے کسی بھی بڑے فقیہ نے کبھی ایسی بات نہ کہی اور نہ لکھی۔

یاد رکھئے! عالی دماغ انسانوں کی پیدائش کبھی بند نہیں ہوتی وہ ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ چنانچہ خود نظام فطرت کے تحت اسلام کے بعد کی تاریخ میں بار بار اعلی صلاحیت کے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر امام الغزالی (م:۱۱۱۱ء) شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ (م:۱۳۲۸ء) شاہ ولی اللہ دہلوی (م:۱۷۶۲ء) وغیرہ۔ یہ کہنا امت کی تصغیر ہے کہ ائمہ اربعہ کے بعد اس صلاحیت کے لوگ امت میں پیدا نہیں ہوئے حقیقت یہ ہے کہ تقریباً ہر صدی میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جو اپنے وسیع مطالعہ، اپنی اعلی ذہنی استعداد اور اپنی بے داغ اسلامیت کے ساتھ اس قابل تھے کہ وہ مجتہد مطلق کا کردار ادا کر سکیں۔ چونکہ یہ دین بہتے چشمے کی طرح ہے اس لئے کسی بھی مجتہد وقت کے اجتہاد کو اس زمانہ و حالات میں تو اہمیت ہوگی مگر یہ ضروری نہیں کہ اس کی وفات کے بعد حالات بدلنے پر بھی اس کے اجتہادات من وعن قبول کئے جائیں۔ ہاں مجتہد کے نہیں بلکہ مجتہدین کے اجتہادات اگر مفید ہوں تو ان سے فائدہ ضرور اٹھایا جا سکتا ہے۔

ایک غلط فہمی: تمام مسالک یا دینی مسائل کا احاطہ کرنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں اس لئے وہ صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا اسے کسی نہ کسی کی تقلید بہر حال کرنی چاہئے۔ ورنہ وہ خواہش نفس کے مطابق اپنی پسندیدہ چیز کا انتخاب کر سکتا ہے۔ نیز وہ تقوی و دیانت داری کے اس اعلی مقام کو بھی نہیں پا سکتا جس پر ہمارے بزرگ تھے۔

ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ آٹھ سالہ درس نظامی پڑھنے کے بعد بھی ایک عالم صرف ایک ہی مسلک کو بمشکل جان پاتا ہے اسے کیا علم کہ دیگر مذاہب کے علماء کے اصول فقہ اور استنباطات کے استدلال کیا ہیں؟ ہاں اگر وہ تمام ائمہ فقہاء کو پڑھتا تو شاید اس کی آنکھیں ان سب کے ادب واحترام میں جھک جاتیں اور کتب میں جو لے دے ہوئی ہے وہ ان کے بارے میں نہ صرف معذرت کرتا بلکہ ان سے اجتناب بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں قائم مدارس مسالک کی بنیاد پر بنے ہیں جن میں صرف اپنی فقہ اس لئے پڑھائی جاتی ہے تاکہ چند مخصوص مسائل میں دوسروں کے اعتراضات کے جواب طلبہ جان سکیں اور ترجیح بھی قائم کرسکیں۔ احادیث رسول کا مطالعہ جتنی عجلت سے کرایا جاتا ہے اس سے حدیث کا صحیح علم کہاں حاصل ہوتا ہے۔ مسلک کی محبت دیانتداری اور صحیح علم سے محروم کردیتی ہے۔ اس لئے ایک رسول کا انتخاب خواہش نفس نہیں بلکہ اطاعت ہے جو آسان ہے مگر چار یا پانچ علماء وفقہاء کی آراء میں سے چناؤ کرنا مشکل ہے۔ اطاعت صرف رسول کی بات یا عمل میں ہوتی ہے نہ کہ کسی اور کی بات میں۔ مگر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ یہ سب چیزیں مسلکوں کی نظر میں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں؟ اور تقلید سب سے زیادہ اہم؟

باقی صحیح کون ہے اور غلط کون؟ اس مسلکی لڑائی کو ہر کوئی سمجھتا ہے کہ یہ جلسے، جلوس، مناظرہ بازی، فلائرز، بینرز اور تصنیفات، نیز درس وتدریس میں مسابقت اور سب سے آخر میں اپنی جماعت، گروہ اور مسلک کی دعوت وغیرہ جس میں أدع إلى سبيل ربك کی بات کم ہے اور أدع إلى سبيل جماعتك کی زیادہ۔

دنیا بھر میں مسلمانوں کے پاس اب اسلام کو متعارف کرانے کے لئے یہی فقہی مسلک ہی تو رہ گئے ہیں۔ مگر کیا اہل دین کے مسائل میں کمی آئی ہے یا ان میں اضافہ ہوا ہے؟۔ باقی صحیح اسلام کہاں ہے؟ اس کے اپنے بھی متلاشی ہیں اور غیر بھی۔ ایک عام مسلمان کو اگر صحیح دین سمجھنے میں اتنی کنفیوژن ہے تو غیر مسلم کے لئے اسے قبول کرنا کون سا آسان ہوگا؟۔

☆☆☆☆☆

خیر القرون کا علم اور فقہی آزادی

صدیق اکبر کا علم واجتہاد: سید الانبیاء رسول اللہ ﷺ نے جو علم چھوڑا اس کے بارے میں اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا کہ یہ سارا علم میرے پاس ہے اور استنباط مسائل یا اجتہاد میرے لئے ممکن ہے۔ تو اس کے سب سے زیادہ مستحق صحابہ کرامؓ تھے۔ جو

آپ کے ساتھ سفر و حضر میں رہے۔ آپ کے ارشادات کو جنہوں نے بغور سنا۔ آپ کے اعمال کو انہوں نے بغور دیکھا۔ مگر ان میں سے ایک نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی کسی کے بارے میں یہ مبالغہ آرائی انہوں نے کی۔ ان صحابہ کرامؓ میں بھی اگر علمی اعتبار سے تفریق کی جائے تو جناب ابوبکر صدیقؓ سب سے زیادہ مستحق تھے جو دعویٰ کرتے کہ رسول اللہ ﷺ کا سارا علم میرے پاس ہے۔ یا صحابہ کرام ہی دعویٰ کرتے کہ سیدنا صدیق اکبرؓ ہی آپ کا سارا علم جمع کئے ہوئے ہیں۔ مگر نہ خلیفۃ الرسول ابوبکرؓ نے کبھی یہ دعویٰ کیا اور نہ ہی صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے یہ مبالغہ آرائی کی۔ ایک اور صحابیِ رسول سیدنا عمران بن حصینؓ نے یہی علم دوسروں کو دے دیا تھا۔ (ابوداود، ترمذی)

نصوص کے بارے میں ان کی احتیاط پر امام ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: كَانَ أَبُو بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَوَّلَ مَنِ احْتَاطَ فِي قَبُولِ الأَخْبَارِ۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ پہلے خلیفہ ہیں جو اخبار کو قبول کرنے میں بڑے محتاط رہے۔

امام ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خلافتِ صدیقی میں ایک دادی نے خلیفۃ الرسول سے میراث کا حصہ مانگا تو فرمایا: اللہ کی کتاب میں تو تمہارا کوئی حصہ مذکور نہیں۔ میرے علم کی حد تک سنتِ رسول میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ ہاں میں لوگوں سے اس معاملہ میں مزید دریافت کروں گا۔ چنانچہ سیدنا ابوبکرؓ نے جب جناب مغیرہؓ بن شعبہ اور جناب محمدؓ بن سلمہ سے یہ مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے شہادت دی کہ جناب رسالت مآب ﷺ نے دادی کو ایک چوتھائی حصہ میراث دلوائی تھی۔ یوں سیدنا ابوبکرؓ نے دادی کو حصہ دیا۔

مرتدین کے بارے میں سیدنا ابوبکر کا موقف اجتہادی تھا۔ سیدنا عمر اور دیگر صحابہ انہیں کہتے رہے کہ ان کے خلاف تلوار اٹھانا مناسب نہیں کیونکہ وہ کلمہ پڑھتے ہیں۔ اس موقع پر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: وَاللّٰهِ لَوْ مَنَعُونِي عَقَالاً كَانُوا يُؤَدُّونَهُ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ لَقَاتَلْتُهُمْ عَلَيْهِ۔ اللہ کی قسم یہ لوگ اگر رسول اکرم ﷺ کو اونٹ کی عقال دیتے تھے اور مجھے دینے سے انکار کر رہے ہیں تو میں ان کے خلاف ضرور لڑوں گا۔ اسی طرح یہ قول بھی: وَاللّٰهِ لَا أُفَرِّقُ بَيْنَ مَا جَمَعَهُ اللّٰهُ مِنَ الصَّلَاةِ وَالزَّكٰوةِ۔ بخدا میں ان چیزوں میں تفریق نہیں کروں گا جنہیں اللہ تعالیٰ نے جمع کیا ہے۔ یہ قول ان کے اجتہادی موقف اور منصب کو واضح کرتا ہے کیونکہ انہوں نے دلیل نص سے دی تھی اس لئے سبھی صحابہ نے مانا۔

تاہم سیدنا ابوبکرؓ، جو سفر و حضر بلکہ بچپن سے لیکر جوانی اور جوانی سے لیکر بڑھاپے تک تقریباً تمام اوقات آپ کے رفیق خاص رہے۔ حتی کہ رات کے وقت بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اور راتوں کو بیدار رہ کر مسلمانوں کے حالات پر غور و فکر کرتے رہے۔ آپ ﷺ ان کے بارے میں اکثر یوں فرماتے: میں، ابوبکرؓ اور عمرؓ آئے۔

میں، ابوبکرؓ اور عمرؓ داخل ہوئے۔ میں، ابوبکرؓ اور عمرؓ باہر نکلے۔ شب اسراء میں آپ ﷺ نے جبریل امین سے کہا: کہ لوگ میری تصدیق نہیں کررہے۔ جبریل امین نے عرض کی تو کیا ابوبکر آپ ﷺ کی تصدیق نہیں کررہے وہی تو صدیق ہیں۔ (طبقات ابن سعد) مگر اس اعزاز اور دائمی رفاقت کے باوجود حضور ﷺ کی فرمائی ہوئی بعض سنن رسول سے ناواقف تھے۔

فاروق اعظمؓ کا علم واجتہاد: سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بھی مجتہد صحابہ میں سے تھے۔ انہوں نے اجتہاد کی ضرورت پر قاضی شریح رحمہ اللہ کو گائیڈ لائن بھی دی۔ شرابی کی سزا شریعت نے مقرر نہیں کی تھی بلکہ حسب حال اجتہاد پر اسے چھوڑ دیا تھا۔ زمانہ فاروقی میں جب عراق، شام اور مصر کے علاقے فتح ہوئے تو لوگوں میں شراب نوشی بھی عام تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس انحرافی لہر کو روکنے کے لئے اور شرابی کو رسوا کن سزا دینے کے لئے اجتہاد کیا اور چیف آف آرمی سٹاف ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو لکھا:

أُدْعُ الشَّارِبِينَ وَاسْأَلْهُمْ: أَحَلَالٌ الْخَمْرُ أَمْ حَرَامٌ؟ فَإِنْ زَعَمُوا أَنَّهَا حَلَالٌ فَاقْتُلْهُمْ كَمُرْتَدِّينَ، وَإِنْ قَالُوا إِنَّهَا حَرَامٌ فَاجْلِدْهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً۔ ان شرابیوں کو بلاؤ اور ان سے پوچھو: کیا شراب حلال ہے یا حرام؟ اگر وہ سمجھیں کہ یہ حلال ہے تو پھر انہیں مرتدین کی طرح قتل کردو اور اگر کہیں حرام ہے تو پھر انہیں اسی کوڑے لگاؤ۔

زمانہ وحال کے بدلنے پر ان کا یہ اجتہاد بھی ہے کہ لفظ واحد سے دی گئی تین طلاق تین ہی شمار ہوں گی۔

صحیح مسلم میں ہے: زمانہ نبوی، خلافت صدیقی میں اور دو سال خلافت فاروقی میں تین طلاقیں ایک شمار ہوتی تھیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

إِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوا فِي أَمْرٍ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ أَنَاةٌ، فَلَوْ أَمْضَيْنَاهُمْ عَلَيْهِمْ؟ فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ۔ لوگوں نے ایک ایسے معاملے کو جس میں انہیں سوچنے یا رجوع کرنے کا موقع دیا اس میں جلدی کردی۔ کیا خیال ہے پھر ہم اسے نافذ ہی نہ کردیں؟ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر اس فیصلہ کو نافذ کردیا۔

اس سب کچھ کے باوجود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بعض شرعی وحدیثی مسائل سے ناواقف تھے۔ انہیں دروازے پر تین بار آواز دے کر لوٹ جانے والی حدیث معلوم نہ تھی آخر انہیں ابوموسیٰ اشعریؓ سے معلوم ہوئی۔ نیز انہیں دیت جنین کا مسئلہ معلوم نہ تھا وہ مغیرۃ بن شعبۃ رضی اللہ عنہ سے معلوم ہوا۔ اسی طرح انگلیوں کی دیت والی حدیث معلوم نہ ہونے کی وجہ سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انگوٹھے اور اس کے پاس والی انگلی کی دیت میں پچیس اونٹ کا حکم جاری کر دیا۔ آخر دوسرے صحابہ کرام کے ذریعے انہیں علم ہوا کہ آپ ﷺ نے ہر انگلی پر دس دس اونٹ دیت مقرر فرمائی تھی۔

یوں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ مجوس سے جزیہ لینا ہے یا نہیں؟ سیدنا عبدالرحمن بن عوفؓ سے انہیں اس کی خبر ملی۔

دیت زوج میں عورت میراث پا سکتی ہے یا نہیں؟ ضحاکؓ بن سفیان رضی اللہ عنہ نے اپنے دیہات سے انہیں لکھ کر بھیجا کہ رسالت مآب ﷺ نے میراث دلائی ہے۔ انہوں نے اسے مانا۔ کیا انبیاء کے نام رکھے جا سکتے ہیں؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس سے منع فرمایا کرتے تھے۔ سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ سے جب اس کے جواز کا علم ہوا تو رجوع کر لیا۔ نماز میں شک پڑنے پر نمازی کیا کرے؟ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جب حدیث بتائی تو علم ہوا۔ یہی صحابی تھے جنہوں نے طاعون کی حدیث سنا کے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو شام کے سفر سے روکا۔

عثمان ذوالنورین کا علم واجتہاد: امیر المومنین سیدنا عثمانؓ بن عفان رضی اللہ عنہ بھی مجتہد تھے۔ حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ آذربائیجان سے مدینہ صرف اس لئے تشریف لائے تا کہ امیر المؤمنین ذوالنورین کو یہ اطلاع دیں کہ کس طرح قرأت قرآن میں اختلاف رونما ہو رہا ہے۔ شامی مقداد بن اسود اور ابوذر رضی اللہ عنہما کی قرأت پر اور عراقی عبداللہ بن مسعود اور ابوموسیٰ اشعری کی قرأت پر ڈٹے ہوئے ہیں اور ہر ایک اپنے آپ کو صحیح اور دوسرے کو غلط کہہ رہا ہے۔ انہوں نے آتے ہی یہ عرض کی: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! أَدْرِكْ هٰذِهِ الأُمَّةَ قَبْلَ أَنْ تَخْتَلِفَ فِي كِتَابِهَا كَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فِي كُتُبِهِمْ۔ امیر المؤمنین! اس امت کا خیال کیجئے اس سے پہلے کہ وہ اپنی کتاب میں اس طرح کا اختلاف کر بیٹھیں جس طرح ان سے پہلے وہ اپنی کتب میں اختلاف کر بیٹھے۔ چنانچہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر انہوں نے صحابہ کرام کو جمع کر کے مشورہ کیا اور کمیٹی تشکیل دے کر اپنی اجتہادی رائے دی کہ قرآن کریم کو ایک حرف اور ایک خط میں لکھا جائے۔ رومن امپائر کے ساتھ جنگ کے لئے بحری فوج اور اس کے بیڑے کی تیاری کا اولین اجتہادی مشورہ بھی انہی کا تھا۔ مگر انہیں متوفی عنہا زوجہا کے محل عدت کی حدیث معلوم نہ تھی۔ جو فریعہؓ بنت مالک رضی اللہ عنہا نے بتائی۔

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا علم واجتہاد: سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی افتاء میں اعلی مقام پر تھے اور لوگوں کے فیصلے انتہائی منفرد مگر بھرپور صلاحیتوں اور خوبیوں سے کرتے تھے۔ انہیں قرآن کریم کی عربی لغت کا علم بھی تھا اور سنت نبویہ کا بھی۔ انہیں شرعی مصادر کی مکمل درایت حاصل تھی حتی کہ اسباب ورود حدیث، ناسخ ومنسوخ کی معرفت، مجمل ومبین، مطلق ومقید وغیرہ اصول فقہ کا بھی ادراک رکھتے تھے۔ جب بھی کوئی فیصلہ وفتوی دینا ہوتا تو فوراً کتاب

وسنت کی طرف ہی رجوع فرماتے۔

ایک شخص کی دو بیویاں تھیں دونوں نے ایک ہی رات لڑکا اور لڑکی جنے۔ صبح ہوئی تو لڑکے کے بارے میں وہ جھگڑ بیٹھیں۔ معاملہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا۔ انہوں نے فرمایا: دونوں مائیں اپنا اپنا دودھ وزن کریں جس کا دودھ زیادہ ہوگا وہی لڑکے کی ماں ہوگی۔

دو آدمی رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک نزاع لائے۔ ایک نے کہا: اللہ کے رسول! اس شخص کی گائے نے میرا گدھا مار دیا ہے۔ دوسرا بولا: جانوروں کی کون ضمانت دے۔ آپ ﷺ نے سیدنا علیؓ سے فرمایا: علیؓ! تم بتاؤ کیا فیصلہ کرنا چاہئے؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: کیا تمہارے جانور بندھے تھے یا کھلے تھے؟ یا ایک بندھا تھا اور دوسرا کھلا تھا؟ دونوں نے کہا گدھا بندھا تھا اور گائے کھلی تھی اور گائے کا مالک بھی موجود تھا۔ سیدنا علیؓ نے فرمایا:

صَاحِبُ الْبَقَرَةِ ضَامِنُ الْحِمَارِ۔ گائے والا ہی گدھے کا ضامن ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی فیصلہ کو ہی صادر فرمادیا۔

زر بن حبیش کہتے ہیں: دو آدمی کھانا کھانے بیٹھے۔ ایک کے پاس پانچ روٹیاں تھیں اور دوسرے کے پاس تین۔ اتنے میں کوئی راہ گیر آ گیا انہوں نے اسے بھی کھانے کی دعوت دی۔ اس طرح سب نے مل کر آٹھ روٹیاں کھائیں۔ راہ گیر نے چلتے وقت یہ کہتے ہوئے انہیں آٹھ درہم دیئے جو میں نے کھایا ہے یہ پیسے اس کے عوض ہیں۔ دونوں میں اب یہ تو تکار شروع ہوئی۔ پانچ روٹیوں والے نے کہا میرے پانچ درہم ہیں اور تمہارے تین۔ تین روٹیوں والے نے کہا: نہیں۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ درہم ہم میں برابر تقسیم ہوں گے۔ دونوں اپنے معاملے کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس لے آئے اور سارا قصہ سنایا۔ سیدنا علیؓ نے تین روٹی والے سے فرمایا: سنو! تمہارے ساتھی نے جو تمہیں پیش کش کی ہے اس پر راضی ہو جاؤ۔ اس لئے کہ اس کی روٹیاں تمہاری روٹیوں سے زیادہ تھیں۔ وہ کہنے لگا ایسا ہو ہی نہیں سکتا الا یہ کہ کوئی صحیح تر بات ہو۔ اس پر سیدنا علیؓ نے فرمایا: اگر ایسا ہے تو سنو! تمہارا حق صرف ایک درہم کا ہے اور باقی سات درہم تمہارے ساتھی کے ہیں۔ آدمی کہنے لگا: سبحان اللہ! وہ کیسے؟۔ آپ نے فرمایا: یہی ہی ہے تمہارا حق۔ کہنے لگا: آپ مجھے صحیح بات سمجھایئے تا کہ میں اسے قبول کرسکوں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: چوبیس روٹیوں کی تہائی آٹھ روٹی بنتی ہیں۔ جنہیں تم تین افراد نے کھایا ہے۔ اور یہ بھی تم میں کوئی نہیں جانتا کہ کس نے کم

کھایا ہے اور کس نے زیادہ۔ اس لئے تم سب کھانے میں برابر ہو۔ پھر فرمایا: تم نے ان کا تیسرا حصہ یعنی آٹھ روٹیاں کھائیں۔ اور تمہاری نو میں تین روٹی تھیں۔ تمہارے ساتھی نے بھی تیسرا حصہ یعنی آٹھ روٹیاں کھائیں۔ اور اس کی پندرہ میں پانچ روٹیاں تھیں۔ اس نے آٹھ کھائیں باقی سات رہ گئیں۔ جنہیں درہم والے نے کھالیں اور تمہاری نو میں سے صرف ایک کھائی۔ اس لئے اب تمہیں ایک کے بدلے ایک درہم ملے گا اور اسے سات کے بدلے سات درہم۔ آدمی کہنے لگا: بات سمجھ آ گئی ہے۔

لیکن امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو انبیاء کے مال میں وراثت جاری نہ ہونے کی حدیث معلوم نہ تھی۔ وہ اس سے بھی لاعلم تھے کہ آگ سے عذاب دینے کی ممانعت بھی شریعت میں موجود ہے؟۔

دیگر صحابہ کا علم: سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو لیجئے۔ ان کے پاس بلاشبہ سنتِ رسول کا خاصا علم تھا۔ مگر تھے وہ بھی انسان۔ کچھ مسائل سنت ایسے تھے جو صحابہ کرام کے مابین متفق تھے مگر وہ بھول گئے یا ان تک حدیث نہیں پہنچی۔ یا انہیں ناسخ کا علم نہیں ہو سکا اور وہ الگ نکتہ نظر رکھتے تھے۔ مشہور حنفی محقق امام زیلعیؒ نے نصب الرایہ میں ان کے چند ایسے مسائل کی تفصیل دی ہے۔ مثلاً:

......معوذتین کو وہ قرآن مجید کا حصہ نہیں سمجھتے تھے۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ انہوں نے اتنا کہا تھا: یہ دو سورتیں شر اور خرابی سے بچنے کے لئے نازل کی گئی ہیں۔

......رکوع میں دونوں ہاتھوں کو ملا کر دونوں گھٹنوں کے درمیان دے دیتے تھے۔ جسے تطبیق کہتے ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی اس کی اجازت دیتے تھے۔ حالانکہ یہ پہلے تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ مگر ان دونوں کو معلوم نہ ہو سکا۔

......سجدہ میں اپنی کہنیاں بھی زمین پہ رکھتے تھے۔

......آپ ﷺ نے آیت "وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ" کس طرح پڑھی۔ ابن مسعودؓ اسے بھول گئے تھے۔

......رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین یعنی دونوں ہاتھوں کو کان اور مونڈھے کے درمیان تک اٹھانا نہیں جانتے تھے۔

......انہیں اس عورت کے مہر کے بارے میں حدیث معلوم نہ تھی جس کا خاوند حق مہر مقرر کئے بغیر فوت ہو گیا۔ عرصہ بعد سیدنا معقلؓ بن یسار سے یہ مسئلہ انہیں معلوم ہوا۔

......جنبی کے لئے تیمم کرنے کی اجازت، شریعت میں موجود ہے مگر ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس حدیث سے بھی ناواقف تھے۔

......سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کو رسول اکرم ﷺ کی نماز ظہر و عصر میں قراءت کرنے کی حدیث کا علم نہیں تھا۔

...... محافظ حدیث رسول سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو مسح خفین کی حدیث سے لاعلمی تھی۔ کیا روزہ دار حالت جنابت میں

صبح کرسکتا ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ بھی انہیں معلوم نہیں تھا۔

......ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو کھڑے ہوکر پیشاب کرنے والی حدیث معلوم نہیں تھی۔ اسی طرح مسح خفین والی بھی۔

نصوص جب ان صحابہ تک نہ پہنچ سکیں تو جس بات کے وہ قائل ہوئے برابر وہ اسی کے قائل رہے۔ ان کو نص پہنچی ہی نہیں یا خیال میں نہیں آئی۔ یا یہ بھی کہ وہ ایک حکم کے قائل رہے اور انہیں ناسخ معلوم ہی نہ ہوسکا۔ مثلاً:

......محبّ سنت رسول سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما موزوں کے مسح میں وقت مقرر کرنے (توقیت) کے قائل نہیں تھے بلکہ اجازت دیتے تھے کہ جب تک چاہے آدمی مسح کرتا رہے۔ اس مسئلے میں جو احادیث تھیں وہ ان تک نہ پہنچیں۔ وہ خواتین کو غسل کے وقت بال کھولنے کا حکم دیا کرتے حالانکہ ام المومنین سیدہ ام سلمہؓ کی حدیث میں جو اجازت دی گئی وہ ان کو نہ پہنچی۔

...... ممتاز صحابیہ سیدہ ہند رضی اللہ عنہا کو مستحاضہ والی حدیث کا علم نہیں تھا وہ استحاضہ میں نماز ہی نہیں پڑھتی تھیں۔

......سیدنا ابن عمر اور سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم دونوں دریا کے پانی سے جواز طہارت کے قائل نہ تھے۔

......سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نیند کو ناقض وضو نہ سمجھتے تھے خواہ سونے والا جیسے اور جس قدر سوتا رہے مگر اس کا وضو نہیں جاتا۔

......وہ برتن جن میں شراب پی جاتی تھی حرمت خمر کے بعد ان کا استعمال ممنوع تھا۔ بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ مگر حضرات صحابہ میں ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما دونوں منع ہی سمجھتے رہے۔ انہیں ناسخ کا علم نہ ہوسکا۔

......قربانی کا گوشت تین دن سے زائد رکھنا آپ نے ممنوع قرار دیا تھا۔ حالات کے بہتر ہونے کے بعد آپ نے اجازت مرحمت فرمادی۔ جناب علی وابن عمر رضی اللہ عنہما اسے ممنوع ہی سمجھتے رہے۔ انہیں ناسخ نہ پہنچ سکا۔

......اسی طرح نکاح متعہ آپ ﷺ نے حرام فرما کر منسوخ کردیا۔ بہت سے صحابہ کو اس کے منسوخ ہونے کی اطلاع ہی نہ ہوسکی وہ اسے جائز ہی کہتے رہے۔ جن میں عبد اللہ بن مسعود، ابن عباس، اسماء بنت ابی بکر، سیدنا معاویہ اور ابوسعید رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔

صحابہ کا سنہری اصول: یہ سب معلومات فقہی کتب میں بے شمار ایسی مثالوں کے ساتھ موجود ہیں۔ بعض علماء نے ان کی کچھ نہ کچھ تاویلیں کی ہیں مگر اس سے انکار نہیں کہ ان مقدس ہستیوں کو حدیث رسول نہیں پہنچ سکی۔ جس کی وجہ سے ان میں یہ اختلاف رائے ہوا۔ علم اور اس کا آزادانہ اظہار ان کے جذبہ اطاعت رسول کو کم نہ کرسکا اور نہ ہی صحیح بات کی قبولیت میں کوئی ہچکچاہٹ۔ ان کا ایک اصول یہ تھا کہ مسئلے کی وضاحت جب حدیث رسول سے ہوجائے تو پھر بلا تامل اسے قبول کرلینا چاہئے۔ وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان کے مزاج اور گھٹی میں تسلیم واطاعت کا جذبہ ہمہ وقت زندہ ہوتا تھا۔ آج ہمارے جو حالات ہیں ان کا تقاضا یہی ہے کہ یہ تفاصیل لکھی جائیں۔

ائمہ فقہاء کا علم: غرض یہ کہ سیدنا ابوبکرؓ و دیگر صحابہ کرامؓ جو اکثر و بیشتر آپ ﷺ کے ساتھ رہے، ان کے علم کا

جب یہ حال تھا کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ رہتے ہوئے اور علم کی محبت رکھتے ہوئے آپ کی کم وبیش احادیث اور سنتوں کو نہیں جانتے تھے یا لاعلم رہے تو بعد والے علماء وائمہ کا کیا حال ہوگا؟ اس لئے جس طرح ہم سیدنا ابوبکرؓ و دیگر صحابہ کرامؓ کے بارے میں یہ مبالغہ آرائی نہیں کرسکتے کہ وہ جناب رسالت مآب رسول اکرم ﷺ کی تمام احادیث وغیرہ کا علم رکھتے تھے اسی طرح امت کے کسی امام، عالم، مجتہد کے بارے میں بھی یہ مبالغہ آرائی انتہائی نامناسب ہوگی۔ کہ فلاں امام وغیرہ کے پاس شریعت کا سارا علم تھا۔ یا یہ سمجھنا کہ بعد کے ائمہ فقہاء صحابہ سے افضل تھے مثلاً: اَبُو حَنِیْفَةَ أَفْضَلُ مِنْ عَلِیٍّ یا یُقَلِّدُ الشَّافِعِیَّ وَلَا یُقَلِّدُ أَبَابَكْرٍ وَعُمَرَ۔ (الفتاوی الکبری ۶/۲۰۰) کیونکہ بہت سے فقہی مسائل ایسے ہیں جن کی دلیل ان ائمہ حضرات کو نہ مل سکی، یا وہ بے خبر رہے یا لاعلم تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض اہم دینی معاملات میں ان ائمہ کبار سے ایک مسئلہ بھی منقول نہیں۔

☆☆☆☆☆

تیسرا باب:

فقہاء اربعہ

دور تابعین میں فقہاء کرام کا فقہی واجتہادی منہج صحابہ کرام کے فقہی واجتہادی منہج کی طرز پر رہا۔ عصری مسائل کے حل کے لئے یہ نسل بھی کتاب وسنت کی طرف رجوع کرتی۔ بصورت دیگر وہ اجتہاد میں منہج صحابہ پر انحصار کرتی۔ اس زمانہ میں روایت حدیث بھی عام تھی۔ نئے فرقوں: خوارج وروافض نے بھی سر اٹھایا۔ اسلامی مملکت کا دائرہ بھی وسعت پذیر ہو رہا تھا۔ بکثرت واقعات بھی رونما ہو رہے تھے۔ اور نت نئے مسائل بھی ابھر رہے تھے۔ جس سے بے شمار سوالات کھڑے ہوگئے جن کے جواب میں اختلاف طبعاً ہوا۔

اس دور میں فقہاء کرام اپنے فقہی رجحان میں یک جان نہیں تھے بلکہ ان میں کچھ منہج صحابہ پر قائم تھے اور نصوص سے واقف تھے۔ یہ فقہاء فتنوں کی وجہ سے رائے دینے میں حد درجہ محتاط تھے۔ مدنی اور حجازی مکتب فکر کی یہی سوچ تھی۔ بعض ایسے بھی تھے جو رائے وقیاس سے اپنے امور نمٹاتے تھے۔ اور نصوص میں غور وخوض کرکے ان کے معانی کا استخراج کرتے۔ ان کی علل سے واقف ہوتے۔ نئے مسائل کے حل کے لئے وہ ان کے معانی اور علل پر غور کرکے وضاحت کرتے۔ وضع حدیث کو بھی انہوں نے رائے کے لئے استعمال کیا۔ کوفہ وعراق ایسے فقہاء کی آماجگاہ تھی۔ نتیجتاً دو فقہی مدارس ابھر آئے۔ مدرسہ اہل الحدیث اور مدرسہ اہل الرأی۔

ان دونوں مدارس فقہیہ میں اختلاف سنت سے احتجاج کے بارے میں نہیں تھا بلکہ صرف ان دو چیزوں میں تھا: کیا رائے کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یا کیا رائے کی بنیاد پر تفریع مسائل کی جا سکتی ہے؟

اسلامی تاریخ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کی علمی سرگرمیوں نے بے شمار مجتہدین وائمہ پیدا کئے جن کے علم سے آج بھی دنیا مستفید ہو رہی ہے۔ امامت کا یہ بلند و بالا مقام جس سے ہمارے یہ ممتاز ائمہ سرفراز ہوئے انہیں ان کے علم و تقویٰ اور دین پر عمل و محنت کی وجہ سے ملا۔ امت محمدیہ بحمد اللہ ایسے فقہاء و مجتہدین کی فہرست سے مالا مال ہے جنہوں نے مشکل حالات میں افراد امت کی صحیح راہنمائی فرمائی۔

مگر چار ائمہ کرام کو خصوصی طور پر جو مقام و مرتبہ ملا وہ امت اسلامیہ کے لئے ایک عظیم الشان اعزاز ہے۔ ان کی یا ان کے شاگردوں کی کاوشوں نے ان ائمہ کرام کی شہرت کو چار چاند لگائے جن کی معتدل محبت ان کے عقیدت مندوں اور بہی خواہوں کے دلوں میں ہمیشہ کے لئے سما گئی۔ ان کے علمی و اجتہادی کارنامے، اصول و ضوابط، تفریع و تخریج، حاشیہ پر حاشیہ، فقہاء کے مختلف مدارج کا قیام مثلاً: مجتہد مطلق، مجتہد مذہب، مفتی مذہب، مرجح مذہب اور مقلد مذہب وغیرہ کی اصطلاحات، قیود و شروط و رموز غرضیکہ فقہی سرگرمی کا کوئی پہلو نہیں جو ہر عقیدت مند نے اجاگر نہ کیا ہو۔ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ رَحْمَةً وَاسِعَةً۔ مگر یہ واضح رہے کہ فقہ و استنباط میں ان ائمہ کرام کے اپنے اپنے مناہج و اصول ہیں بعض میں یہ کسی سے متفق ہیں اور کسی سے مختلف۔ اس لئے کہ شریعت کا سارا علم ان میں سے ہر ایک کے پاس نہیں تھا۔ ان ائمہ کرام کے مختصر حالات زندگی درج ذیل ہیں:۔

امام ابوحنیفہؒ (۸۰ تا ۱۵۰ھ)

سب سے بڑے امام یعنی امام اعظم گردانے اور فقہ حنفی کے بانی کہے جاتے ہیں۔ آپ کا نام نعمان بن ثابت ہے۔ کوفہ میں ۸۰ھ کو پیدا ہوئے۔ بچپن کے حالات کا علم نہیں ہو سکا۔ شروع شروع میں ریشم کا کاروبار کرتے رہے مگر فقیہ و قاضی امام شعبیؒ کے توجہ دلانے پر علم کے حصول میں خوب منہمک ہوئے اس وقت کوئی صحابی رسول زندہ نہ تھے جن سے یہ استفادہ کر سکتے۔ علم کی خواہش اور اپنی ذہنی قابلیت سے علم کلام کی جانب توجہ فرمائی مگر اسے بے نتیجہ سمجھ کر علم فقہ کے میدان میں قدم رکھا اس وقت آپؒ کی عمر تیس سال تھی۔

اساتذہ: مشہور فقیہ حمادؒ بن ابی سلیمان (م۔۱۲۰ھ) سے فقہ کی تکمیل کی اور جلد ہی فقہی دنیا میں نام پیدا کر لیا۔ امام ابراہیم نخعیؒ (م۔۹۵ھ) جو تابعی ہیں حمادؒ کے استاد تھے۔ امام ابوحنیفہؒ ...... بقول امام شاہ ولی اللہ دہلوی...... امام

ابراہیم نخعیؒ کے علم وفضل اور فقہی کمالات کے معترف اور مداح تھے اور انہی سے زیادہ متأثر بھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں: امام محترمؒ کی طرف منسوب فقہی مذہب کا اصل مأخذ امام ابراہیم نخعیؒ اور ان کے معاصرین کے افکار ہیں۔ امام صاحبؒ تخریج کی تمام صورتوں کی ممکنہ باریکیوں کو بخوبی جانتے تھے، فروع کی طرف بھی آپؒ کا کامل رجحان تھا۔ امام مالکؒ سے عمر میں گو بڑے تھے لیکن ان کے حلقہ درس میں بیٹھ کر ان سے بھی کچھ احادیث سنیں۔ امام جعفر صادقؒ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ محبِ اہل بیت تھے اور اس سلسلہ میں قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ فن فقہ کے شناور تھے۔

ایک نکتہ: امام محترم کی ذات علم کا ایک پہاڑ، امام وقت اور فقاہت کے منصب جلیلہ کے مقام پر فائز تھی۔ تقریباً تمام ائمہ فقہاء نے امام عالی مقام کو فقہاء کا سرخیل تسلیم کیا ہے۔ مگر ایک سوال کا جواب ہمیں اس وقت تک معلوم نہیں ہوسکتا جب تک ہم امام محترمؒ کے شاگردوں کی فقہی کاوشوں اور اصولوں کو نہ پڑھ لیں۔ سوال یہ ہے۔ کہ امام محترمؒ کی نہ کوئی کتاب ہے اور نہ ہی ان کے تفسیر وحدیث اور فقہ واصول فقہ میں کوئی علمی اقوال الا ماشاء اللہ، حتی کہ شاہ ولی اللہ محدثؒ کے بقول کہ:

> آں یک شخصے است کہ رؤس محدثین مثل احمد، وبخاری، ومسلم، وترمذی، وابوداؤد، ونسائی، وابن ماجہ، ودارمی یک حدیث از وے در کتابہائے خود روایت نکردہ اند۔ ورسم روایت حدیث از وے بطریق ثقات جاری نشد۔ المصفی:٦۔ امام محترم ہی واحد شخصیت ہیں جن سے بڑے بڑے ائمہ حدیث جیسے امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ اور امام دارمی رحمہم اللہ میں سے کسی نے اپنی کتاب میں ایک حدیث بھی روایت نہیں کی اور نہ ہی روایت حدیث کے میدان میں ان کوئی ثقہ سند چل سکی۔

پھر امام محترم کا یہ فقہی مقام اس قدر عظیم کیوں؟ اس کا جواب یہی ہے کہ امام محترمؒ کے خاص شاگردوں نے ان کی فقہی فروعات کی مہارت کا بھرپور اندازہ لگایا انہیں ازبر کیا۔ انہی سے اصول وضع کیے اور فروعات نکالیں جسے عمل تخریج کہا جاتا ہے اس لئے ان کی نسبت امام محترمؒ کی طرف کی اور مجموعی نقطہ نظر کو انہوں نے فقہ حنفیہ کا اور خود کو احناف کا نام دیا جو ان کا حسن ظن تھا اگر امام محترمؒ آج زندہ ہوتے تو ان کا جواب بھی یہی ہوتا۔

تلامذہ: آپ کے شاگردوں میں قابل ترین شاگرد امام ابو یوسفؒ تھے جو بعد میں ہارون الرشید کے زمانہ میں چیف جسٹس بھی رہے انہوں نے اپنے استاد محترم کے نہ صرف افکار وخیالات وعلمی کمالات کو ہر اہم فیصلہ ومقام پر ترجیح دی

بلکہ انہیں قلمبند کر کے بام عروج تک پہنچایا۔ اور یوں ایک قول زبان زد عام ہوا: لَوْلَا أَبُویُوسُفَ لَمَا ذُکِرَ أَبُوحَنِیفَةَ۔ اگر امام ابو یوسفؒ نہ ہوتے تو امام ابوحنیفہؒ کا کوئی ذکر ہی نہ کرتا۔ (وفیات الأعیان) ایک اور قابل قدر شاگرد امام محمدؒ بن الحسن الشیبانی تھے۔ جنہوں نے گو امام محترم کے ساتھ بہت تھوڑا وقت گذارا کیونکہ جب امام محترمؒ فوت ہوئے تو ان کی عمر پندرہ سال تھی۔ بہت کم عمری میں انہیں صاحب ابی حنیفہؒ کے لقب سے ملقب کرنا متاخر فقہاء احناف کا اعزاز ہے۔ مگر اپنے شیخ محترم کے فقہی واجتہادی فروعات سے متفق اور ان کی وضاحت ودفاع کے لئے ضخیم کتب کے مصنف تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کے حالات زندگی پر ایک جامع وبے لاگ تبصرہ امام خطیب بغدادیؒ (م:۴۶۲ھ) نے اپنی مشہور کتاب تاریخ بغداد میں غالباً سب سے پہلے لکھا ہے جو ایک قدیم ترین مصدر ہے۔ باقی سب انہیں کے خوشہ چیں ہیں یا ناقد ومداح۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حجة الله البالغه میں فرماتے ہیں:

ان دونوں تلامذہ نے امام مرحوم کے مسائل کو اس توضیح وتفصیل سے لکھا اور ہر مسئلہ پر استدلال وبرہان کے ایسے حاشیے اضافہ کئے کہ انہی کا رواج عام ہو گیا اور اصل مآخذ سے لوگ بے پروا ہو گئے۔

فقہ حنفی کے اصول: یہ وہ اصول ہیں جن کی نسبت امام محترمؒ کی طرف کی جاتی ہے۔ گو ان کی سند میں کلام ہے:

أَخُذُ بِکِتَابِ اللّٰهِ إِذَا وَجَدْتُهُ، فَمَا لَمْ أَجِدْهُ فِیهِ أَخَذْتُ بِسُنَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَالآثَارِ الصِّحَاحِ عَنْهُ الَّتِی فَشَتْ فِی أَیْدِی الثِّقَاتِ، فَإِذَا لَمْ أَجِدْ فِی کِتَابِ اللّٰهِ وَلَا سُنَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ أَخَذْتُ بِقَوْلِ أَصْحَابِهِ مَنْ شِئْتُ، وَأَدَعُ قَوْلَ مَنْ شِئْتُ، ثُمَّ لَا أَخْرُجُ عَنْ قَوْلِهِمْ إِلَی قَوْلِ غَیْرِهِمْ. فَإِذَا انْتَهَی الأَمْرُ إِلَی إِبْرَاهِیمَ وَالشَّعْبِیِّ وَابْنِ الْمُسَیَّبِ وَالْحَسَنِ وَعَطَاءٍ فَلِیَ أَنْ أَجْتَهِدَ کَمَا اجْتَهَدُوا۔ میں سب سے پہلے کتاب اللہ کو لیتا ہوں اگر اس میں مسئلہ نہ ملے تو پھر سنت رسول ﷺ سے لیتا ہوں۔ اور ان آثار صحیحہ پر عمل کرتا ہوں جو ثقہ راویوں کی روایت سے شائع وذائع ہیں۔ اگر سنت نبوی سے بھی نہ ملے تو صحابہ کرام کے اقوال میں سے کسی ایک کے قول کو لے لیتا ہوں۔ لیکن جب معاملہ ابراہیم شعبی، ابن المسیب، حسن، عطاء تک پہنچتا ہے تو میرا بھی حق بنتا ہے کہ میں بھی اجتہاد کروں جس طرح انہوں نے کیا۔ الانتقاء لابن عبدالبر:۱۴۲

ابن عبدالبرؒ کی اس روایت کی سند میں گو کلام ہے مگر اس سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ امام محترمؒ کے اصول، معاصر اصولوں سے مختلف نہ تھے ہاں فہم اپنا اپنا تھا۔ اسی طرح دیگر بہت سے اصول بھی ہیں جنہیں امام بزدویؒ نے اور محب اللہ بن عبدالشکور (م ۱۱۱۹ھ) نے مسلم الثبوت میں بیان کئے ہیں۔ جو بالاختصار ذیل میں دیئے جاتے ہیں:

کتاب اللہ: سب سے اولین حیثیت قرآن مجید کی ہے۔ فقہی استنباط اگر قرآن پاک سے ہو سکتا ہے تو

سر آنکھوں پہ ورنہ سنت رسول کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

سنت رسول اللہ: سنت رسولؐ دوسرے نمبر پر ہے جس میں خصوصاً خبر واحد کی قبولیت کے لئے چند ذیلی شرائط ہیں:

...... خبر واحد کو قبول کرنے سے قبل عمومات قرآن اور ظواہر پر پیش کیا جائے گا اگر یہ خبر قرآن کے کسی عام یا ظاہر کی مخالفت کرتی ہو تو قرآن کو لیا جائے گا اور خبر (حدیث) کو رد کر دیا جائے گا کیونکہ قرآن قطعی الثبوت ہے اور اس کے ظواہر و عمومات بھی قطعی الدلالہ ہیں مگر یہ آحاد قرآن پر اضافہ ہیں اور ناسخ بھی بنتی ہیں اس لئے قرآن کا نسخ، اخبار آحاد سے نہیں ہو سکتا۔

...... خبر واحد اس صورت میں بھی قبول کی جاسکتی ہے جب وہ اپنی اصل کے اعتبار سے خبر واحد ہی ہو لیکن بتدریج اس قدر پھیل جائے کہ اسے اتنے لوگوں نے نقل کیا ہو جن کے جھوٹ بولنے پر اتفاق کا گمان نہ کیا جا سکتا ہو۔ یہ لوگ صحابہ و تابعین کے بعد دوسری صدی کے لوگ ہیں۔ اگر ائمہ کرام ان کی روایت کو ذکر کرتے ہیں تو ان کا مرتبہ بلند ہو جاتا ہے اور سنت مشہورہ قرار پاتی ہے۔ اس طرح کبھی کبھی مشہور کا اطلاق ان روایات پر بھی ہوتا ہے جو مطلق طور پر لوگوں کی زبانوں پر مشہور ہو گئی ہو۔ اس صورت میں وہ تواتر کی دو اقسام میں سے ایک قسم ہو گی جس سے علم طمانینت بھی حاصل ہوتا ہے اور بعض کے نزدیک علم یقین بھی۔

...... حدیث آحاد کو اس وقت قبول نہ کیا جائے جب اس کا راوی غیر فقیہ ہو اور وہ قیاس کے خلاف ہو۔

...... وہ خبر واحد ایسی نہ ہو جس کا تعلق بلوائے عامہ سے ہو یعنی وہ کسی ایسے مشہور واقعہ کے بارے میں ہو جو سب کے سامنے ہوا ہو پھر بھی لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے اسے روایت نہ کیا ہو۔

اجماع: احناف نے اسے تیسرے درجے میں بیان کیا ہے۔ لیکن خبر واحد کے صحیح ہونے کے باوجود بھی اجماع کی حیثیت کے بڑھنے کے وہ قائل ہیں۔

قیاس۔ ان چار مآخذ کے علاوہ کچھ ذیلی مآخذ بھی فقہ حنفی میں شامل ہیں جن میں استحسان اور حیل بھی ہیں۔ ان حیلوں کو اَلْمَخَارِجُ مِنَ الْمَضَایِقِ کہا جاتا ہے۔ یعنی تنگی کی صورت میں اس مسئلے سے نکلنے کی کون کون سی راہیں اور حیلے ہیں۔

فقہ حنفی کی مشہور کتب:

اقسام و تعارف: فقہ حنفی کی وہ کتب جو اساسی حیثیت رکھتی ہیں ان کی دو اقسام ہیں۔

۱۔ متون ۲۔شروح

متون: متاخر فقہاء کرام کی یہ اصطلاح ہے۔ یہ متون بہت مختصر ہیں جن میں صرف امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے اقوال درج ہیں۔ انہی اقوال یا کتب کو ظاہر الروایہ کہتے ہیں۔ ان میں امام ابو یوسفؒ کی گراں قدر کتاب الخراج ہے جس میں محصولات اور حکومت کے امور مالیات پر بحث کی گئی ہے۔ اور امام محمدؒ کی کتب المبسوط، الجامع الکبیر، الجامع الصغیر، السیر الکبیر، السیر الصغیر اور الزیادات ہیں۔ ان دونوں ائمہ کی یہ سب کتب متون کہلاتی ہیں۔ کتب ظاہر الروایہ کو بہت عرصہ بعد ایک حنفی عالم اور فقیہ حاکم الشہیدؒ نے اپنی معروف کتاب الکافی میں یکجا کیا جو اہل فن کے لئے ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ دیگر متقدمین کے متون جو معتبر خیال کئے جاتے ہیں ان میں علامہ طحاویؒ، امام کرخیؒ وحاکم شہید محمد بن محمد المروزیؒ (م:۳۳۴ھ) کی مختصرات ہیں۔ اسی طرح متاخرین سے امام قدوریؒ کی المختصر فقہ حنفی کا مقبول ترین متن ہے۔ پھر البدایة، النقایة، المختار ہے۔ هدایة، المختصر اور بدایة المنتهی کی شرح ہے۔ تاج الشریعہ محمود بن احمدؒ (م:۷۰۰ھ) کی الوقایة کا متن هدایة سے منتخب شدہ ہے۔ جس کی شرح ان کے پوتے نے لکھی جو مشہور درسی کتاب ہے۔ اسی طرح کنز الدقائق کا متن بھی بہت زیادہ مقبول ومشہور ہے۔ ان متون نے چونکہ ظاہر الروایہ کتب اور معتمد اقوال کو نقل کیا ہے اس لئے یہ معتبر متون شمار کئے جاتے ہیں۔

شروح: دوسری کتب، کتبِ شروح کہلاتی ہیں جن میں کتب متون کی شرح لکھی گئی ہے۔ شرح کی کتب متون سے بعد کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس لئے کہ ان میں متاخر مشائخ کے اپنے اقوال واختیارات ہیں جن کے موافق انہوں نے فتوے دیے۔

مسائل النوادر: امام محمدؒ کی دوسری کتب کا نام ہے جنہیں غیر ثقہ راویوں نے روایت کیا ہے۔ ان میں أمالی محمد، کیسانیات، جرجانیات، کتاب المخارج فی الحیل اور زیادة الزیادة شامل ہیں۔

حاشیہ. اسی طرح علامة الشام ابن عابدینؒ (۱۲۵۲ھ) کا حاشیہ ہے۔ جس کا نام رد المختار علی الدر المختار ہے جو حنفی مذہب کی تمام تر تحقیقات اور ترجیحات کا خلاصہ ہے۔ فتاوی میں فتاوی عالم گیری کو ہندو پاک میں جو مقام مل سکا دنیا کے دوسرے خطوں میں اسے وہ مقبولیت اور علمی حیثیت نہ مل سکی۔

نمایاں خدوخال:

☆۔ علماء احناف کی آراء:

پہلی رائے: امام محترمؒ سے منسوب یہ فقہ اگرچہ عام طور پر فقہ حنفی کہلاتی ہے لیکن درحقیقت وہ چار شخصوں یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام زفرؒ بن ہذیل (۱۱۰۔۱۵۸)، قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ بن حسن الشیبانی (۱۳۲۔۱۸۹) کی آراء کا مجموعہ ہیں۔ قاضی ابو یوسفؒ، و امام محمدؒ نے بیشتر مسائل میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ فقہاء احناف کی اکثر مرویات میں ہے کہ ان صاحبوں کو اعتراف تھا کہ ہم نے جو اقوال امام ابوحنیفہؒ کے خلاف کہے وہ بھی امام ابوحنیفہؒ ہی کے اقوال ہیں کیوں کہ بعض مسئلوں میں امام ابوحنیفہؒ نے متعدد اور مختلف آراء ظاہر کی تھیں۔

دوسری رائے: یہ ان فقہاء کا حسن ظن ہے، قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ اجتہاد مطلق کا درجہ رکھتے تھے اور انہیں اختلاف کا پورا حق حاصل تھا۔ اسلام ترقی پذیر اس وقت تک رہا جب تک لوگ باوجود حسن عقیدت کے اپنے بزرگوں، اور اساتذہ کی رائے سے اختلاف کرتے تھے اور خیالات کی ترقی محدود نہ تھی۔ یہ لوگ ہر سابقہ حکم اور فیصلہ کو بعد کے فیصلہ اور حکم کی روشنی میں پڑھتے، سمجھتے اور اس پر عمل کیا کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک قانون کی تعبیر وتشریح کا یہ وہ اصول ہے جس کو نہ صرف اسلامی قانون بلکہ آج بھی دنیا کے سارے ہی قوانین تسلیم کرتے ہیں۔ محدثین کا کہنا ہے کہ ان چاروں میں امام ابو یوسفؒ سب سے زیادہ متبع حدیث ہیں۔

تیسری رائے: فقہ حنفی کے احکام ومسائل ادلہ شرعیہ سے ان اصول اور قواعد سے ماخوذ ومستنبط ہیں جو امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں نے وضع کئے۔ فقہ حنفی کا ایک عام قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ مسائل کے جواز وعدم جواز یا اس کے صحیح یا غلط ہونے میں ائمہ احناف کے مابین آراء کا اختلاف نظر آتا ہے یعنی اگر امام ابوحنیفہؒ کسی چیز کو جائز قرار دیتے ہیں تو ان کے شاگرد اسے ناجائز گردانتے ہیں۔ ایسی صورت میں متأخر ائمہ احناف نے ان اختلافی اقوال میں ترجیح کے کچھ اصول بیان فرمائے ہیں جو فقہ حنفی کی حفاظت کے لئے ان کی ایک اجتہادی کوشش ہے اور حنفی نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے بہت اہم بھی۔

چوتھی رائے: یہ بات علماء احناف کے ہاں طے شدہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے جو فقہ کے اصول وضع کیے تھے تمام حنفی فقہاء ان کے پابند تھے اور آج بھی ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کی رائے میں کوفہ کے اصحاب کی روایات، ان کے فتاوی

اوران کے قیاسی مسائل ہی قابل اعتماد ہیں۔انہی اصولوں کو سامنے رکھ کر فقہی مسائل کی وقت کے ساتھ ساتھ تدوین کی گئی اور تخریج بھی۔اس لئے اگر امام ابوحنیفہؒ اوران کے شاگردوں کے مابین اختلاف رائے ہو تو اس صورت میں کس کی بات قبول کی جائے گی اور کس کی بات غیر مقبول ٹھہرے گی؟ اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً بتدریج حسب ذیل اصولوں اور ضابطوں کو متعارف کرایا گیا جو مختلف اصولی وفقہی کتب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

ضابطے:

......اگر امام ابوحنیفہؒ اوران کے دونوں شاگردوں یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کسی مسئلہ میں متفق الرائے ہیں تو بعد کے مفتی حضرات اسی اتفاقی قول کے مطابق ہی فتویٰ دیں گے۔

......اور اگر ان کے مابین اختلاف ہے تو بعض ائمہ احناف کے نزدیک سب سے اولین حیثیت امام ابوحنیفہؒ کے قول کی ہوگی ورنہ امام ابو یوسفؒ کی۔ان کے بعد امام محمدؒ، پھر امام زفرؒ اور پھر امام حسنؒ بن زیاد کے قول پر فتوی ہوگا۔

......بعض فقہائے احناف کے ہاں اگر امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ دونوں کی رائے یا مسئلہ امام ابوحنیفہؒ کی رائے یا مسئلہ کے خلاف ہے تو مفتی کو اختیار ہے کہ وہ امام صاحب یا دونوں شاگردوں میں سے جس کو چاہیں ان کے قول پر فتوی دے دیں۔اگر مفتی مجتہد نہیں تو مناسب یہی ہے کہ اولاً امام صاحب کو رکھے پھر امام ابو یوسفؒ کو، پھر امام محمدؒ کو، پھر امام زفرؒ کو اور پھر امام حسن بن زیادؒ کو۔(فتاویٰ سراجیہ)

......رد المحتار جو فقہ حنفی کی ایک معتبر کتاب ہے اس کی ج ۱ص ۵۳، اور ج ۲ ص ۴۰۵ میں مرقوم ہے:

> مسائل میں اگر امام ابوحنیفہؒ اوران کے شاگردوں کے مابین اختلاف ہو تو پھر فقہاء احناف کے نزدیک عبادات میں ہمیشہ فتوی امام ابوحنیفہؒ کے قول پر ہوگا اور مسائل ذوی الارحام میں امام محمدؒ کے قول پر۔جب کہ وقف، قضاء، مواریث اور شہادات کے مسائل میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر اور سترہ مسئلوں میں امام زفرؒ کے قول پر فتوے ہوگا۔مفتی کے لئے درجہ بالا اصول ہی پیش نظر رہیں گے۔

مگر امام صباغیؒ حنفی اس کے خلاف ہیں اسی کتاب کی ج ۱ص ۱۶۱ میں ہے:

> وہ نماز میں صرف امام ابوحنیفہؒ کے قول پر فتوی دیا کرتے تھے اور دیگر مسائل خواہ عبادات ہوں یا غیر عبادات سب میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔

☆ **تلفیق**: تلفیق کا اہم مسئلہ کتب فقہ میں زیر بحث آیا ہے۔طلبہ دین اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔جس سے مراد ہے کہ کیا ایک مذہب کا عام وخاص شخص دوسرے مذہب کے مسائل اختیار کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس عمل کو فقہاء

تلفیق کہتے ہیں۔احناف کے ہاں اس کی دو قسمیں ہیں۔تلفیق مذموم اور تلفیق محمود۔

① **تلفیق مذموم**: دوسرے مذہب کی باتیں اختیار کرنے میں اگر نیت صرف سہولتوں کی تلاش ہو۔یعنی ہر مذہب سے اپنی خواہش کے مطابق مسائل وجواز لے لیا جائے تو ایسا کرنا یقیناً قابل مذمت ہے۔مثلاً: غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا یا رمضان مبارک میں فجر کی نماز اول وقت میں پڑھنا۔

② **تلفیق محمود ومطلوب**: جب نیت ومقصد محض حق کی تلاش اور نصوص شریعت کی بالا دستی قائم کرنا ہو اور عوام کو آسانی فراہم کی جائے تو ایسی تلفیق عین مطلوب ہے مثلاً: کوئی حنفی شخص اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دیتا ہے۔ ایسی طلاق فقہ حنفی میں تین طلاقیں ہی شمار ہوتی ہیں جو بیوی کو شوہر پر حرام کر دیتی ہیں۔شوہر اگر اپنی غلطی پر نادم ہو اور بیوی کو دوبارہ آباد کرنا چاہتا ہو تو فقہ حنفی ہی اسے یہ سجھاتی ہے کہ اپنی بیوی کا حلالہ کرائے۔تاکہ وہ اس کے لئے حلال ہو سکے۔دوسری طرف زوجین اسے ایک غیرت کا مسئلہ بناتے اور ناپسند کرتے ہیں۔ایسی صورت میں فقہ حنفی کو چھوڑ کر اس حدیث پر عمل کر لیا جائے جو رسول اکرم ﷺ نے خود ایسے جوڑے کو آباد کرنے کا فرمایا تھا۔کہ ایسی تین طلاقیں ایک طلاق شمار ہوگی اور رجعی ہوگی شوہر اپنے بیوی سے عدت کے اندر اگر رجوع کر لیتا ہے تو بغیر نکاح کے اس کا یہ حق ہے اور بعد از عدت رجوع کی صورت میں دوبارہ نکاح ہوگا۔مگر حلالہ کرنے اور کروانے والوں پر آپ ﷺ نے لعنت فرمائی۔ایسی صورت میں اگر کوئی حق کو پانے کے لئے اپنے مسلک سے نکل کر کسی اور مذہب کے آسان حل کی طرف جانا چاہتا ہو تو امام ابوحنیفہؒ اس کے جواز کے قائل ہیں۔

حَكَى الْحَنَّاطِيُّ وَغَيْرُهُ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ فِيمَا إِذَا اخْتَارَ مِنْ كُلِّ مَذْهَبٍ مَا هُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ، أَنَّهُ يُفَسَّقُ بِهِ۔ وَعَنْ أَبِي حَنِيفَةَ: لَا يُفَسَّقُ بِهِ۔ امام حناطی اور دیگر علماء نے ابواسحاق سے یہ بیان کیا ہے کہ ہر مذہب سے اگر آسانی کے لئے کچھ اختیار کرلے تو وہ گناہ گار ہوگا۔امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: وہ ایسا کرنے سے گناہ گار نہیں ہوگا۔

صرف رخصتیں تلاش کرنا بھی امام صاحبؒ کے نزدیک جب فسق نہیں تو نصوص شریعت کی بالا دستی اور عوام کی سہولت کے نقطہ نظر سے مختلف مذاہب کی باتیں اختیار کرنا کیسے غلط ہوگا۔ہر دور میں ایسا ہوا ہے۔برصغیر میں حنفی علماء نے زوجہ مفقود الخبر کے بارے میں حنفی فقہ کی بجائے فقہ مالکی کا مسلک اپنایا ہے۔اور اسے بجائے نوے سال کا انتظار کرنے کے چار سال کے انتظار کا کہا ہے۔پھر چار ماہ دس دن عدت گذار کر اسے نکاح کرنے کی اجازت دی

ہے۔ ایسے مسائل کے لئے عصر حاضر میں فقہی جمود کی نہیں بلکہ فقہی توسع کی ضرورت ہے۔ امام طحاویؒ قاضی کے آداب میں امام محمدؒ کا ارشاد گرامی ذکر فرماتے ہیں:

وَإِنْ كَانَ إِنَّمَا قَضَى بِهِ بِتَقْلِيدِ الْفَقِيهِ بِعَيْنِهِ، ثُمَّ تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّ غَيْرَهُ مِنْ أَقْوَالِ الْفُقَهَاءِ أَوْلَى مِمَّا مَضَى بِهِ، نَقَضَهُ، وَقَضَى بِمَا يَرَاهُ فِيهِ، وَبِهِ نَأْخُذُ۔ وَلَا يَنْبَغِي لَهُ أَنْ يَنْقُضَ قَضَاءَ مَنْ تَقَدَّمَهُ مِنَ الْقُضَاةِ إِذَا كَانَ مِمَّا يَخْتَلِفُ فِيهِ الْفُقَهَاءُ۔ اگر قاضی نے کسی معین فقیہ کی تقلید میں فیصلہ کیا۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ کسی دوسرے فقیہ کا قول اس سے بہتر ہے تو اسے چاہئے کہ پہلا فیصلہ توڑ کر صحیح فیصلہ کرے۔ امام طحاویؒ فرماتے ہیں: ہم بھی اس کے قائل ہیں۔ لیکن قاضی متقدمین فقہاء کے اس فیصلہ کو توڑ نہیں سکتا جس میں فقہاء کا اختلاف ہو۔ (مختصر الطحاوی ص ۳۲۷)

مگر اس گنجائش کو سختی کی نذر فقہاء کرام نے نہیں کیا۔ بقول صاحب شرح مسلم الثبوت:

شَدَّدَ بَعْضُ الْمُتَكَلِّمِينَ، قَالُوا: "اَلْحَنَفِيُّ إِذَا تَرَكَ مَذْهَبَ إِمَامِهِ يُعَزَّرُ"، وَالْحَقُّ أَنَّهُ تَعَصُّبٌ، لَا دَلِيلَ عَلَيْهِ، وَإِنَّمَا هُوَ تَشْرِيعٌ مِنْ عِنْدِ نَفْسِهِ۔ قَالَ فِي التَّيْسِيرِ شَرْحِ التَّحْرِيرِ: "هُوَ الْأَصَحُّ، إِذْ لَا وَاجِبَ إِلَّا مَا أَوْجَبَهُ اللّٰهُ، وَبِالْجُمْلَةِ لَا يَجِبُ تَقْلِيدُ مَذْهَبٍ مُعَيَّنٍ، بَلْ جَازَ الْإِنْتِقَالُ۔ لَكِنْ لَابُدَّ أَنْ لَا يَكُونَ ذٰلِكَ قَصْدَ التَّلَهِّي وَتَوهِينِ كِبَارِ الْمُجْتَهِدِينَ۔" کچھ متکلمین اہل علم نے شدت سے کام لیا اور کہہ دیا: ''حنفی اگر اپنے امام کے مذہب کو ترک کر دے تو اسے تعزیر (کوئی سزا) دی جائے۔'' سچ پوچھیں تو یہ متعصبانہ بات ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ بلکہ اپنی طرف سے شریعت سازی ہے۔ "التیسیر" میں ہے: ''بالکل یہ تعصب ہے کیونکہ واجب وہی ہے جسے اللہ نے واجب قرار دیا، (ہم کون ہوتے ہیں تقلید کو واجب کرنے والے، اور اس کے ترک پر تعزیر دینے والے) بہر حال کسی مذہب معین کی تقلید واجب نہیں۔ بلکہ ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف مسئلہ کی تلاش میں جانا بھی جائز ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ایسا کرنا محض خواہش نفس کی بنیاد پر نہ ہو اور نہ ہی مجتہدین کرام کی توہین مقصود ہو۔

ان اصولوں کو دیکھ کر ایک معتدل قاری یہ ضرور باور کرتا ہے کہ متقدم علماء احناف حریت فکر کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک تلفیق کرنا نعوذ باللہ یہودیوں یا عیسائیوں سے کوئی بات لینا نہ تھا اور نہ ہی اس کی اجازت لینا تھا۔ بلکہ دین کے یہ سب ممتاز علماء ہی تھے جن کے علم سے مستفید ہونا مقصود تھا۔ ممتاز ترین شاگرد بھی باوجود مجتہد فی المذہب ہونے کے متعدد مسائل میں شیخ سے مختلف رائے رکھتے تھے جو ان کی باکمال وسعت کا مظہر ہے۔

تلفیق کے مسئلے کو اس مثال سے سمجھئے کہ کسی مرض کے علاج کے لئے کوئی فیملی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ وہ مریض کو آپریشن کا مشورہ دیتا ہے یا تجویز دیتا ہے۔ مریض آپریشن سے ڈر جاتا ہے اور Second Opinion کے لئے کسی دوسرے Specialist کے پاس جاتا ہے۔ یہ دوسرا معالج مرض کی نوعیت کو سمجھنے کے بعد یہ تجویز کرتا ہے کہ آپریشن کی

ضرورت نہیں ہے یہ دوا لے لیں۔ اس صورت میں مریض دوسرے معالج کی رائے ہی کو ترجیح دے گا اور دینی چاہئے۔ یہ خواہش پرستی نہیں اور نہ ہی نیت کی خرابی ہے۔

فقہ حنفی کی چند اصطلاحات:

مفتیٰ بھا: ہر دور میں پیش آمدہ مسائل پر تخریج، فقہ حنفی کی ضرورت رہی ہے اور رہے گی۔ فروع اور چند اصولوں کی بنیاد پر کی گئی یہ کوششیں اصحاب تصحیح اور اصحاب تخریج کی ذمہ داری ٹھہری۔ چنانچہ جو نئے فروعی یا مفروضہ مسائل ان اصحاب کی نظر سے گذرے وہ مفتیٰ بہا کہلائے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ اب علماء احناف کا فتوی ان مسائل پر ایسا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ تخریج جیسی وسعت ہوتے ہوئے پھر تقلید پر اصرار بے معنی سی بات لگتی ہے۔ مفتیٰ بہا مسائل کو ایک طالب علم و عام قاری کس طرح جانے؟ اس کے لئے الگ فقہی کتب کا ہونا بہت ضروری ہے ورنہ جہالت میں نامعلوم کتنے لوگ کسی بھی فقہی کتاب کو پڑھ کر اس سے مسائل کی تفہیم شروع کر دیتے ہیں جو خالصتاً غیر علمی کوشش ہوگی۔ اسی طرح آج کے مسائل کے لئے اصحاب تصحیح و ترجیح کون ہیں جن کے فتاوی وغیرہ کو مفتیٰ بہا کہا جا سکے اس کی وضاحت کی بھی ضرورت ہے۔

ظاہر الروایہ: عام طور پر اس سے ائمہ احناف امام ابوحنیفہؒ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے اقوال مراد ہیں۔

الإمام: سے مراد امام ابوحنیفہؒ ہیں۔

الشیخان: مراد امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ ہیں۔

الطرفان: اس سے مراد امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ ہیں۔

صاحبان: سے مراد امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ ہیں۔

أصحابنا: مشہور یہی ہے کہ اس سے مراد تینوں ائمہ کرام ہیں۔ انہیں ائمہ ثلاثہ بھی کہہ دیتے ہیں۔

مشائخ: وہ فقہاء جنہوں نے امام محترمؒ کا زمانہ نہ پایا۔

سلف: اس سے مراد صدر اول کے فقہاء جو امام محمدؒ بن الحسن تک ہیں۔ خلف سے امام محمدؒ تا شمس الأئمہ الحلوائیؒ تک ہیں اور متاخرون سے مراد۔ الحلوانی تا حافظ الدین بخاریؒ تک ہیں۔ (حاشیہ ابن عابدین ۱۶۲/۷)

فقہاء احناف اور ائمہ کے مابین اختلاف کی صورتیں: علامہ ابوزید الدبوسی (م:۴۳۰ھ) نے اپنی کتاب تَأْسِیْسُ النَّظَرِ میں ائمہ احناف اور دیگر فقہاء کے مابین اصولی اختلافات کی متعدد صورتیں بیان فرمائی ہیں جن میں

چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین میں اختلاف

۲۔ امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ میں اختلاف

۳۔ امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ میں اختلاف

۴۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے مابین اختلاف

۵۔ امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، حسن بن زیادؒ اور امام زفرؒ میں اختلاف

۶۔ احناف اور امام مالکؒ میں اختلاف

۷۔ احناف اور امام ابن ابی لیلیٰؒ میں اختلاف

۸۔ احناف اور امام شافعیؒ میں اختلاف

علامہ دبوسیؒ نے ان اصولوں کا بھی ذکر کر دیا ہے جو ان ائمہ کے مابین اختلاف کا سبب بنے۔ بعد کے فقہاء اور علماء کے مابین اصولی اختلاف نظر نہیں آتا بلکہ سطحی سا محسوس ہوتا ہے۔ مفقود الخبر کا مسئلہ ہو یا وضوء کا، یا فقہی کتب میں وارد دیگر مسائل ہوں، یہ سب کچھ اختلاف برائے اختلاف نہ تھا بلکہ برائے وسعت تھا۔ کتاب الحیلة الناجزة میں مؤلف مرحوم نے کھلے دل سے اس کا اعتراف کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی بھرپور جزا دے۔ آمین۔ مگر متاخر تلامذہ نے عوام کے فعل وعمل کی ذمہ داری اٹھا کر بعض مسائل متعارف کرائے اور ان کی طرف سے ترجمانی بھی کی اور انہیں اختلافی مسائل بھی کہا۔ جب کہ ان مسائل میں ائمہ فقہاء کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ مثلاً: زبان سے نیت کے مسئلے میں بعض متاخر علماء کا یہ کہنا کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ حالاں کہ نیت کا تعلق زبان سے نہیں بلکہ دل سے ہے۔ اور ائمہ اربعہؒ اس پر متفق ہیں۔

وفات: خلافت اموی کے بعد علویوں اور عباسیوں کے مابین جو سیاسی وانتقامی آگ بھڑکی تو امام محترمؒ نے اس موقع پر محمد نفس ذکیہ کے بھائی ابراہیم کا مالی، سیاسی اور اخلاقی ساتھ دیا۔ ان کی ہمت بندھائی اس لئے کہ امام محترم عباسیوں کی ابتدائی بے اعتدالیوں کو دیکھ کر مسلمانوں کے مستقبل سے خائف تھے۔ عباسی خلیفہ منصور نے بغداد کو اپنا مرکز بنا کر ان اکابرین پر ہاتھ ڈالا جن کا مسلم دنیا پر ایک اثر تھا اور سیاسی طور پر وہ مخالف بھی تھے۔ امام محترم کے بارے میں اسے علم تھا کہ انہوں نے ابراہیم کا ساتھ دیا ہے۔ انہیں بلا بھیجا۔ گفتگو کے دوران اس نے عہدہ قضاء تجویز

کیا جسے امام محترم نے رد کر دیا۔ اور کہا کہ میں اس کی اہلیت نہیں رکھتا وجہ یہ بتائی کہ مجھے اپنی طبیعت پر اطمینان نہیں، نہ ہی میں عربی النسل ہوں اس لئے اہل عرب کو میرا قاضی بننا ناگوار ہوگا۔ درباریوں کی مجھے تعظیم کرنا پڑے گی اور یہ سب کچھ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ منصور نے غصہ میں آ کر کہا: تم جھوٹے ہو۔ امام محترمؒ نے فرمایا: آپ نے خود ہی میرے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ پھر جھوٹا آدمی کیسے قاضی بن سکتا ہے۔ مگر پھر بھی منصور نہ مانا اور قسم کھا کر کہا کہ تمہیں یہ عہدہ قبول کرنا ہوگا۔ امام محترم نے بھی قسم اٹھالی کہ ہرگز قبول نہیں کروں گا۔ اس جرات وبے باکی پر اہل دربار حیران رہ گئے۔ ربیع جو حاجب منصور تھا اس نے غصہ سے کہا: ابوحنیفہ! تم امیر المومنین کے مقابلہ میں قسم کھاتے ہو؟ امام محترمؒ نے جواب میں فرمایا: جی ہاں! اس لئے کہ امیر المومنین کو قسم کا کفارہ ادا کرنا میری نسبت زیادہ آسان ہے۔

خلیفہ منصور نے امام محترمؒ کو جیل بھجوادیا۔ یہ سن ۱۴۶ھ تھا مگر خلیفہ منصور، امام محترم کی وجیہ علمی شخصیت سے بہت متاثر تھا اور خوف زدہ بھی۔ بغداد ویسے بھی علوم وفنون کا مرکز بن چکا تھا۔ علماء کی آمد ورفت اور اس کے اہل دین پر اثرات ایک بہت بڑی قوت ثابتہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے آخری تدبیر پھر یہی کی کہ امام محترم کو بے خبری میں زہر دلوادیا۔ امام محترمؒ کو جب علم ہوا تو بارگاہ الٰہی میں سجدہ شکر بجالائے اور اسی عالم میں جان، فرشتہ اجل کے حوالے کی۔ اور یوں منصور کی قید کے بعد قید حیات سے بھی چھوٹ گئے۔

امام محترمؒ کی وفات کی خبر شہر میں پھیلی تو پورا شہر غم واندوہ میں ڈوب گیا۔ چھ بار نماز جنازہ پڑھی گئی۔ پہلی نماز جنازہ میں کم وبیش پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ بغداد کے خیزران نامی مقبرے میں عصر کے قریب جا کر تدفین عمل میں آسکی۔ اور یوں علم فقہ کا یہ آفتاب اپنی حیات میں امت مسلمہ کو ایک نئی، منفرد فقہی، استدلالی اور اجتہادی جہت دے کر رخصت ہو گیا۔

ایک تحقیق طلب معاملہ: امام ابوحنیفہؒ بلاشبہ اپنے وقت کی ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ جن کی فکر کو ان کے شاگردوں نے بڑی عرق ریزی اور محنت کے بعد منظم ومربوط کیا۔ جو ان کی پہچان بنی اور یہی ان کی امامت کی دلیل ہے۔ مگر کچھ مبالغہ آمیز باتیں امام محترمؒ کے بارے میں کہی گئیں جو آج کے تحقیقی دور میں علمی اعتبار سے بہت کمزور حیثیت رکھتی ہیں۔ مناسب یہی تھا جیسا مقام اللہ تعالیٰ نے امام محترم کو دیا اس کے بڑھانے میں یہ غیر علمی کوششیں نہ کی جاتیں۔ ان چند منسوب باتوں میں ایک بات تدوین فقہ اور مجلس علمی کی بھی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوین فقہ کے لئے چالیس ارکان پر مشتمل ایک مجلس قائم کر رکھی تھی جو مخصوص مسائل کو کھنگالتی۔ اگر اس کے جواب میں سب لوگ متفق الرائے ہوتے تو اسی وقت قلم بند کرلیا جاتا ورنہ نہایت آزادی سے بحثیں شروع ہوتیں۔ کبھی کبھی دیر تک بحث قائم رہتی۔ امام ابوحنیفہؒ غور وتحمل کے ساتھ سب کے دلائل سنتے اور بالآ خر ایسا جچا تلا فیصلہ صادر فرماتے جو سب کو تسلیم کرنا پڑتا۔ اس کام میں کم وبیش تیس برس لگے اور یوں چودہ لاکھ فقہی مسائل مدون ہوئے۔ بعض عقیدت مندوں نے تدوین فقہ کا یہ دورانیہ چودہ برس کا بھی لکھا ہے۔ بغور اس واقعہ کو دیکھا جائے تو علمی اور تاریخی اعتبار سے اس میں مبالغہ آرائی لگتی ہے۔ مثلاً:

......مجلس علمی کے چالیس ارکان کون کون تھے اہل علم ان کے نام بتانے سے قاصر ہیں اگر کوئی لکھتا بھی ہے تو زیادہ سے زیادہ دس نام ملتے ہیں مگر باقی کو وہ بھی نہیں مانتے۔

......یہ بھی مبالغہ ہے کہ آپؒ بحث ومباحثہ اور غور وتحمل کے بعد سب سے آخر میں ایسا جچا تلا فیصلہ فرماتے کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا۔ کیونکہ ہمیں تو محسوس یہ ہوتا ہے کہ جناب امام ابوحنیفہؒ کے دونوں عظیم شاگرد اپنے استاد محترم جناب امام ابوحنیفہؒ سے بیشتر مسائل میں اختلاف کرنے کی بھی جرأت کرتے ہیں؟ اس سلسلہ میں امام طحاویؒ عقیدہ طحاویہ میں فرماتے ہیں:

> عَنْ أَبِي يُوسفَ رَحِمهُ اللّٰهُ قَالَ: نَاظَرْتُ أَبَا حَنِيفَةَ مُدَّةً حَتَّى اتَّفَقَ رَأْيِي وَرَأْيُهُ، أَنَّ مَنْ قَالَ بِخَلْقِ الْقُرآنِ فَهُوَ كَافِرٌ۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں: میں نے کئی سال تک امام ابوحنیفہؒ سے بحث کی۔ بالآخر ان کی اور میری یہ رائے ٹھہری کہ جو خلق قرآن کا قائل ہے وہ کافر ہے۔

آخر یہ اختلاف رائے اور مناظرے حریت فکر کو ہی ظاہر کرتے ہیں جس کی گواہی فقہ حنفی کی ہر معتبر کتاب کا ہر صفحہ دیتا ہے۔ کہ ان دو شاگردوں کے علاوہ تیسرے شاگرد امام زفرؒ بھی اپنے استاد محترم کے بتائے ہوئے بیشتر مسائل میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ مزید یہ کہ جب اختلاف بداہتہً ہورہا ہے تو پھر مجلس کی تشکیل اور مسائل پر بحث ومباحثہ ،اور جچا تلا فیصلہ، سب کیلئے تسلیم شدہ، یہ سب دعوے غیر صحیح نظر آتے ہیں۔

......اسی طرح یہ کہنا کہ تیس برس میں چھ لاکھ مسائل مدون ہوئے۔ سوال یہ ہے کہ وہ مسائل کہاں ہیں؟ وہ محنت شاقہ اور عرق ریزی کون سی ہے جو ضبط تحریر میں آئی بھی مگر اپنا وجود کھو بیٹھی؟ چالیس ارکان میں سے کوئی بھی اس عظیم الشان کام کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ یا کم از کم امام مرحومؒ کے شاگرد رشید امام محمدؒ جنہوں نے حنفی فقہ کی کتب ظاہر الروایہ لکھیں۔ ان میں ہی کسی مسئلہ کا ذکر فرمادیتے۔ افسوس کہ ان چھ لاکھ یا اسی ہزار مسائل میں سے کچھ تو کسی نے ذکر کیا ہوتا۔

مشہور محدث اور فقیہ امام سفیان ثوریؒ کہا کرتے تھے:

لَمَّا اسْتَعْمَلَ الرُّوَاۃُ الْکِذْبَ اسْتَعْمَلْنَا لَھُمُ التَّارِیْخَ۔ جب راویوں نے جھوٹ کو شعار بنالیا تو ہم نے تاریخ کا ہتھیار استعمال کیا۔

یہی بات امام حفصؒ بن غیاث فرماتے ہیں:

إِذَا اتَّھَمْتُمُ الشَّیْخَ فَحَاسِبُوْہُ بِالسِّنِینَ۔ (الکفایۃ: ۱۹۳) جب تم کسی شیخ پر شک کرنے لگو تو اس کا احتساب پھر تاریخ وسال سے کرو۔

تاریخی اعتبار سے اگر اس فقہی مجلس کا جائزہ لیں تو پتہ یہ چلتا ہے کہ اس عظیم فقہی فورم کو امام ابوحنیفہؒ نے ۱۲۱ھ میں تشکیل دیا۔ کیونکہ امام محترم اس کے تیس برس بعد یعنی ۱۵۰ھ میں فوت ہو گئے تھے۔ جس کے ارکان میں امام محمدؒ بھی تھے جو ۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے۔ امام محمدؒ کی پیدائش سے چودہ سال قبل فورم کی تشکیل ہوئی۔ امام ابوحنیفہؒ کی وفات تک یہ پندرہ سال کے تھے اور اس بورڈ کے اہم رکن تھے۔ اگر ۱۵۰ھ تک یہ بورڈ قائم رہتا ہے تو کیا پندرہ سال کا نوجوان اس اہم بورڈ کا۔۔ جو فقہی، قانونی اور شرعی مسائل کا حل پیش کرتا رہا ہو۔۔ رکن ہوسکتا ہے؟ ایک عقلی سوال ہے؟

قاضی ابو یوسفؒ ۱۱۳ھ میں پیدا ہوئے۔ جب بورڈ کے وہ رکن بنے تو ان کی عمر آٹھ برس تھی۔ امام زفر ۱۱۰ھ کی پیدائش رکھتے ہیں۔ گیارہ برس کی عمر میں یہ بھی رکن بن گئے۔ امام یحی بن زکریا ۱۱۹ھ میں پیدا ہوئے۔ اس حساب سے ۱۲۱ھ میں دو برس کے تھے۔ حفصؒ بن غیاث کا سن پیدائش تقریب التھذیب میں ۱۱۵ھ لکھا ہے۔ گویا کہ یہ بورڈ کی تشکیل کے وقت چھ برس کے تھے اور اس کے رکن بنے۔ یہی حال دیگر ارکان کا ہے جو کم وبیش اسی عمر میں ہی تھے جب انہیں اس بورڈ کی رکنیت ملی۔ کیا یہ دعوی خلاف عقل نہیں کہ ایسے بورڈ کو مہتم بالشان مجلس قرار دیا جائے جس میں دو برس، چھ برس، آٹھ برس، نو، دس یا گیارہ برس کی عمر کے ممبر مقرر ہوں۔ پھر ایسی مجلس جو مسائل یا احکامات O.K. کرے گی اس کی وقعت اہل انصاف کے نزدیک کیا ہوگی۔ اس مبالغے کو علمی حدود اور ضابطوں کے جاننے والا کوئی عالم بھی علمی حیثیت نہیں دیتا۔ اس لئے بیشتر محققین احناف نے اس مجلس کا تذکرہ کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔

بعض دعووں کا ضعف:

۱۔ امام سرخسیؒ نے المَبْسُوط کی ابتداء میں اور الموفق بن احمد المکی نے مَنَاقِبُ اَبِی حَنِیفۃؒ میں یہ بات بڑی

شدومد سے لکھی ہے کہ سب سے پہلے فقہ کی تدوین امام ابوحنیفہؒ نے فرمائی۔ مگر سرخسیؒ کسی کتاب کا ذکر نہ کر سکے اور نہ ہی ابواب ومسائل کا۔ جب کہ آخر الذکر نے بعض ابواب کا ذکر تو کیا ہے مگر کتاب کا تذکرہ وہ بھی نہ کر سکے۔ اس لئے کہ یہ کتاب اگر موجود ہوتی یا امام محترم کے تلامذہ سے ہوتی تو کم از کم مسائل تو اس کتاب کی طرف منسوب ہوتے جیسے مالکی، مسائل کی نسبت موطأ امام مالک کی طرف کرتے ہیں اور شافعی، کتاب الأم کی طرف۔ مگر یہاں کوئی ایک صورت بھی نہیں۔

۲۔ فقہاء اربعہ میں ترجیح کا یہ اصول کہ امام محترمؒ ہی فقہ کے بانی ہیں لہٰذا ان کی بات دوسرے فقہاء کے مقابلے میں اولی ہوگی۔ یہ دلیل بھی درست نہیں اس لئے کہ جو واضع اول ہوتا ہے اس کی تحریر میں بہت سے تسامحات اور تساہلات شامل ہوجاتے ہیں۔ رہے متأخر تو ان کی بات تنقیح وتہذیب والی ہوتی ہے۔ اگر اس اصول سے یہ بات ثابت کرنا مقصود ہے کہ امام محترم کی کوئی تصنیف ہے تو یہ درست نہیں کیونکہ ان کی کوئی کتاب وجود ہی نہیں رکھتی۔ بلکہ امام محترمؒ کے تلامذہ کی تصنیفات ملتی ہیں۔ اور اگر ان کی مراد یہ ہے کہ وہی سب سے پہلے مسائل میں گویا ہوئے اور فروعات پر خامہ فرسائی فرمائی تو یہ بھی درست نہیں۔ اس لئے کہ امام محترمؒ سے بہت پہلے صحابہ وتابعین میں محدثین اور فقہاء کی ایک بڑی جماعت بے شمار تفریعی مسائل پر گفتگو فرما چکی تھی۔ مناقب الإمام الشافعی از امام فخر الدین رازی: ۱۹۲۔

☆☆☆☆☆

امام مالکؒ بن انس (۹۳ تا ۱۷۹ھ)

دوسرے بڑے امام ہیں۔ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ دادا، چچا اور والد غرضیکہ پورا خانوادہ حدیث رسول کا خادم وعالم تھا۔ مدینہ منورہ میں تو ویسے ہی فقہاء وعلماء کی کثیر تعداد تھی۔ اس لئے یہ خوش قسمتی انہی کے حصے میں آئی کہ بچپن سے ہی وہ انہی کے چشمہ فیض سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ فقہائے سبعہ میں باستثناء چند کے اکثر سے مالکؒ نے استفادہ کیا۔ اس طرح متفرق سینوں کا بکھرا علم ایک ہی سینہ میں مجتمع ہوگیا۔ اسی لئے آپؒ إمامُ دَارِ الهِجْرَةِ کے لقب سے ملقب ہوئے۔ اور عَالِمُ المَدِينَةِ کی پیشین گوئی کے مصداق بھی بنے۔ طلب علم کے لئے دوسرے شہروں کا سفر امام صاحبؒ سے ثابت نہیں اس لئے کہ ان کا اپنا گھر اور وطن خود زرو جواہر کی ایسی کان تھے جہاں ہر قیمتی موتی میسر تھا۔

علم کے شوق کے ساتھ دل ودماغ جب فکر سے آزاد ہوں تو علم کا حصول ممکن ہوتا ہے مگر شاذ مثالیں ہی ایسی ملتی

ہیں کہ طالب علم کو یہ دونوں چیزیں نصیب ہوں۔ طلب علم کی راہ میں جناب امام مالکؒ کو فقر کا سامنا کرنا پڑا جو ہم سب کے لئے ایک قابل فخر مثال ہے کہ اپنی ضرورت کے لئے انہوں نے چھت کی کڑیاں تک فروخت کردیں مگر کسی کے آگے اپنا ہاتھ نہیں پھیلایا اور علم کے حصول میں ہمت نہیں ہاری۔ جناب امام بخاریؒ...... جو فقہ وحدیث میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں...... کو بھی سفر میں سوائے ستر کے کپڑے کے باقی سب کپڑے بیچنے پڑے اور گھاس کھا کر قناعت کی مگر دست طلب کو دراز نہیں کیا اور نہ ہی علم کے حصول کو بوجھل سمجھا۔

اساتذہ: شیوخ میں امام مالکؒ کا انتخاب بھی قابل تحسین ہے ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کے خریدار نہیں بنتے تھے۔ بلکہ جو اہل ہوتا اسی سے علم کی پیاس بجھاتے۔ تحدیث نعمت کے طور پر کہا کرتے کہ میں کبھی کسی غیر فقیہ یعنی سفیہ کی صحبت میں نہیں بیٹھا۔ کبھی فرماتے: اس صحن مسجد کے ستونوں کے پاس میں نے ستر شیوخ کو ایسا پایا جو قال رسول اللہ کہا کرتے۔ اگر ان میں ہر ایک کو بیت المال کا امین بھی بنا دیا جاتا تو یقیناً وہ امین ہی ثابت ہوتے۔ مگر میں نے ان سے حدیث نہ سنی نہ روایت کی اس لئے کہ حدیث رسول ان کا میدان ہی نہ تھا کہ وہ اس کے مغز سخن کو سمجھتے۔ اسی طرح اہل عراق سے حدیث روایت نہیں کرتے تھے وجہ یہی بتاتے کہ میں نے انہیں دیکھا ہے کہ وہ یہاں آکر عموماً ان لوگوں سے حدیث سیکھتے اور سنتے ہیں جن پر وثوق نہیں کیا جاسکتا۔

صحابی رسول جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی تیس سالہ شاگردی میں رہنے والے مایہ ناز فقیہ ومحدث امام نافعؒ، جو آزاد کردہ غلام تھے، امام مالکؒ کے قابل فخر استاد تھے۔ کہا کرتے جب ابن عمرؓ کی حدیث امام نافعؒ سے سن لیتا ہوں تو پھر اس کی پروا نہیں کیا کرتا کہ کسی اور سے بھی اس کی تائید سنوں۔ دوسرے مایہ ناز استاد، جن کی حق گوئی، علمی وقار ورعب کے خلفاء بھی قائل تھے وہ امام ابن شہاب زہریؒ ہیں جن کی روایات سے صحاح ستہ مالا مال ہیں اور جو ابوبکر ابن حزم کے بعد حدیث رسول ﷺ کے سب سے بڑے مدون ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے امام صاحبؒ کے شیوخ کی تعداد پچھتر کے قریب بتائی ہے۔

تدریس وعلمی وقار: بارہ برس مسلسل اپنے استاذ امام نافعؒ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد امام مالکؒ ۱۱۷ھ میں مسند تدریس پر بیٹھے اور جس جاہ وجلال کی محفل سجائی وہ علم اور علماء کی شان کو ظاہر کرتی تھی۔ تمام مجلس پر ایک مقدس سکوت طاری ہوتا کتاب کا ورق الٹنے سے طلبہ ڈرتے تھے کہ مبادا اس کی سرسراہٹ ہو۔ سب مؤدب بیٹھتے اس لئے کہ امام صاحب کی اداء سے شکوہ اور وقار جھلکتا تھا۔ امام شافعیؒ نے جب موطا امام مالک

سن لی تو ساتھیوں نے انہیں کہا کہ اب آپ کا کام مکمل ہو چکا ہے پھر بھی آپ یہیں ہیں؟ فرمانے لگے: اب تک میں نے اپنے شیخ سے علم سیکھا تھا اب رہ کر ادب ووقار سیکھنا چاہتا ہوں۔ امام ابوحنیفہؒ، خلیفہ ہارون الرشید، اس کے دونوں شاہزادے امین و مامون بھی ان کی مجلس میں آ کر شریک ہوئے اور اسی طرح مؤدب ہو کر بیٹھے جس طرح شاگرد بیٹھتے ہیں۔ چند دنوں بعد لوگوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ یہی شاہزادے امام محترم کی جوتیاں اٹھانے اور انہیں درست کرنے میں ایک دوسرے سے پہل کر رہے ہیں۔

عام و خاص اگر علم سے مستفید ہو رہے ہوں تو شخصی منفعت کے لئے امام محترم عام افادہ کا خون نہیں کرتے تھے اور اس کے قائل تھے کہ إِنِّي لَا أُذِلُّ الْعِلْمَ میں علم کو رسوا نہیں کرنا چاہتا۔ یا یوں فرمایا کرتے: العِلْمُ يُزَارُ وَلَا يَزُورُ علم کے پاس آیا جاتا ہے نہ کہ علم کو لایا جاتا ہے۔ پڑھانے کا عام طریقہ یہ تھا کہ پہلے امام محترم احادیث، فتاوی اور اپنی تعلیقات کو قلم بند کر لیتے اور پھر کسی چاق و چوبند اور سمجھ دار شاگرد کو مامور کرتے کہ وہ اسے خوش خط لکھے۔ یہی لکھے ہوئے اجزاء کاتب کے ہاتھ میں ہوتے جسے وہ محفل میں پڑھتا تو امام محترم جا بجا اس کی تشریح و مطالب بیان کرتے جاتے اور اگر کاتب سے کوئی غلطی ہوتی تو خود اس کی تصحیح فرما دیتے۔

امام صاحب کے بارے میں امام شافعیؒ نے یہ کہا ہے کہ إِذَا ذُكِرَ الْعُلَمَاءُ فَمَالِكٌ النَّجْمُ یعنی جب علماء کے بارے میں سلسلہ گفتگو چل نکلے تو امام مالکؒ ہی ایک چمکتا ہوا تارا محسوس ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ حدیث رسول ہو تو اس کی تصحیح وتضعیف، رجال کی معرفت اور جرح و تعدیل کے تمام اسباب کا جاننا اور پھر اس کی تصحیح کے بعد احکام کا استنباط اور ان کی تفریع، اختلاف کی صورت میں ترجیح و تطبیق اور پھر واجب و سنت و مستحب وغیرہ کی تعیین ایک غیر معمولی کام تھا جو امام مالک نے قولی، عملی اور تحریری صورت میں پیش کیا جس کے نتائج سے دنیا مستفید ہوئی۔ موطأ ہو یا ان کے شاگرد عبدالرحمان بن القاسم (م۔۱۹۱ھ) کی امام مالکؒ کے ملفوظات فقہیہ وعلمیہ پر مبنی کتاب الْمُدَوَّنَةُ الْكُبْرٰى ہو یہ سب شاہد ہیں کہ امام صاحبؒ کے علم و فضل کے بارے میں غلو سے کام نہیں لیا گیا بلکہ یہ ان کی للّٰہیت کا ثمرہ ہے۔

فقہ مالکی کی اہم کتب:

۱۔ **موطا امام مالکؒ:** یوں مسلسل باسٹھ سال تک مسجد نبوی میں اپنی فقہی، حدیثی، اور تدریسی مخلصانہ خدمات انجام دیں۔ اس عرصے میں اپنی معروف کتاب موطأ لکھی اور کئی بار نقد و نظر سے گذاری۔ بارہا اس میں ترمیم، حک واضافہ کے مراحل آئے۔ جب امام محترمؒ نے اس کا آغاز کیا تو کسی شاگرد نے انہیں عرض کی: کہ موطأ نام کی کتب تو

بہت سے لوگ لکھ رہے ہیں؟ آپ کے لکھنے کا کیا فائدہ؟ امام مالکؒ نے جواب میں فرمایا: مَا کَانَ لِلّٰهِ یَبْقیٰ۔ جو کام اللہ کے لئے ہوگا اللہ تعالیٰ اسے باقی رکھے گا۔ موطأ امام تو باقی رہی مگر ان کے معاصرین کی موطآت مفقود ہو گئیں۔ موطأ فقہ کی کتاب بھی ہے اور حدیث کی بھی۔ کیونکہ یہ کتاب مرفوع احادیث کے علاوہ بہت سے فقہی احکام پر مبنی فقہاء صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے فتاوی، فیصلہ جات اور اجتہادات سے بھی مالا مال ہے۔ فقہ اور اصول فقہ کے بارے میں امام مالکؒ کے نقطہ نظر کو واضح کرتی ہے۔

شہرت کتاب: امام محترمؒ کی زندگی میں ہی اس کتاب کو ایسا عروج ملا کہ خلیفہ ہارون نے اس کتاب کو بطور ایک قانون کے اپنی خلافت میں نافذ کرنا چاہا اور اسے ایک آئینی حیثیت دینا چاہی کہ اسی کے مطابق تمام علماء وفقہاء فتوے دیں مگر امام محترم نے فرمایا: کہ یہ میرا علم ہے جب کہ عالم اسلام میں بے شمار اہل علم موجود ہیں ان کے علم سے بھی مستفید ہونا چاہئے۔ ایسی حالت میں ایک شخص کی رائے وعقل پر جس سے صحت وغلطی دونوں کا امکان ہے عالم اسلام کو مجبور کرنا مناسب نہیں۔ لہٰذا میرے علم کو حتمی علم کی حیثیت نہ دی جائے۔ امام محترمؒ اپنی سوچ اور فقہ کو اگر عام کرنا چاہتے یا اپنی شہرت و وجاہت چاہتے تو ان کے لئے کتنا سنہرا موقع تھا کہ ارباب حکومت میں گھس کر اپنے مسلک کو عام کرتے مگر انہوں نے خانہ کعبہ میں اپنی کتاب موطا کو آویزاں کروانا پسند نہ فرمایا۔ (الدیباج:۲۰۰)

انہی کی زندگی میں یہ کتاب اندلس میں پہنچ چکی تھی اور افریقہ کے علاوہ اہل مشرق بھی اس کتاب کے نسخوں کو اپنے اپنے علاقوں کی زینت بنا چکے تھے۔ امام شافعیؒ کے علاوہ امام محمدؒ بن الحسن بھی ان کے شاگرد تھے انہوں نے امام مالکؒ سے ان کی موطا سنی۔ بعد میں امام محمدؒ نے اپنے دیگر اساتذہ سے سنی ہوئی احادیث کو موطأ میں شامل کر دیا۔ یہ وہ روایات تھیں جو امام مالکؒ نے اپنی اصل موطا میں بیان نہیں کی تھیں۔ اس بناء پر ان کی موطا، موطا امام محمدؒ کے نام سے مشہور ہے جو موطأ امام مالک سے بالکل مختلف مواد رکھتی ہے۔ امام محمدؒ نے یہ کوشش بھی کی کہ اپنی موطا میں ہر حدیث کے آخر میں حنفی مسائل کو ثابت کر دیا جائے۔

۲۔ اَلْمُدَوَّنَۃ: یہ فقہ مالکی کی دوسری مشہور کتاب ہے۔ اس میں ان سوالوں کے جوابات جمع کئے گئے ہیں جو امام مالکؒ سے پوچھے گئے تھے۔ پھر انہیں ان کے شاگردوں نے مرتب کر کے کتابی شکل دے دی۔ امام سحنونؒ نے اس کتاب کو مرتب کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ بعض مقامات پر ان آثار سے بھی احتجاج کیا جو ابن وہب کی روایت موطا سے تھے۔ مگر یہ سب کچھ امام ابن القاسم سے تصدیق کے بعد کیا۔ اس کتاب میں تقریباً چھتیس ہزار مسائل ہیں

اور مالکیوں کے ہاں اسے بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

امام مالکؒ کے شاگرد:

امام مالک کی شاگردی کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ مدینہ منورہ جو مسلمانوں کا مرکز عقیدت ہے دنیا بھر سے آنے والے مسلمان نہ صرف امام مالکؒ کے حلقہ درس میں بیٹھے بلکہ ان کے شاگرد بن کر موطأ بھی پڑھ گئے جن کی روایت اپنے اپنے ملکوں میں جا کر انہوں نے پھیلائی۔ ان تلامذہ میں مصری، اندلسی، حجازی اور عراقی بھی ہیں۔ چند نامور شاگردوں کے نام یہ ہیں: ابوعبداللہ عبدالرحمٰن بن القاسم العتقی ۱۹۱ھ مصری ہیں بیس برس تک امام مالکؒ سے علم سیکھتے رہے۔ ابومحمد عبداللہ بن وہب بن مسلم م: ۱۹۷ھ انہوں نے بھی بیس برس امام محترم کی شاگردی میں گزارے۔ ابوعبد اللہ زیاد بن عبدالرحمٰن القرطبی م: ۱۹۳ھ ان کا لقب شبطون تھا امام مالکؒ سے انہوں نے موطأ سنی۔ اسد بن الفرات بن سنان م: ۲۱۳ھ تیونس کے حکمران رہے۔ امام مالکؒ سے انہوں نے بھی موطأ سنی۔ ابومروان عبدالملک بن ابی سلمہ الماجشون م: ۲۱۲ھ اپنے وقت کے مفتی تھے۔

فقہ مالکی کے اصول: امام مالکؒ کے فقہی منہج کا مبدا اہل حجاز کا وہ منہج ہے جس کا آغاز امام سعید بن المسیبؒ نے کیا تھا۔ نیز اپنی کتب میں بھی اسے اجاگر کیا ہے۔ قاضی عیاضؒ نے ان فقہی اصولوں کی تفصیل دی ہے جن پر امام مالکؒ اعتماد کرتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ اجتہاد۔۔۔ جس پر عمل ہو سکے اور جو شریعت کے مزاج کے مطابق ہو۔۔۔ کی شرائط، اس کا ماخذ اور اس کے مراتب وغیرہ درج ذیل ہیں:

......اجتہاد کرتے وقت اللہ کی کتاب کو اس طرح مقدم رکھنا ہے کہ نصوص سے ہی اس کے مستفید ہونا ہے۔ اور پھر اس کے ظاہر معانی کو لیا جائے پھر اس کے مفہوم کو۔ پھر اسی طرح سنت میں متواتر اور مشہور کی ترتیب سے مستفید ہوا جائے۔ پھر مراتب نصوص کا لحاظ رکھا جائے جن میں ان کے ظواہر اور ان کے مفہوم، جو کتاب اللہ کے مطابق ہوں کو مقدم رکھا جائے۔ پھر اجماع پر انحصار کیا جائے بشرطیکہ وہ مسئلہ کتاب اللہ وسنت متواترہ میں نہ ہو۔ ان تینوں کی عدم موجودگی میں اس مسئلہ پر قیاس بھی کیا جا سکتا ہے اور قیاس سے استنباط بھی۔ کیونکہ کتاب اللہ تو قطعی الثبوت ہے اور متواتر سنت بھی (جس کا تعلق سند یا احوال رواۃ سے نہ ہو)، اسی طرح نص بھی قطعی ہوتی ہے تو ان دونوں کو بہر حال مقدم رکھنا واجب ہوگا۔ پھر ان نصوص کے ظواہر اور مفہوم ہیں کیونکہ ان کے معنی کا بھی ان دونوں میں شامل ہونے کا احتمال ہے۔ ان کے بعد اخبار آحاد مقدم ہوں گی جن پر عمل کرنا واجب ہے یہ اس صورت میں جب مسئلہ

کتاب وسنت متواترہ میں نہ ہو۔خبر متواتر قیاس پر مقدم ہوگی۔

عمل اہل مدینہ: افتاء میں یا استنباط مسئلہ میں امام محترمؒ قرآن وحدیث پر اعتماد کرتے ہیں۔اوراس معاملہ میں سارادارومدار علماء حجاز میں کبار تابعین محدثین پر کرتے ہیں۔یعنی اہل مدینہ کی روایات، ان کے قضایا واحکام کو قابل عمل قرار دیتے ہیں۔وجہ سیدنا عمرؓ اوران کے صاحب زادے عبداللہؓ کی خاص اہمیت تھی۔دیگر شہروں کی روایات کو یہ کہہ کر ترک کردیا کرتے کہ ان کے راوی میرے شہر سے نہیں ہیں۔مزید یہ کہ اہل مدینہ کا اس پر عمل بھی نہیں ہوتا تھا۔لیکن اگر کسی مسئلہ میں کوئی جواب انہیں نہ ملتا تو پھر قیاس یا ایک نئی دلیل یعنی مصالح مرسلہ کے ذریعے اجتہاد کرلیا کرتے تھے جس کا مطلب ہے مصلحت عامہ کا تقاضا۔

مگر اہل مدینہ کے اس عمل کو کہ مدنی لوگ گاہک اور دوکاندار میں سودے کو ختم کرنے میں ایک دوسرے کے اختیار کو ہمہ وقت تسلیم کرتے ہیں۔امام مالکؒ نے جب اسے صحیح حدیث پر ترجیح دی جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: الْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا بائع ومشتری دونوں اس وقت تک بااختیار ہیں جب تک وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو جاتے۔تو دیگر فقہائے محدثین نے یہ کہہ کر عمل اہل مدینہ کو حدیث پر ترجیح نہ دی کہ آپ ﷺ کا یہ اصول آفاقی ہے۔ہر مقام پر مدینہ والے لوگ نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اس مزاج کے حامل۔اور نہ ہی اہل مدینہ کا عمل حدیث صحیح کے مقابل میں ایک آفاقی اصول بنایا جاسکتا ہے۔بلکہ اصول، حدیث سے ہی ماخوذ ہوگا۔کیونکہ صحابہ مدینہ میں رہے اور باہر بھی۔نیز صحابہ مدینہ میں ہوں تو یہ علم امام مالکؒ کے نزدیک حجت ہو لیکن جب یہ علم مصر وشام اور کوفہ چلا جائے تو اس کی حجیت قابل غور ٹھہرے؟ اس لئے باہر والوں کا علم انہوں نے Qoute نہیں کیا۔

ان سے سوال کیا گیا کہ آپ نے سیدنا علیؓ وابن عباسؓ کی روایات ذکر نہیں فرمائیں تو جواب دیا: لَمْ يَكُونَا مِنْ بَلَدِيْ۔ یہ دونوں میرے شہر (مدینہ) میں نہیں تھے۔مدینہ کے علماء کا باہم اختلاف عمل اہل مدینہ کا اصول کمزور بناتا ہے۔جس کا ذکر موطأ میں ہے اس صورت میں کچھ اہل مدینہ کے ارشادات دوسروں پر کیسے حجت ہو سکتے ہیں؟ کون سے اقوال ہونگے جنہیں ترجیح دے کر سنت ثابت کیا جائے؟ جب کہ دونوں طرف اہل مدینہ ہوں۔

چند مالکی اصطلاحات

ا۔ائمہ: ان سے مراد ابوالقاسم بن محرز (م:۴۵۰ھ)، متاخرین میں قاضی عیاض بن موسیٰ یحصبی (پیدائش:م ۴۷۶ھ) اور متقدمین میں عبدالعزیز بن ابی سلمہ (م:۱۸۴ھ) ہیں۔(کشف النقاب از ابن فرحون مالکی:۷۶)

۲۔الأخوان: سے مراد مطرف بن عبد اللہ (م: ۲۲۰ھ) اور عبد الملک بن عبد العزیز المعروف ابن الماجشون (م:۲۱۴ھ) ہیں اس کی وجہ ان کا باہم بے شمار احکام اور ان پر عمل میں اتفاق ہو جاتا تھا۔(الفکر السامی از حجوی ۹۶/۳)۔ انہی کے بارے میں ایک شاعر نے کہا تھا:

كَذَا مُطَرِّفٌ وَنَجْلُ الْمَاجِشُونَ حَلَّاهُما بِالأَخَوَيْنِ النَّاقِلُونَ

یہی مطرف اور ماجشون کے پوتے ہیں جنہیں ناقلین نے اخوین کے تاج سے آراستہ کیا ہے۔

شیخ: اس سے مراد مالکی فقہاء ممتاز مغربی فقیہ ابو محمد عبداللہ بن ابی زید القیر وانی (م:۳۸۹ھ) لیتے ہیں۔انہیں مالک صغیر بھی کہا جاتا ہے۔(شرح مختصر خلیل ۴۹/۱)

شیخان: سے مراد ابو محمد القیر وانی اور ابو الحسن علی القابسی رحمہما اللہ لیتے ہیں۔قابسی، ابوالحسن علی بن محمد بن خلف المعافری (م:۴۰۳ھ) کے نام سے معروف ہیں اور ابوزید المروزی سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔(حاشیہ العدوی ۲۷/۱)

قرینان: اس سے مراد اشہب بن عبدالعزیز القیسی العامری (م:۲۰۴ھ) اور عبداللہ بن نافع الصائغ (م:۱۸۶ھ) ہیں۔

مفتی۔ جو فقہ مالکی میں راجح کے مطابق ایسا فتوی دے جو نفس مسئلہ کے لئے مناسب ہو۔اور غیر مفتی وہ ہوتا ہے جو اجتہاد کی شروط پر نہیں اترتا بلکہ وہ متفق علیہ مسائل ہی بیان کرتا ہے۔یا وہ مسائل جو مذہب میں مشہور ہوں یا جن کو اولین فقہاء مالکیہ نے ترجیح دی ہو۔

...... مالکی کتب کی روایات میں اور مشائخ کی روایات میں ترجیح کے کچھ اصول ہیں۔مثلاً: مشائخ کے اقوال میں اگر اختلاف ہو تو المدونة میں امام مالکؒ کا قول ابن القاسمؒ کے قول سے مقدم ہوگا۔اس لئے کہ امام مالکؒ بہر حال بڑے امام ہیں۔اسی کتاب میں ابن القاسمؒ کا قول دوسرے کے مقابلے میں مقدم ہوگا اس لئے کہ وہ امام مالکؒ کے مذہب کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔

......مذہب کی اصطلاح سے مراد مذہب امام مالک ہے۔مالکی مسلک میں فقہاء مختلف رائے بھی رکھتے ہیں۔ایسی صورت میں ترجیح کے لئے مشہور کا لفظ مستعمل ہوتا ہے جس سے مراد وہ مسئلہ جو مالکی مسلک میں مشہور ہے یا جس مسئلے کے قائلین بہت ہوں۔

موازنہ مابین فقہ مالکی وحنفی: شاہ ولی اللہ محدثؒ دہلوی نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں دونوں ائمہ کرام کے مقام ومرتبے کو بیان کرنے کے بعد دونوں کا موازنہ کر کے ان کے اپنے اپنے طریقہ اجتہاد پر روشنی ڈالی ہے۔

كَانَ مَالِكٌ مِنْ أَثْبَتِهِمْ فِي حَدِيثِ الْمَدَنِيِّينَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَأَوْثَقِهِمْ إِسْنَادًا، وَأَعْلَمِهِمْ بِقَضَايَا عُمَرَ، وَأَقَاوِيلَ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، وَعَائِشَةَ، وَأَصْحَابِهِمْ مِنَ الْفُقَهَاءِ السَّبْعَةِ، وَبِهِ وَبِأَمْثَالِهِ قَامَ عِلْمُ الرِّوَايَةِ وَالْفَتْوَى۔ امام مالک علماء مدینہ کی احادیث کو خوب یادر کھتے تھے۔ان کی سند بھی زیادہ قوی تھی۔سیدنا عمرؓ کے فیصلہ جات، ابن عمر، سیدہ عائشہؓ اور فقہاء سبعہ کے اقوال سب سے زیادہ جانتے تھے۔امام مالک اوران کے ہم سروں کی محنت سے روایت حدیث اورافتاء کا علم قائم ہوا۔

اس کے بعد امام ابوحنیفہؒ کا حال لکھا ہے۔فرماتے ہیں:

وَكَانَ أَبُو حَنِيفَةَ ؒ أَلْزَمُهُمْ بِمَذْهَبِ إِبْرَاهِيمَ وَأَقْرَانِهِ، لَا يُجَاوِزُهُ إِلَّا مَاشَاءَ اللَّهُ، وَكَانَ عَظِيمَ الشَّأْنِ فِي التَّخْرِيجِ عَلَى مَذْهَبِهِ، دَقِيقَ النَّظَرِ فِي وُجُوهِ التَّخْرِيجَاتِ مُقْبِلًا عَلَى الْفُرُوعِ أَتَمَّ إِقْبَالٍ، وَإِنْ شِئْتَ أَنْ تَعْلَمَ حَقِيقَةَ مَا قُلْنَاهُ فَلَخِّصْ أَقْوَالَ إِبْرَاهِيمَ وَأَقْرَانِهِ مِنْ كِتَابِ الْآثَارِ لِمُحَمَّدٍ رَحِمَهُ اللَّهُ، وَجَامِعِ عَبْدِ الرَّزَّاقِ، وَمُصَنَّفِ أَبِي بَكْرِ بْنِ أَبِي شَيْبَةَ، ثُمَّ قَايِسْهُ بِمَذْهَبِهِ تَجِدْهُ لَا يُفَارِقُ تِلْكَ الْمَحَجَّةَ إِلَّا فِي مَوَاضِعَ يَسِيرَةٍ وَهُوَ فِي تِلْكَ الْيَسِيرَةِ أَيْضًا لَا يَخْرُجُ عَمَّا ذَهَبَ إِلَيْهِ فُقَهَاءُ الْكُوفَةِ۔ امام ابوحنیفہؒ نے ابراہیم نخعی اور ان کے معاصرین کا مذہب اختیار کیا ہوا تھا۔اس سے ذرا ادھر ادھر نہ ہوتے تھے۔الا ماشاءاللہ۔ابراہیم نخعی کے قواعد پر مسائل نکالنے میں امام محترم کو عظیم دسترس حاصل تھی۔وجوہ تخریج میں بڑے باریک بین تھے۔ان کی مکمل توجہ فروع پر تھی۔میری اس بات کی تحقیق اگر آپ کرنا چاہیں تو امام محمد کی کتاب الاثار اور مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابوبکر لے لیجئے۔پھر ان میں ابراہیم نخعی اور ان کے معاصرین کے اقوال لے لیجئے۔اب امام ابوحنیفہؒ کے مذہب سے ان کا موازنہ کر دیکھئے تو آپ شاید سوائے چند جگہوں کے کہیں فرق نہیں پائیں گے۔پھر ان چند جگہوں میں بھی امام ابوحنیفہؒ فقہاء کوفہ کے مذہب سے باہر نہیں جاتے۔(حجۃ اللہ البالغۃ: ۱/۳۱۸)

وفات: امام محترم کو اللہ تعالیٰ نے خدمت دین کا بھر پور موقع دیا۔۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔۱۱۷ھ میں مسجد نبوی کی مسند درس پر تشریف فرما ہوئے۔باسٹھ سال تک علم ودین کی خدمت کی۔۸۱ سال کی عمر میں ہی طبیعت میں ضعف وناتوانی آچکی تھی۔تسلسل سے مسجد نبوی میں آنا، غم وشادی کی تقریبات میں جانا سب موقوف ہوگیا تھا۔لوگ اعتراض کرتے تو جواب میں فرماتے: ہر شخص اپنا عذر بیان نہیں کرسکتا۔آپ کے معروف شاگرد معن بن عیسیٰ جو صحاح ستہ کے رواۃ میں سے ہیں وہ اس عمر میں امام صاحب کے خادم تھے۔انہی کا سہارا پکڑ کر چلتے تھے۔اور کبھی

کبھار اس بڑھاپے میں بھی درس وافتاء کی خدمت جاری رہتی۔

امام محترمؒ اتوار کے روز بیمار ہوئے یہ بخار اپنی شدت تین ہفتے تک دکھاتا رہا۔ اس دوران مرض کی شدت میں کوئی تخفیف نہ ہوئی۔ شاگردوں کو امام محترم کی تکلیف وبیماری کا جو ملال تھا اس کا یوں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب مدینہ کے علماء کو یقین ہوگیا کہ اب امام محترم کا آخری وقت ہے تو تیمارداری کے لئے حدیث وفقہ کے ۱۶۰ علماء مودب بہ چشم نم آس پاس بیٹھے تھے۔

امام قعنبیؒ جو آپ کے خاص تلامذہ میں سے تھے انہوں نے امام محترم کی آنکھوں سے آنسو نکلتے دیکھے تو سبب پوچھا۔ امام محترم فرمانے لگے: قعنبی! میں نہ روؤں تو کون روئے۔ اے کاش! مجھے میرے ہر قیاسی فتوے کے بدلے میں ایک کوڑا مارا جاتا۔ یہی گریہ جاری تھا لب متحرک تھے کہ اسی عالم میں جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اور یوں ۸۶ سال کی عمر پا کر ۱۷۹ھ کو انتقال فرمایا۔ جنازہ میں خلقت تھی۔ سارا مدینہ حتی کے والی مدینہ پیدل جنازہ میں نہ صرف چلا بلکہ اس نے کندھا دیا۔ جنت البقیع میں تدفین ہوئی جہاں ام المومنین عائشہؓ، عثمان ذوالنورینؓ، سیدنا حسنؓ، سیدہ فاطمہؓ ام المومنین حفصہؓ جیسی عظیم ہستیاں مدفون ہیں۔

امام شافعیؒ (۱۵۰-۲۰۴ھ)

نام اور بچپن: آپ کا نام محمد بن ادریس ہے۔ قریشی النسب تھے، شافع ان کے جد اعلی تھے جن کی طرف نسبت سے آپ شافعی کہلائے۔ غزہ میں رجب ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ دو سال کے تھے کہ والدہ انہیں یمن اپنے قبیلہ ازد میں لے آئیں جہاں امام شافعیؒ نے اپنا بچپن گذارا۔ سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا اور دس سال میں موطأ امام مالک یاد کر لی۔ پھر مکہ آ گئے اور چچا محترم کے پاس رہ کر علم الأنساب اور دیگر علوم سیکھنا شروع کئے۔

اساتذہ: مفتی مکہ مسلمؒ بن خالد زنجی نے اس ذہین وذکی اور قوت حفظ سے مالا مال بچے کو تین برس تک اپنے علم فقہ وحدیث سے مستفید فرمایا۔ بعد میں اپنے استاذ کا خط لے کر مدینہ امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے جنہوں نے ان کی گفتگو اور ذوق علمی سے متأثر ہو کر قبول فرمالیا۔ تین برس امام مالکؒ کی خدمت میں صرف کئے اس دوران صحابہ کرام، تابعین اور امام مالکؒ کی فقہ کو اچھی طرح سمجھا اور یاد کیا۔ مدینہ کے دیگر سرکردہ علماء میں ابراہیم بن سعد الأنصاری، عبد العزیز دراوردی اور دیگر علماء سے بھی بکثرت احادیث، آثار صحابہ اور ان کے فتاوی کو پڑھا اور جستہ

جستہ جرح وتعدیل کے اصول وقواعد کو بھی محفوظ کرتے گئے۔ امام مالک اور دیگر فقہائے مدینہ نے آپ کی قابلیت کو جاننے کے بعد متفقہ طور پر انہیں فتوی دینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

رحلہ برائے علم: بعدازاں یمن تشریف لے گئے یہاں قبیلہ ہذیل میں رہ کر تیراندازی، لغت، شاعری، تاریخ، انساب، نحو اور علم فراست جیسے علوم سیکھ کران میں کمال حاصل کیا۔ دس ہزار اشعار غرائب سمیت یاد کیے۔ عربی زبان میں ایسا درک پایا کہ مبرد، جاحظ، ابوالعباس ثعلب، ابومنصور ازہر، ابوسلیمان خطابی اور علامہ زمخشری وامام رازی نے زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انہیں لغت اور ادب کا امام قرار دیا۔ فن تاریخ اور ایام العرب سے بھی بخوبی شناسائی تھی اور علم طب پر گہری نظر بھی۔ علم فراست بھی رکھتے تھے۔ امام حمیدیؒ کہتے ہیں ایک بار امام شافعیؒ کے ہمراہ مکہ سے باہر وادی بطحا میں آیا وہاں ہمیں ایک شخص ملا۔ میں نے امام شافعیؒ سے عرض کی کہ اپنی فراست سے یہ بتائیے کہ اس شخص کا ذریعہ معاش کیا ہوسکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: یہ شخص بڑھئی یا درزی معلوم ہوتا ہے۔ حمیدیؒ کہتے ہیں میں نے واپس جا کر اس سے پوچھا کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا: میں پہلے بڑھئی تھا لیکن آج کل درزی کا کام کرتا ہوں۔

واحد امام ہیں جو مکہ، مدینہ، یمن، عراق، شام، مصر اور الجزائر کے علماء وفضلاء سے ملے اور ان سے فقہی واجتہادی مسائل پر مذاکرات فرماتے رہے۔ فقہ حجاز کو سیکھنے کے بعد امام محترم عراق تشریف لے گئے۔ وہاں انہوں نے محسوس کیا کہ امام مالکؒ کے بارے میں اہل عراق عصبیت رکھتے ہیں۔ وہاں کے فقہاء کرام جو دربار خلافت میں ایک عالی مقام رکھتے تھے امام شافعیؒ نے اس کے باوجود بھی ان کے سامنے بہت ہی مناسب علمی ومناظراتی انداز میں امام مالکؒ کے نقطہ نظر کا دفاع کیا۔

فکر میں تبدیلی: بغداد میں رہتے ہوئے امام شافعی نے ایک کتاب **الحُجَّةُ** لکھی جس میں امام محترم نے اپنے قدیم نقطہ نظر کا خوب دفاع کیا اور جس میں اہل الرائے پر سخت نکیر کی اور یوں اہل عراق نے انہیں **ناصر الحدیث** کا خطاب دیا۔ اس قیام کے دوران اہل الرائے کی کتب کا گہرائی سے مطالعہ بھی فرماتے رہے۔ اور غور وفکر بھی کرتے رہے۔ اس مطالعے نے ان کی سوچ کو ایک اور رخ دے دیا کہ مدرسہ اہل الرائے اور مدرسہ اہل حدیث کے درمیان کیوں نہ ایک بین بین راستہ نکالا جائے جس میں نصوص سے وابستگی بھی ہو اور مناسب رائے کا عقلی اظہار بھی۔ اس لئے جب امام محترمؒ مصر تشریف لائے تو انہوں نے اپنی سابقہ فکر سے ہٹ کر نئے انداز سے اپنی کتب کو لکھنا شروع

کیا۔ان کی مشہور کتب كِتَابُ الرِّسَالَةِ الْجَدِيْدَةِ، اخْتِلَافُ الْحَدِيثِ، جِمَاعُ الْعِلْمِ، إِبْطَالُ الإِحْسَانِ، أَحْكَامُ القرآنِ، صِفَةُ الأَمْرِ وَالنَّهْيِ، اخْتِلَافُ مَالِكٍ وَالشافِعِي، اخْتِلَافُ الْعِرَاقِيِينَ اور كِتَابُ الأُمّ وغیرہ اسی سوچ کی عکاس ہیں۔ جو ان کی چار سالہ محنت شاقہ کا ثمرہ ہیں۔ان کتب کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امام محترمؒ نے جہاں محسوس کیا کہ رائے کے استعمال کی یہاں ضرورت ہے انہوں نے وہاں اسے استعمال کیا اور جہاں حدیث کو بطور دلیل پیش کرنے کی ضرورت تھی وہاں اسے پیش کر دیا۔غرضیکہ جہاں جہاں انہوں نے دونوں مذاہب میں کمی دیکھی اسے پورا کرنے کی کوشش کی۔اور عام متداول فقہی منہج سے ہٹ کر اسے ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی۔مثلاً:

رائج فقہی اصولوں کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا۔فقہ کی بنیاد اصولوں پر رکھی اور فروع وجزئیات کو کلی قواعد کے ساتھ منضبط کر دیا۔مشہور فقیہ ربیعہؒ الرائی نے ایک مرتبہ امام شافعیؒ سے کہا: اگر کوئی شخص رمضان کا روزہ قضاء کر دے تو اسے بارہ روزے رکھنا چاہئیں اس لئے کہ اس مہینے کا ایک دن دوسرے مہینوں کے بارہ دن کے برابر ہے۔امام شافعیؒ نے جواب دیا: یہ فقہ ہے یا مذاق۔اگر تمہارا نظریہ یہی ہے تو پھر شب قدر کی نماز فوت ہو جائے تو وہ ہزار مہینے تک قضا کرے کیونکہ ليلة القدر خير من ألف شهر قرآن میں ہے۔ربیعہؒ خاموش ہو کر چلے گئے۔

شاہ ولی اللہؒ دہلوی بھی امام شافعیؒ کے اس نقطہ نظر کو پسند فرمایا کرتے اور استنباط مسائل میں شاہ صاحبؒ کے پیش نظر ہمیشہ امام صاحب کے ہی اصول رہے۔ جو ان کی کتب الإنصاف، عقد الجيد، حجة الله البالغه اور المسوى والمصفى میں جگہ جگہ واضح ہیں۔ڈاکٹر مظہر بقاء نے شاہ صاحبؒ کا امام شافعیؒ کی طرف اسی فی صد مسائل میں رجحان ثابت کیا ہے۔(شاہ ولی اللہ اور اصول فقہ از مظہر بقاء)

تلامذہ:ان کی صحیح تعداد کا تعین کرنا تو مشکل ہے البتہ کچھ ممتاز افراد کے تعین سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام محترمؒ جیسی ذی علم شخصیت سے کن مشاہیر واکابرین نے استفادہ فرمایا۔امام ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں: ان میں امام ابوعبد اللہ الحمیدیؒ (م۲۱۹ھ) مکہ کے رہنے والے، حافظ حدیث اور عظیم فقیہ، امام شافعیؒ کے سب سے بڑے شاگردوں میں سے تھے۔، جو امام بخاریؒ کے استاذ ہیں، **ابو حفص** حرملہ بن یحییٰ المصری (۱۶۶۔۲۴۴) **سلیمان** بن داؤد الہاشمی (م۲۱۹ھ) **ابو علی** حسن بن محمد زعفرانی (م۲۵۹ھ) پہلے کوئی فقہ پر عمل کرتے تھے بعد میں امام محترم سے متاثر ہو کر امام شافعیؒ کے مستقل شاگرد بن گئے ان سے بہتر فصیح اور لغت کا جاننے والا کوئی نہ تھا۔**ابو ابراهيم**

اسمعیل بن یحییٰ المزنی (۱۷۵۔۲۶۴) وسیع علم رکھتے تھے۔ زاہد، عالم، مجتہد، مناظر اور مشکل علمی مباحث کو سلجھانے والے تھے۔ امام شافعیؒ فرمایا کرتے: اگر یہ شیطان سے مناظرہ کریں تو غالب آئیں گے۔ اپنی اصلاح کے لئے مردوں کو لوجہ اللہ نہلایا کرتے۔ کہا کرتے یہ میں اس لئے کرتا ہوں تا کہ میرے دل میں سختی نہ پیدا ہو جائے۔

ابو محمد الربیع بن سلیمان بن عبد الجبار المرادی (م: ۲۷۰) مصر کے ایک ثقہ عالم، جنہوں نے امام شافعیؒ کے بعد ان کی جانشینی کی۔ انہیں امام شافعیؒ نے فرمایا تھا: ربیع! تم میری کتابوں کی اشاعت کرو گے۔ ربیع فرماتے ہیں جو ہمارے شیخ نے ہمیں فرمایا وہ حرف بحرف صحیح ہوا۔

فقہ شافعی کے اصول: امام محترم نے اپنی کتاب الرسالہ لکھی جو اصول فقہ اور اصول حدیث کی اولین، نفیس اور اساسی کوشش قرار پائی۔ یہ اصول آج تک مسلمہ ہیں اور اصول فقہ میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

استدلال میں اصل حیثیت کس کی؟

امام محترمؒ نے احکام ومسائل میں استدلال کے چند درجات پر رائے دی ہے جس سے فقہ شافعی میں استدلال کی اصل حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ آراء درج ذیل ہیں:

۱۔ دین میں اصل حیثیت قرآن وسنت کی ہے اور اگر ان سے استدلال نہ ہو سکے تو پھر قیاس جو قرآن وسنت کے مطابق ہو۔ وجہ یہ ہے کہ قرآن وسنت کے قوانین محدود ہیں اور امتداد زمانہ کے ساتھ پیش آنے والی صورتیں غیر محدود اس لئے جب کوئی واقعہ پیش آئے تو پہلے قرآن وحدیث میں غور کرنا چاہئے اور صحابہ کرام کے تعامل پر بھی نظر رکھنی چاہئے۔ اگر مسئلہ سے متعلق کوئی بات مل جائے جو صورت حال کے چند پہلوؤں سے تو یکساں ہو مگر ہو بہو نہ ہو تو قرآن وحدیث کے بیان شدہ امر اور پیش آمدہ واقعہ میں مماثلت پیدا کرنے کے لئے ہمیں یہ حق ہے کہ ہم اس امر کی جستجو کریں کہ قرآن وحدیث کے اس قاعدہ مغیہ کی علت اور وجہ کیا تھی؟ پھر ہم بھی اس علت کی بناء پر قیاس کرنے کے مجاز ہیں۔ قیاس کے متعلق اس دقیق بات کا نتیجہ یہ نکلا کہ بڑے ممتاز محدثین امام محترم کی اس رائے سے متفق ہو گئے۔

۲۔ جب حدیث رسول ﷺ صحیح متصل سند کے ساتھ ثابت ہو جائے تو اس پر عمل لازمی ہے۔ اور کوفہ ومدینہ کی روایتوں پر اعتماد بھی اسی بنیاد پر کیا جائے۔ ورنہ نہیں۔

۳۔ حدیث ہمیشہ اپنے ظاہری معنی پر محمول ہونی چاہئے اور جب اس میں متعدد معانی کا احتمال ہو تو جو معنی ظاہری معنی کے قریب ہوں وہ لئے جائیں گے۔ زیادہ تاویلات نہ کی جائیں۔

۴۔ صحابہ کرام کا اجماع خبر واحد سے بالاتر ہے اور اجماع صحابہ نہ ہونے پر خبر واحد قابل عمل ہے۔ حدیث خواہ کسی درجہ کی ہو قرآن کی ناسخ نہیں ہو سکتی۔

۵۔ جب چند احادیث باہم متعارض ہوں تو ان میں یہ غور کرنا چاہئے کہ راوی کیسے ہیں؟ احکام کی ترتیب اور متقدم ومتاخر صحابہ کے مقام کا بھی لحاظ ہونا چاہئے۔

۶۔ جب حدیث مرسل دوسری سند سے مروی نہ ہو تو بجز امام سعید بن المسیبؒ کے سبھی ناقابل قبول ہیں۔ دوسری یا تیسری صدی ہجری کی مرسل امام شافعیؒ کے نزدیک قطعی قابل قبول نہیں کیونکہ اس کی سند نہیں ہے۔ ورنہ بغیر سند کے روایات کا ایک سلسلہ چل نکلے گا اور ہر کوئی جو منہ میں آیا کہہ دے گا۔ لقال من شاء ما شاء۔

۷۔ صحیح ومتصل حدیث کے مقابلہ میں، حدیث مرسل وموقوف اور منقطع کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔

۸۔ امام شافعیؒ کے دور میں اقوال صحابہ جمع ہو گئے تھے۔ بعض اقوال صحیح حدیث کے برعکس تھے اس لئے امام محترم نے یہ طے کیا کہ صحیح حدیث کے مقابلہ میں اقوال صحابہ کوئی وقعت نہیں رکھتے۔

۹۔ ہر عام حکم میں مستثنیات بھی ہوتے ہیں اور عام قطعی نہیں ہوتا۔

۱۰۔ جلب منفعت سے دفع مضرت اولی ہے۔ یعنی فائدہ حاصل کرنے کی بجائے نقصان کو دور کرنا زیادہ بہتر ہے۔

۱۱۔ ایک اصل کو دوسرے اصل پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہاں اگر اس کی علت دریافت ہو جائے تو فرع کو اصل پر قیاس کرنا چاہئے۔

۱۲۔ اصل کے لئے کیوں اور کیسے کی بات نہیں کی جا سکتی بلکہ یہ بات فرع کے لئے کہی جا سکتی ہے کہ کیوں اور کیسے۔

۱۳۔ اجماع وہاں ہوگا جہاں کتاب وسنت خاموش ہوں اور پھر قابل قبول بھی ہوگا ورنہ نہیں۔

۱۴۔ اگر اجماع بھی نہ پائے تو پھر مجتہد، قیاس میں غور وخوض کرے۔

مشہور شافعی کتب: یہ وہ کتب ہیں جن پر شافعی مسلک قائم ہے۔

۱۔ **الرسالہ:** اصول فقہ میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو امام محترم نے لکھی۔ تالیف کی وجہ یہ بنی کہ امام شافعیؒ نے محسوس کیا کہ فقہاء کرام کے ہاں طریقہ استنباط غیر واضح اور غیر معین سا ہے۔ اس لئے یہ کتاب لکھی جس میں کتاب وسنت کی نصوص، ناسخ ومنسوخ، علل احادیث، قبولیت حدیث کی شروط، خبر واحد، اجماع اور قیاس ان کے مراتب، اجتہاد وغیرہ۔ کے وقیع مباحث ہیں۔ فقہ اسلامی کو انہوں نے ٹھوس اصولوں کی بنیاد دی۔ محض مخصوص فتاوی اور قضایا پر اکتفاء نہیں کیا۔

انہوں نے کتاب وسنت یا اخبار آحاد کے منکرین سے بحث کرنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کی تالیف کے بعد خصوصا اہل الرائے اور اہل الحدیث کے مابین فقہی واصولی مناہج میں مباحثات شروع ہو گئے۔ الرسالۃ کی تدوین، قرآن وسنت رسول میں وارد مختلف اصولوں کی بنیاد پر ہوئی۔ جس میں تاویلات سے گریز تھا۔

یہ اصول جہاں حدیث کی حفاظت کے لئے تھے وہاں فقہ اسلامی کے لئے بھی تھے۔اس کے مقبول عام ہونے کے بعد علماء نے اسے بنیاد بنا کر اصول فقہ کی تالیف پر جب طبع آزمائی کی تو شوافع، حنابلہ واحناف نے اپنی مخصوص سوچ اور تاثیر کے تحت امام شافعیؒ ہی کی طرز پر تشریح، توضیح اور تفصیل کی جس میں کچھ اضافے بھی کئے۔اس طرح ان مذاہب میں واضح طور پر اپنے اپنے اصول بنے جن سے فقہ اور اصول فقہ منقسم ہوگئے۔اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انہوں نے یہ سب کاوشیں پیش کیں۔وہ ان کے متبع بن کر رہے نہ کہ مبتدع۔اپنے اصولوں کے لئے انہوں نے کتاب وسنت اور سیرت صحابہ پر انحصار کیا تھا یا پھر ائمہ ہدی پر۔

۲۔ **الأم**: یہ کتاب اپنے شاندار اسلوب، اور دقت تعبیر میں منفرد ہے۔علمی مناظراتی انداز ہے جو تفہیم مسائل میں خاصا موثر ہے۔اس کتاب کے سات اجزاء ہیں۔امام محترمؒ نے جو دوسری کتب وقتاً فوقتاً لکھیں انہیں بھی اس کے ساتھ ملا دیا ہے جیسے: جماع العلم، ابطال الاستحسان، اختلاف مالک والشافعي، الرد علی أهل المدينة، اختلاف ابي حنيفة وابن ابي ليلى اور سير الأوزاعي وغیرہ۔

۳۔ **مسند الإمام الشافعي**: نیشاپور کے شاگردوں نے کتاب الأم اور دیگر کتب میں مروی امام محترم کی روایات کو اس میں یک جا کرنے کی کوشش کی ہے جب کہ امام محترمؒ کی بیشتر روایات اس کتاب میں نہیں سما سکیں۔

۴۔ **مختصر المزني**: شافعی مسلک کی بنیادی کتب میں سے ہے۔اس کتاب کی ترتیب بھی الرسالہ کی طرز پر ہے۔متاخر شوافع نے اس کی شروحات لکھیں اور حاشیے بھی چڑھائے۔

بعض مشہور فقہی اصطلاحات

کتب شافعیہ میں بعض ذیلی مصطلحات بارہا مستعمل ہوئی ہیں۔

ا۔ **مفتی**: جب مفتی امام محترم کے کسی مسئلہ کے بارے میں دو قول پائے تو مفتی کے لئے یہ لازمی ہوگا کہ ان دو میں اسے اختیار کرے جسے سابق فقہاء مذہب نے ترجیح دی ہو۔ورنہ وہ توقف کرے۔جب مسئلہ مجتہد شوافع کے ہاں متعدد صورتوں کا حامل ہو یا اس کی روایت کی مختلف اسانید ہوں تو مفتی اس صورت کو لے گا جسے سابق مجتہدین نے ترجیح دی ہو۔یہی وہ اصول ہے جسے اکثر فقہاء شوافع نے صحیح قرار دیا ہے۔پھر درجات کے اعتبار سے اعلم کو ترجیح دی جائے گی پھر اورع کو۔اگر مفتی ترجیح کی کوئی شکل نہ پائے تو اس رائے یا فتوی کو مقدم رکھے گا جسے امام بویطی، ربیع المرادی اور المزنی نے امام شافعی سے روایت کیا ہے۔

۲۔ **الأظهر**: امام شافعیؒ کے دو یا دو سے زیادہ اقوال میں اختلاف کی صورت میں کونسا قول زیادہ قوی ہے۔ یہی مقابلہ قوت کو ظاہر کرتا ہے۔

۳۔ **المشهور**: امام شافعیؒ کے اقوال میں جو مشہور ہو۔ ان اقوال میں اختلاف نمایاں نہیں ہوتا۔ مشہور کا مقابل اپنے ضعف کی وجہ سے غریب کہلاتا ہے۔

۴۔ **الأصح**: دو یا دو سے زیادہ صورتوں میں صحیح ترین قول۔ یہ اقوال وہ ہوتے ہیں جنہیں شوافع امام شافعیؒ کے بنائے ہوئے اصول کی بناء پر ان کے کلام سے نکال لاتے ہیں۔ یا پھر ان کے قواعد سے استنباط کرتے ہیں۔ جو صورت مذکورہ ہوتی ہے اس میں اختلاف نمایاں ہوسکتا ہے۔ اس کا مقابل صحیح کہلاتا ہے۔

۵۔ **الصحيح**: دو یا دو سے زیادہ صورتوں میں کون صحیح ہے اور کون ضعیف؟ شوافع علماء میں یہ اختلاف کوئی زیادہ قوی نہیں ہوتا۔ اس کا مقابل ضعیف ہوتا ہے۔

۶۔ **المذهب**: دو یا دو سے زیادہ آراء کی صورت میں کسی ایک رائے کے اظہار میں اس طرح کا اختلاف کہ کوئی ایک مسئلہ میں دو قول یا دو صورتیں پیش کر رہا ہے۔ اور کوئی ان میں سے ایک کی تردید کر رہا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تردید راجح ہو یا نہ ہو۔

۷۔ **النص**: اس سے مراد امام شافعیؒ کی اپنی کوئی بیان کردہ نص۔ اس کا مقابل وجہ ضعیف، یا مُخرج ہوتا ہے۔ بہرحال کبھی افتاء بغیر نص کے بھی ہوسکتا ہے۔

۸۔ **الجديد**: قدیم مذہب کی مقابل یہ اصطلاح ہے جس سے مراد وہ قول ہے جو امام محترم نے مصر میں تالیف یا افتاء میں بیان فرمایا۔ امام محترم کے جدید اقوال کے راوی: البویطی، المزنی، الربیع المرادی، حرملہ، یونس بن عبدالأعلی، عبداللہ بن الزبیر المکی اور محمد بن عبداللہ بن الحکم وغیرہ ہیں۔ پہلے تین وہ اصحاب ہیں جنہوں نے اصل بوجھ اٹھایا۔ باقی خوشہ چین ہیں۔

۹۔ **القديم**: یہ وہ اقوال ہیں جو امام محترمؒ نے عراق میں اپنی کتاب الحجة کو تصنیف کرتے دوران لکھے یا دہیں کوئی فتویٰ دیا۔ قدیم اقوال کے رواۃ میں مشہور شاگرد: امام احمدؒ بن حنبل، الزعفرانی، الکرابیسی، ابوثور وغیرہ ہیں۔ امام شافعیؒ نے ان تمام قدیم اقوال سے رجوع کر لیا تھا اس لئے ان کے مطابق فتوی دینا جائز نہ ہوگا۔

......بعض شوافع نے امام شافعیؒ کے قدیم قول کے مطابق سترہ مسائل میں فتویٰ دیا ہے۔

...... رہے وہ اقوال جو مصر اور عراق کے درمیان انہوں نے ارشاد فرمائے تو ان میں متاخر قول جدید شمار ہوگا اور متقدم قول قدیم شمار ہوگا۔ اور اگر کسی مسئلہ میں قدیم وجدید دونوں پائے جائیں تو جدید معمول بہ ہوگا سوائے سترہ مسائل کے جو امام شافعیؒ نے قدیم قول کے مطابق دیئے۔

۱۰۔ **قولا الجدید:** مراد دو جدید قول، مفتی ان اقوال میں آخری قول کے مطابق فتوی دے گا بشرطیکہ اسے علم ہو۔ اور اگر اسے علم نہیں مگر امام شافعیؒ نے ان دونوں میں سے ایک پر عمل کیا ہے تو یہی عمل دوسرے کے ابطال کے لئے کافی ہوگا۔ یا ترجیح عملی قول کو دی جائے گی۔

۱۱۔ **الشیخان** : اس سے مراد امام رافعیؒ اور امام نوویؒ ہیں۔

۱۲۔ اختلافی اصطلاحات:

فقہ شافعیؒ میں اختلاف تین قسم کے ہیں۔

...... **الأقوال:** جو امام شافعیؒ کی طرف منسوب ہیں۔

...... **الأوجه:** یہ وہ آراء ہیں جنہیں فقہاء شافعیہ نے امام شافعیؒ کے اصول اور قواعد کی روشنی میں مستنبط کیا ہے۔

.... **الطرق:** مذہب کے بیان میں راویوں کا اختلاف مراد ہے۔

امام نوویؒ نے فقہاء شافعیہ کے ہاں اختلاف کی صورت میں ان کے اقوال بیان کرنے، شوافع کی مختلف مخرج صورتوں کی وضاحت اور ان کے درمیان ترجیح قائم کرنے کے یہی طریقے متعارف کرائے ہیں۔

۱۳۔ مذہب شافعی کی ضعیف باتوں پر عمل کرنا جائز نہیں۔

۱۴۔ کسی مسئلہ میں تلفیق بھی ممنوع ہے۔

تبصرہ: ہم اوپر پڑھ آئے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صرف رخصتیں تلاش کرنا بھی فسق نہیں تو حق کی طلب اور نصوص شریعت کی بالا دستی کے لئے مختلف مذاہب کی باتیں اور مسائل اختیار کرنا کیسے غلط ہوگا۔؟ تلفیق کے بارے میں یہ شدت جو شوافع اور دیگر فقہاء میں نظر آرہی ہے کہیں: ﴿وقالوا كونوا هودا أو نصارى تهتدوا﴾۔ وہ کہتے ہیں یہودی یا عیسائی ہو جاؤ ہدایت پالو گے۔ یعنی ہدایت پانے کے لئے کیا یہ ضروری ہے کہ کسی ایک مسلک کے ساتھ چمٹا جائے ورنہ گمراہ ہوگے اور دوسروں کو بھی کرو گے۔

تقابلی جائزہ: عبادات وغیرہ کے متعلق ذیل میں ایک تقابلی جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔ تاکہ طلبہ دونوں مذاہب کے

مسائل کو علیحدہ علیحدہ جان لیں اور اس اختلاف کو بآسانی سمجھ سکیں:

حنفی مسائل:

☆...... وضوء بغیر نیت اور بغیر ترتیب کے جائز ہے۔

☆...... کھجور کے شیرہ سے جب پانی نہ ہو تو وضوء جائز ہے۔

☆...... وضوء و غسل میں کلی کرنا اور ناک میں پانی دینا فرض ہے۔

☆...... اگر بحالت نماز قہقہہ لگ جائے تو وضوء بھی ٹوٹ جائے گا اور نماز بھی۔

☆...... بحالت روزہ وضوء میں کلی کرتے وقت بے اختیار اور بھول کر پانی حلق میں اتر جائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

☆...... نفل روزہ کی قضاء بھی فرض کی طرح ہے۔

☆...... امام کے پیچھے سورہ فاتحہ جہری یا سری نماز میں نہیں پڑھنی چاہئے

☆...... بیماری و سفر کی حالت میں جمع بین الصلوتین جائز نہیں ہے۔

☆...... قربانی واجب ہے اور استطاعت والے پر ایک بکرا ہے۔

☆...... کوئی زبردستی شوہر کو پکڑ کر طلاق لکھوا لے تو جائز ہے اور طلاق ہو جائے گی۔

شافعی مسائل

☆...... بغیر نیت اور بغیر ترتیب کے وضوء صحیح نہیں ہوتا۔

☆...... بغیر پانی کے وضو درست نہیں ہوتا۔

☆...... یہ دونوں فعل فرض نہیں۔ (کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا)

☆...... قہقہہ کی صورت میں وضوء نہیں ٹوٹے گا۔ نماز فاسد ہو جائے گی۔

☆...... بھول کر یا بلا ارادہ کلی کرتے وقت اگر پیٹ میں پانی چلا جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔

☆...... نفل روزہ کی قضاء لازمی نہیں۔

☆...... ہر نماز میں مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنی چاہئے ورنہ نماز نہیں ہوتی۔

☆...... بیماری یا سفر کی حالت میں جمع بین الصلوتین جائز ہے۔

☆...... قربانی مسنون ہے اور ہر گھر کا سربراہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک بکرا قربان کر سکتا ہے

☆...... جبری طلاق لغو اور باطل ہے۔

وفات: امام ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کو آخری عمر میں بواسیر کی سخت شکایت ہو گئی تھی۔ ایک مشہور واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ فتیان بن ابی السمح جو انتہائی متعصب مالکی تھے انہوں نے ایک مناظرے میں

امام محترم سے علمی شکست کھائی تھی۔ مگر انہوں نے بعد میں موقع پا کر رات کے اندھیرے میں امام محترم کے سر پر لوہے کا ایک گرز دے مارا جس سے امام محترم کا سر پھٹ گیا۔ طبیعت پہلے ہی کمزور تھی۔ اس تکلیف نے مزید نڈھال کر دیا۔ دوسری طرف مالکی فقیہ اشہب بن عبدالعزیز مسلسل سجدہ میں پڑ کر آپ کے لئے بددعا کرتا رہا کہ الٰہی! شافعی کو اٹھا لے ورنہ ہمارا مالکی مسلک فنا ہو جائے گا۔ امام محترم کو جب اس کا علم ہوا تو فی البدیہہ دو اشعار کہے:

تَمَنَّى رِجَالٌ بِأَنْ أَمُـــوتَ فَإِنْ أَمُتْ فَتِلْكَ سَبِيـــلٌ لَسْتُ فِيْهَا بِأَوْحَدِ

وَقَـدْ عَلِمُوا لَو يَنْفَـــعُ الْعِلْمُ عِنْدَهُمْ لَئِـنْ مِتُّ مَا الـدَّاعِيْ عَلَيَّ بِمَخْلَدِ

لوگ تمنا کرتے ہیں کہ میں مر جاؤں۔ اگر میں مر بھی گیا تو یہ راہ ایسی ہے جس کا راہی صرف میں نہیں ہوں۔ اگر علم لوگوں کے لئے نفع بخش ثابت ہو تو وہ یہ مان لیں کہ میں اگر مر بھی گیا تو مجھے بددعا دینے والا بھی باقی رہنے کا نہیں۔

آپ کی طبیعت جب بہت زیادہ بگڑی تو پاس بیٹھے شاگرد امام مزنیؒ نے خیریت دریافت کرتے ہوئے عرض کی:

كَيْفَ أَمْسَيْتَ يَا أُستاذَ الأَستاذِينَ؟ اساتذہ کے استاذ! آپ کا دن کیسے گذرا؟ جواب میں فرماتے ہیں:

أَصْبَحْتُ مِنَ الدُّنْيَا رَاحِلاً فَلِلإِخْوَانِ مُفَارِقًا، وَبِسُوءِ أَفْعَالِي مُلَاقِيًا، وَعَلَى اللّٰهِ وَارِدًا، وَلَكَأْسُ الْمَنِيَّةِ شَارِبًا، وَلَا وَاللّٰهِ لَا أَدْرِيْ أَنَّ رُوحِيْ يَصِيرُ إِلَى الْجَنَّةِ فَأُهَنِّئُهَا أَوْ إِلَى النَّارِ فَأُعَزِّيْهَا۔ آج میں دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں، اور اپنے بھائیوں کو چھوڑنے والا بھی۔ ہائے! اپنے برے اعمال کی سزا بھی پانے والا ہوں اور اللہ بزرگ و برتر کی بارگاہ میں پیش ہونے والا بھی ہوں اور موت کا پیالہ ابھی پینے والا ہوں۔ واللہ! میں نہیں جانتا آیا میری روح جنت میں جائے گی کہ میں اسے مبارک باد دوں یا اس کا مقام دوزخ ہے کہ میں اس سے تعزیت کروں۔

نماز مغرب سے فراغت کے بعد لیٹے ہی تھے کہ نزع کی کیفیت شروع ہوگئی۔ بہت الحاح کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں پھر عرض گزار ہوئے۔ عشاء کی نماز ہمت کرکے پڑھی اور فراغت کے بعد پھر گڑگڑا کر دُعا مانگی۔ دُعا سے فارغ ہو کر لیٹے ہی تھے کہ روح مبارک بآسانی نکل گئی۔ اور اس طرح امام محترمؒ خدمت دین سے بھرپور اپنی یہ مختصر زندگی گزار کر دار فانی میں جا پہنچے۔ نماز جمعہ کے بعد آپ کی نماز جنازہ سب سے پہلے سیدہ نفیسہ بنت حسن نے ادا کی اور پھر ساری خلقت نے۔ اور یوں بعد از عصر آپ کو قاہرہ کے جبل مقطم کے قبرستان قرافۃ الصغری میں دفن کیا گیا۔

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ آمین

☆☆☆☆☆

امام احمد بن حنبلؒ (۱۶۴۔۲۴۱ھ)

ابوعبداللہ الشیبانی، بغداد میں ربیع الاول ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے دور کے سب سے بڑے عالم حدیث، مجتہد تھے۔ سنت نبوی سے عملی وعلمی لگاؤ تھا اس لئے امت سے امام اہل السنۃ کا لقب پایا۔ زہد واستغناء ایسا مثالی تھا کہ جذبہ جہاد سے ہروقت معمور رہتے۔ آپ کے والد محترم بھی فوج کے ایک سپاہی تھے جو جوانی میں ہی انتقال کر گئے۔ اس وقت ان کی عمر دو برس کی تھی۔ والدہ محترمہ نے تربیت وتعلیم کی ذمہ داری کو نبھایا اور پوری نگہداشت کی اور ابتدائی تعلیم بغداد میں ہی دلائی۔

تعلیم وسماعت حدیث: سولہ برس کی عمر میں آپ نے حدیث کی سماعت شروع کی۔ امام ابو یوسفؒ کے حلقہ درس میں بیٹھے۔ ۱۸۰ھ میں سب سے پہلا حج کیا۔ پھر حجاز آمدورفت رہی اور علماء حجاز سے علم سیکھتے رہے۔ ۱۹۶ھ میں یمن جا کر امام عبدالرزاق الصنعانیؒ سے احادیث سنیں۔ یہاں امام یحییٰؒ بن معین اور اسحق بن راہویہؒ بھی ان کے شریک درس رہے۔ آپ کوفہ بھی تشریف لے گئے۔ مسافرت برائے حدیث میں تنگدستی بھی دیکھی۔ ان دنوں جس جگہ قیام پذیر رہے سر کے نیچے سونے کے لئے اینٹ رکھا کرتے۔ کہا کرتے کاش میرے پاس دس درہم ہوتے میں حدیث سننے کے لئے جریر بن عبدالحمید کے پاس رے چلا جاتا۔ امام شافعیؒ خود فرماتے ہیں انہوں نے مجھ سے مصر آنے کا وعدہ کیا مگر معلوم نہیں کس وجہ سے نہیں آسکے شاید وجہ بے زری ہوگی۔ بایں ہمہ امام محترم تقریباً سارے اسلامی ممالک میں گھومے اور اپنے وقت کے بیشتر مشائخ سے احادیث حاصل کیں۔ زمانہ طالب علمی میں ہارون الرشید کی طرف سے یمن کا قاضی بننے کی پیش کش ہوئی جسے انہوں نے قبول نہ کیا۔ ۱۹۹ھ میں امام شافعیؒ جب دوسری بار بغداد تشریف لائے تو امام احمدؒ سے انہوں نے کہا: اگر تمہارے پاس، کوئی صحیح حدیث حجاز، شام، یا عراق کہیں کی ہو مجھے مطلع کرو۔ میں حجازی فقہاء کی طرح نہیں ہوں جو اپنے شہر کے علاوہ دیگر بلاد اسلامیہ میں پھیلی ہوئی احادیث کو غیر مصدقہ سمجھتے ہیں۔ اس وقت امام احمدؒ کی عمر چھتیس برس کی تھی۔

اساتذہ: آپ کے اساتذہ کی ایک خاصی تعداد ہے جن سے فقہ وحدیث کا علم حاصل کرتے رہے۔ ان میں قاضی ابو یوسفؒ، امام شافعیؒ، سفیانؒ بن عیینہ، یحییٰؒ بن سعید القطان، عبدالرحمٰن بن مہدیؒ، اسمٰعیلؒ بن علیہ، ابوداؤد طیالسیؒ اور وکیعؒ بن الجراح جیسی نابغہ روزگار شخصیات ہیں جو اپنے مقام اور مرتبے کے اعتبار سے نہ صرف روایت ودرایت

حدیث میں سب سے آگے ہیں بلکہ فقاہت کے اعتبار سے بھی وہ اجتہاد کے مقام کو پہنچتے ہیں۔ امام محترم نے حدیث حفظ کی اور جمع بھی کی۔ اس ذوق نے انہیں اپنے وقت کا امام حدیث اور مجتہد بنا دیا۔ امام ابراہیم الحربی کہتے ہیں: میں نے امام احمد کو دیکھا یوں لگتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں علم اولین وآخرین جمع کر دیا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: میں جب بغداد سے نکلا تو اپنے پیچھے سب سے زیادہ متقی اور فقیہ انسان احمدؒ بن حنبل ہی کو چھوڑا۔

تلامذہ: بہت سے علماء نے آپ سے علم حاصل کیا۔ خصوصیت کے ساتھ آپ سے فقہ اور اجتہادات کو اخذ کرنے والے ایک سو بیس سے زیادہ فقہاء شاگرد ہیں۔ جنہوں نے اپنے شیخ کی فقہ اور اجتہادات کو سارے عالم میں پھیلایا۔ ان میں ان کے اپنے بڑے صاحب زادے صالح بن احمد ہیں جنہوں نے اپنے والد محترم سے علم فقہ وحدیث کو حاصل کیا اور دیگر اساتذہ سے بھی وہ مستفید ہوئے۔ ۲۶۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ابوبکر أحمدؒ بن محمد الخراسانی جو الأثرم کے نام سے معروف تھے، انہوں نے بھی امام احمدؒ سے بہت سے فقہی مسائل روایت کئے ہیں اور بہت سی احادیث بھی۔ اپنے وقت کے فقہاء وحفاظ حدیث میں شمار ہوتے ہیں۔ سن ۲۷۳ھ میں آپ فوت ہوئے۔ ایک اور شاگرد عبدالملک بن عبدالحمید بن مہران المیمونی جو امام محترم کی صحبت میں بیس سال سے زائد عرصہ تک رہے۔ امام محترم کے شاگردوں میں یہ بہت جلیل القدر شمار ہوتے ہیں۔ ان کا انتقال سن ۲۷۴ھ میں ہوا۔ اسی طرح امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور امام ابوداؤدؒ بھی آپ کے تلمذ پر متفخر تھے۔

تقویٰ: امام بیہقیؒ لکھتے ہیں: امام احمدؒ اپنے چچا اور اپنے بیٹے کے پیچھے نماز نہیں پڑھا کرتے تھے اور نہ ہی ان میں سے کسی کے گھر کھانا کھاتے۔ وجہ یہ تھی کہ ان دونوں نے بادشاہی مناصب قبول کر رکھے تھے۔ بڑے تاجر آ کر آپ کی خدمت میں دینار پیش کرتے مگر بالکل قبول نہ کرتے۔ یمن میں طالب علمی کے دوران ان کی مالی حالت بہت کمزور تھی آپ کے شیخ امام عبدالرزاقؒ نے اس خبر پر جب خاموشی سے ان کی مٹھی میں کچھ دینا چاہا تو لینے سے انکار کر دیا اور کہا: اللہ میری ضروریات پوری کر دیتا ہے۔ ان کی صحبت لوگوں کو آخرت یاد دلا دیتی۔ دنیاوی باتوں میں بالکل نہیں الجھتے تھے۔ متوکل کون ہوتا ہے؟ اس کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: جو غیر اللہ سے ہر قسم کی توقعات ختم کر دے۔ دلیل پوچھی گئی تو فرمایا: سیدنا ابراہیم علیہ السلام جب منجنیق پر چڑھائے گئے تو جبریل امین نے آ کر مدد کے لئے کہا تو فرمایا: ہاں مدد تو چاہئے مگر تم سے نہیں۔ جبریل علیہ السلام نے عرض کی تو آپ اسی سے کہئے جس سے آپ کہنا چاہتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میرے لئے وہی امر پسندیدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ

ہے۔فرمایا کرتے: فقر ایک ایسا عظیم مرتبہ ہے جسے اکابر کے سوا اور کوئی نہیں پا سکتا۔اپنی دعاؤں اور سجدوں میں اکثر گڑگڑاتے اور فرماتے: اے اللہ! اگر گنہگاران امت محمد یہ کا تو کوئی فدیہ چاہتا ہے تو مجھی کو ان کا فدیہ بنالے۔

فتنہ خلق قرآن: خلیفہ مامون نے معتزلی علماء کے اکسانے پر علمائے امت کو ایک خط لکھا جس میں قرآن کو مخلوق اور محدَث ماننے کی بہ جبر دعوت تھی۔ انکار کی صورت میں سختیاں شروع کر دیں، معاش بند کر دیا اور سخت سزاؤں کی دھمکی بھی دی۔ بہت سے جبراً قائل ہوگئے کہ قرآن مخلوق ہے۔مگر امام احمدؒ اور محمدؒ بن نوح نیسابوری نے اس نظریے کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔آزمائش کے اس مرحلے پر دونوں ثابت قدم رہے بلکہ کندن بن کر نکلے اور بڑا رتبہ بھی پایا مگر درجہ بدرجہ۔ جتنا ایمان اتنی آزمائش، جو تا حیات قائم رہتی ہے حالانکہ وہ گناہ گار نہیں ہوتا۔آپ ﷺ کا یہ ارشاد انہیں از بر تھا: یہ دنیا ہمیشہ مصائب اور فتنے دکھایا کرتی ہے۔بعد کے ادوار میں مصائب کی شدت تیز تر ہوگی۔

خلیفہ مامون نے سب علماء کو بلا بھیجا۔کمزور لوگ حکومت کی سطوت اور قہر کے آگے گردن خم کر بیٹھے۔امام احمد اور محمد بن نوح نے جب نہ مانا تو دونوں حضرات کو اونٹ پر سوار کر کے مامون کے ہاں لے جایا گیا۔راستہ میں ایک بدو نے نصیحت کرتے ہوئے کہا: آپ مسلمانوں کی نمائندگی کرنے جارہے ہیں۔سب کی نظر آپ پر ہے۔ اللہ آپ مسلمانوں کو رسوانہ کیجئے گا۔اللہ آپ کا دوست ہے صبر کیجئے گا۔ جنت آپ اور آپ کے شہید ہونے کی دیر تک ہے۔ موت تو بہر حال آنی ہے اس فتنہ میں آپ اگر کامیاب ہو گئے تو دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں گی۔امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ نصیحتیں میرے دل کو لگ گئیں اور میں نے مامون کے خیالات کی نفی کا پورا عزم کر لیا۔

مامون کے ہاں جب یہ دونوں حضرات پہنچے تو قریب ہی ایک جگہ میں انہیں ٹھہرا دیا گیا۔خادم نے اطلاع دی کہ مامون نے رسول اللہ سے قرابت کا واسطہ دے کر قسم کھالی ہے: اگر احمدؒ نے خلق قرآن کا اقرار نہ کیا تو اسی تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا۔امام احمدؒ نے یہ سنتے ہی گھٹنے زمین پر ٹیک دیے اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور عرض کی: خدایا! اس فاجر کو تیرے حلم نے بہت مغرور کر دیا ہے کہ وہ اب تیرے دوستوں پر بھی تلوار اٹھاتا ہے۔خدایا! اگر تیرا کلام غیر مخلوق ہے تو تو مجھے اس پر ثابت قدم رکھ میں اس کے لئے ہر مصیبت سہنے کو تیار ہوں۔اسی رات صبح ہونے سے پہلے مامون کا انتقال ہو گیا۔مگر معتصم خلیفہ بن گیا۔اس نے محمد بن ابی دؤاد کو اپنا وزیر اور قوت بازو بنایا۔اس طرح معتصم، مامون سے بھی زیادہ اس نظریے کے لئے سخت گیر ثابت ہوا۔اس نے امام محترم کو دیگر قیدیوں کے ساتھ بیڑیاں باندھ کر ایک کشتی میں پایہ تخت بغداد بھیج دیا۔محمدؒ بن نوح راستہ میں ہی انتقال کر گئے۔

امام محترم جب بغداد پہنچے تو پاؤں میں بوجھل بیڑیاں تھیں جن کی وجہ سے چلنا دشوار تھا۔ سخت علیل ہو گئے۔ قید خانہ میں ڈال دیے گئے اور تیس ماہ قید میں رہے۔ پھر معتصم کے پاس انہی بیڑیوں میں لائے گئے۔ سُرَّمَنْ رَأی (گلبرگ) میں ایک کمرہ میں بند کر دیا گیا۔ جس میں اندھیرا ایسا تھا کہ کوئی چیز نظر نہ آتی۔ رب کے حضور نماز شکرانہ ادا کی۔ امام محترم فرماتے ہیں: معتصم کے پاس اسی حالت میں مجھے لے جایا گیا۔ میں نے سلام کے بعد گفتگو کی اور کہا کہ آپ کے نانا محترم کا کیا پیغام تھا؟ معتصم نے کہا لا إله إلا الله کی طرف۔ تھوڑی گفتگو کے بعد معتصم نے عبد الرحمٰن معتزلی کو کہا کہ ان سے پوچھو۔

عبدالرحمٰن نے مجھ سے کہا: قرآن کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ میں چپ رہا۔ لیکن معتصم نے اصرار کیا جواب دو تو میں نے کہا: باری تعالیٰ کے علم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ اس نے جواب نہ دیا۔ میں نے کہا: قرآن اللہ کا علم ہے اور جس نے اللہ کے علم کو مخلوق کہا اس نے کفر کیا۔ کفر کے لفظ سے یہ جماعت بڑی سیخ پا ہوئی اور معتصم سے کہا: دیکھئے اس نے آپ کو اور ہم سب کو کافر کہہ دیا۔ مگر معتصم نے توجہ نہ دی۔ پھر عبدالرحمٰن نے سوال کیا: یہ بتاؤ ایک زمانہ تھا جب اللہ تھا اور قرآن نہ تھا۔ میں نے جواباً کہا: کیا ایسا تھا کہ خدا تھا اور اس کا علم نہ تھا؟ عبدالرحمٰن چپ ہو گیا۔ بہر حال وہ جو دلائل دیتے میرے سوال یا جواب میں وہ خاموش ہوتے رہے اور بدتمیزی و بدکلامی بھی کرتے رہے۔ اور خلیفہ کو بہکاتے بھی۔ میں کہتا: دین کی بنیاد کتاب وسنت کے علاوہ کسی تیسری چیز پر نہیں ہے۔ مگر ابن ابی دؤاد کہتا: بحث کا دارومدار نقل کے علاوہ عقل پر بھی ہونا چاہیے۔ اسی طرح دوسرے اور تیسرے دن گفتگو ہوتی رہی۔ آخری دن امام محترم کی آواز ان سب کی آوازوں سے بھاری اور اونچی رہی جو معتزلی فقہاء اور قضاۃ کی تھی۔ وہ لاجواب رہے۔ اور خلیفہ مجھے یہی کہتا رہا کہ تم میرے مسلک کی تائید کرو میں تمہیں مقرب خاص بنالوں گا۔ میں نے یہی کہا: کہ اگر کوئی دلیل قرآن وحدیث سے پیش کر دیجئے تو میں ماننے کو تیار ہوں۔ بعد ازاں خلیفہ نے میرے ہاتھ پاؤں بندھوا دیے اور مجھے کوڑے برسوائے۔ میں بار بار بے ہوش ہوا۔ جب پہلا کوڑا برسا میں نے بِسْمِ اللّٰهِ کہا۔ جب دوسرا پڑا تو لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ کہا اور جب تیسرا پڑا تو کہا: ﴿قل لن يصيبنا إلا ما كتب الله لنا﴾۔ بے ہوش ہوتا تو چھوڑ دیا جاتا۔ ہوش میں آتا تو دوبارہ مارنا شروع کر دیتے۔ میں جلد بے ہوش ہونے لگا تو معتصم ڈر گیا کہ کہیں اب یہ فوت ہی نہ ہو جائیں۔ اس نے ضرب بند کرا دی۔ جب ہوش آیا تو معتصم کے ایک کمرہ میں ہی خود کو بغیر سلاسل کے آزاد پایا۔ یہ واقعہ ۲۵ رمضان ۲۲۱ھ کا ہے۔

مجھے گھر پہنچانے کا خلیفہ نے حکم دیا۔ راستہ میں اسحٰق بن ابراہیم کے ہاں ٹھہرے۔ کہتے ہیں کہ میں صائم تھا۔ کپڑے خون آلود تھے اسی حالت میں نماز ادا کی۔ ابن سماعہ نے کہا کہ آپ نے خون کے کپڑوں میں نماز ادا کی؟۔ میں نے کہا: ہاں! سیدنا عمرؓ نے خون بہنے کی حالت میں نماز ادا کی تھی اور ان کے زخم کا خون فوارہ کی صورت میں نکل رہا تھا۔ کوڑوں کے ضرب کی وجہ سے ہاتھ اور ہونٹوں پر سردی کا اثر تا وفات رہا۔

خراج عقیدت: امام ابن المدینیؒ نے آزمائش کی اس گھڑی پر امام کی ثابت قدمی پر کہا: اللہ تعالیٰ نے اسلام کو دو بندوں کی وجہ سے بڑی عزت عطا فرمائی۔ ابوبکرؓ صدیق سے جو یوم الردۃ (جنگ یمامہ) کے دن ثابت قدم رہے۔ اور امام احمدؒ سے جنہوں نے محنہ (آزمائش) کے موقع پر اسلام کو سرفراز فرمایا۔ امام بشر الحافی نے فرمایا: امام احمدؒ نے اس امت میں نبوت کے فرائض سرانجام دیئے ہیں۔ ابوالولید الطیالسیؒ نے کہا: اگر احمدؒ بنو اسرائیل میں پیدا ہوتے تو کچھ بعید نہ تھا کہ وہ نبی ہوتے۔

عقیدہ: امام محترم ٹھوس اسلامی عقائد کے قائل تھے۔ قرآن پر کسی چیز کو مقدم نہ کرتے۔ اسے غیر مخلوق بلکہ لوح محفوظ میں جو کچھ ہے وہ بھی غیر مخلوق قرار دیتے۔ اس کے بعد حدیث رسول ﷺ کا مرتبہ ہے۔ اور آپ ﷺ کی حدیث کے ساتھ صحابہ وتابعین کے آثار بھی قابل قبول ہیں۔ آپ ﷺ جو کچھ لائے ہیں اس کی تصدیق اور آپ ﷺ کی سنت کی اتباع میں ہی نجات ہے۔ قضاء وقدر، خیر وشر سب اللہ کی جانب سے ہیں۔ اگر کسی نے فرض کو سستی ولا پروائی سے ترک کر دیا تو اللہ کو اختیار ہے بخش دے یا اسے عذاب دے۔ ایمان، قول وعمل اور دلی تصدیق کا نام ہے۔ میزان حق ہے۔ صراط حق ہے۔ جنت ودوزخ برحق ہیں۔ عیسیٰ بن مریم کا نزول برحق ہے۔ حوض حق اور شفاعت بھی حق ہے۔ عرش وکرسی برحق ہیں۔ ملک الموت پر میرا ایمان ہے۔ دجال یقیناً آئے گا۔ عیسیٰ بن مریم دنیا میں آئیں گے اور باب لد پر دجال کو قتل کریں گے۔

آپ ﷺ کے بعد سیدنا ابوبکرؓ جیسا کوئی نہیں۔ ان کے بعد سیدنا عمرؓ جیسا اور ان کے بعد عثمانؓ جیسا کوئی نہیں۔ بغیر ولی نکاح صحیح نہیں۔ متعہ (وقتی نکاح) قیامت تک کے لئے حرام ہے۔ وغیرہ

وفات: ۲۴۱ھ ربیع الاول میں مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ وفات سے قبل امام محترم نے وصیت لکھی اور کی بھی۔ جس کے الفاظ یہ تھے:

بِسمِ اللّٰهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِيمِ هٰذا مَا أَوْصَى أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ أَوْصَى أَنَّهُ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا

شَرِيْكَ لَهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ، أَرْسَلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ، وَأُوْصِيْ لِأَهْلِيْ وَقَرَابَتِيْ أَنْ يَعْبُدُوا اللّٰهَ وَأَنْ يَحْمَدُوْهُ وَأَنْ يَنْصَحُوا لِجَمَاعَةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَأُوْصِيْ أَنِّيْ قَدْ رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا۔ شروع اللہ کے نام سے جونہایت مہربان اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ یہ وصیت ہے جو احمد بن حنبل نے کی ہے: وہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں، وہی اکیلا ہے اس کی ولایت وعبادت میں کوئی شریک نہیں اور یہ بھی گواہی دیتا ہے کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور دین حق دے کے بھیجا تا کہ وہ اس دین کو تمام مذاہب پر غالب کردے خواہ مشرکوں کو یہ بات کتنی ہی ناگوار ہو۔ اور میں اپنے اہل اور قرابت داروں کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اللہ عزوجل کے عبادت کریں اس کی حمد وثنا بیان کریں اور اہل اسلام کی جماعت کی خیر خواہی کریں اور میں اعلان کرتا ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے رسول ہونے پر دل وجان سے راضی ہوں۔

وفات سے قبل اپنا وضو کرایا، اور ہر حصے کو اچھی طرح دھلوایا۔ پیر کی انگلیوں کا خلال تک کیا۔ درمیان میں اللہ کا ذکر کرتے رہے جب وضو مکمل ہوا تب فوت ہوگئے۔ جمعہ کا دن تھا۔ عمر تقریباً (۷۷) ستتر سال تھی۔ تجہیز وتکفین سب کچھ اولاد نے خرید کر کی۔ جنازہ میں سات لاکھ لوگ شریک ہوئے جن میں اکثریت اہل علم کی تھی۔ علماء اس وقت کہا کرتے تھے: بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْجَنَائِزُ ہمارے اور دوسروں کے درمیان جنازے ہی تو فرق کیا کرتے ہیں۔

فقہ حنبلی کے اصول: امام محترم نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے کچھ ایسے اصول اختیار کئے جو بعد میں فقہ حنبلی کی اساس قرار پائے۔ یہ پانچ اصول ہیں جو آپ کے فتاوی میں واضح طور پر ملتے ہیں اور انہی پر ہی آپ کی فقہ کا دارومدار تھا۔ امام محترم اگر دلائل کو متعارض پاتے تو بالکل فتوی نہ دیتے۔ اور اگر کسی مسئلے میں صحابہ کرام کا اختلاف ہوتا یا کوئی حدیث آپ کے علم میں نہ ہوتی یا کسی صحابی یا تابعی کا قول نہ ملتا تو توقف فرماتے۔

جس مسئلے میں سلف سے کوئی اثر نہ ملتا تو بھی فتوی نہیں دیتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے: اس مسئلے پر رائے دینے سے بچو جس میں تمہارے پاس کوئی راہنما نہ ہو۔ جب مسائل کا جواب دیتے یا لکھتے تو کھلے دل سے فقہاء محدثین کے فتاوی کو اور امام مالکؒ اور اصحاب مالکؒ کے فتاوی وغیرہ کو بطور دلیل کے پیش کردیا کرتے۔ ایسے فتوی سے روکا کرتے جس میں حدیث سے اعراض نظر آتا ہو یا حدیث کے مطابق وہ فتوی نہ ہو اور نہ ہی ایسے فتوی کو قابل عمل سمجھتے تھے۔ وہ پانچ اصول درج ذیل ہیں:

۱۔**نصوص**: نص کی جمع ہے جس سے مراد قرآن وحدیث سے کوئی دلیل جو نص کی صورت میں ہو۔ نص جب انہیں مل جاتی تو اسی کے مطابق فتوی دے دیا کرتے خواہ کسی نے بھی اس کے خلاف کہا ہو۔ حدیث صحیح پر کسی کے قول، عمل، رائے اور قیاس کو مقدم نہیں کیا کرتے تھے۔ نہ ہی اجماع کو وہ حدیث صحیح پر مقدم کرتے تھے۔ امام احمدؒ نے ایسے اجماع کو تسلیم ہی نہیں کیا جو صحیح حدیث کی موجودگی میں اس کے برعکس کیا گیا ہو۔ کسی مسئلے پر اجماع کے دعوے کو بھی تسلیم نہیں کیا کرتے تھے۔ اس لئے کہ جو یہ دعوی کر رہا ہے اسے کیا علم کہ علماء نے اس سے اختلاف کیا ہو۔ اور یا اس اختلاف کا علم اسے نہ ہوا ہو۔

۲۔**فتاویٰ صحابہ**: کسی صحابی کا فتوی مل جانے کے بعد اس کی مخالفت کسی اور صحابی سے نہ ملتی تو فتوی اس کے مطابق دیتے۔ ایسے فتوی کو اجماع تو نہ کہتے بلکہ یہ فرمایا کرتے: اس کے بارے میں مجھے کسی ایسی بات کا علم نہیں جو اس صحابی کی بات کو رد کرتی ہو۔ اس نوع کا کوئی فتوی آپ کو بھی اگر مل جاتا تو کسی کے عمل، رائے یا قیاس پر اسے مقدم نہیں کرتے تھے۔

۳۔ **اقوال صحابہ کا چناؤ**: جب اقوال صحابہ میں انہیں اختلاف نظر آتا تو اس صورت میں وہ اس صحابی کا قول لیتے جو کتاب وسنت کے قریب ترین ہوتا۔ اور اگر کسی کے قول کی کوئی موافقت نہ ملتی تو اس مسئلے میں اختلاف کا ذکر فرماتے مگر کوئی حتمی رائے نہ دیتے۔

۴۔**حدیث مرسل**: کسی مسئلے میں اگر صحیح حدیث نہ ہوتی تو امام محترم حدیث مرسل اور حدیث ضعیف سے بھی استدلال لیتے۔ ایسی حدیث کو تو وہ قیاس پر بھی ترجیح دے دیا کرتے۔ ضعیف حدیث سے مراد ان کے ہاں کوئی باطل حدیث، یا منکر حدیث، یا اس راوی کی حدیث نہیں جو متہم ہو کہ ایسی حدیث پر عمل ناگزیر ہو بلکہ ان کے نزدیک ضعیف حدیث، صحیح کی ایک قسم ہی ہے جو حسن کے درجے کی ہے۔ کیونکہ ان کے زمانہ میں حدیث کی دو ہی اقسام ہوا کرتی تھیں صحیح اور ضعیف۔ ضعیف حدیث کے کچھ مراتب تھے۔ جن کی ادنی قسم یہ ضعیف ہوا کرتی تھی جو بعد میں حسن کہلائی۔ جب کسی مسئلہ میں کوئی ایسا اثر نہ پاتے یا کسی صحابی کا کوئی قول نہ ملتا یا کوئی اجماع اس کے خلاف نہ ملتا جو اس ضعیف حدیث کو رد کر سکے تو قیاس کو ترجیح دینے کی بجائے اس پر عمل فرماتے۔ تمام ائمہ کی طرح ان کا بھی یہی اصول تھا کہ ضعیف حدیث کو قیاس پر مقدم رکھا جائے۔ (اعلام الموقعین ۱/۳۲)

۵۔**ضرورۃً قیاس**: جب کسی مسئلہ میں ان کے پاس کوئی نص نہ ہوتی اور نہ ہی قول صحابہ یا صحابی، نہ کوئی اثر مرسل یا

ضعیف، پھر آپ پانچویں اصول کی طرف توجہ فرماتے جسے قیاس کہتے ہیں۔اسے بھی امام محترم نے بوقت ضرورت استعمال کیا ہے۔ابوبکر الخلال کی کتاب میں ہے: امام احمدؒ فرماتے ہیں: میں نے امام شافعیؒ سے قیاس کے بارے میں دریافت کیا: تو انہوں نے فرمایا: ضرورت کے وقت اس کی طرف بھی رخ کیا جاسکتا ہے۔(اعلام الموقعین: ۳۲/۱)

معتمد کتب حنابلہ: یوں تو امام محترم نے بہت سی کتب چھوڑیں مگر حنابلہ حضرات کے نزدیک کچھ کتب اساسی حیثیت رکھتی ہیں۔جن میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ **المسند:** امام محترم نے اپنے پیچھے یہ کتاب ایک مسودے کی شکل میں چھوڑی جس میں تقریباً بیالیس ہزار احادیث ہیں۔سولہ سال کی عمر میں اس مقصد کے لئے ثقہ راویوں اور قابل اعتماد محدثین سے احادیث کو جمع کرنا شروع کیا اور عمر کے آخیر تک اس کتاب میں لگے رہے۔کہا کرتے: میں نے اس کتاب کو ایک امام و دلیل کے طور پر لکھا ہے جب لوگ سنت رسول میں اختلاف کرنے لگیں تو اس کی طرف رجوع کیا کریں۔ یہ تمام احادیث متفرق اوراق میں تھیں آخری عمر میں ان کے بیٹوں اور چند خاص شاگردوں نے اسے جمع کیا اور پھر امام محترم نے انہیں جو کچھ بھی لکھا تھا اسے املاء بھی کرادیا۔گو یہ سب اوراق مرتب نہیں تھے۔بعد از وفات ان کے بیٹے عبد اللہ اور شاگرد ابوبکر القطیعی نے اس کتاب میں اپنے دیگر اساتذہ سے سنی ہوئی بعض احادیث بھی شامل کرکے اسے روایت کیا اور یوں یہ کتاب شائع ہوگئی۔

۲۔ **مسائل الإمام أحمد** بروایت عبد اللہ بن احمد

۳۔ **مسائل الإمام أحمد** بروایت امام ابی داؤد سجستانی

۴۔ **مسائل الإمام أحمد** بروایت ابوالفضل صالح بن احمد

۵۔ **الجامع الكبير** از ابوبکر الخلال

۶۔ **مختصر الخرقي**

چند حنبلی اصطلاحات: امام احمدؒ کے شاگردوں نے امام محترم کی آراء کو نقل کرتے وقت بہت سی مصطلحات کا استعمال کیا ہے۔اسی طرح دیگر حنبلی مجتہدین کی آراء کو بھی کتب میں ملتی ہیں جن کی مراد اور مفہوم اپنا اپنا ہے۔ذیل میں ان کی مختصر تفصیل دی جاتی ہے۔

۱۔ **النص:** امام محترم نے کسی مسئلے کے بارے میں کوئی واضح حکم بتایا ہو اسے نص کہا گیا۔

۲۔ **التنبیه:** یہ امام محترم کا وہ قول ہوتا ہے جیسے کسی نے آپ سے کوئی مسئلہ پوچھا تو اس کے جواب میں انہوں نے ایک حدیث بیان کر دی جو اس حکم کا مفہوم بتا دیتی۔ ساتھ ہی امام محترم نے اس حدیث کو صحیح بھی کہہ دیا یا مزید تقویت دینے کے لئے اسے اصح کہہ دیا مگر اس حکم کے بارے میں صراحت سے خود کچھ نہ کہا۔ اسے تنبیہ کہا گیا ہے۔ تنبیہ...... ایماء، اشارہ اور توقف سے ملتی جلتی اصطلاح ہے۔

۳۔ **الروایة:** امام محترم کی منقول نص کو کہتے ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: امام احمدؒ کی صرف منقول روایات کو نصوص کہتے ہیں۔ ورنہ روایت میں امام احمدؒ کا قول بھی شامل ہے۔

۴۔ **القول:** ایسا حکم جو امام محترم نے بتایا نہ ہو بلکہ ان کی طرف منسوب ہو۔ اسے قول کہتے ہیں۔

قول اور روایت میں فرق: روایت منقول نص کو کہتے ہیں اور قول ان کی طرف منسوب حکم کو کہتے ہیں۔

۵۔ **تخریج:** حکم کو ایک مسئلہ سے منتقل کر کے اس مسئلہ کی طرف لے جانا جو اس سے ملتا جلتا ہو اور ان دونوں کے درمیان اس حکم میں برابری کر دینا۔ جیسے أقیموا الصلاۃ میں اقامت کے ساتھ باجماعت نماز کی فرضیت بھی برابر کر دی جائے۔ یہ تخریج اس صورت میں ممکن ہوتی ہے جب مسئلہ کے معنی کا فہم حاصل ہو جائے۔

تخریج اور قول میں فرق: امام محترمؒ کی طرف قول اس شرط پر منسوب ہوگا جب کہ وہ ان کا ہو۔ رہی تخریج تو وہ امام صاحب کے اصول سے حکم کے استخراج کا نام ہے۔

۶۔ **النقل:** امام محترمؒ کی نصوص کی روایت کو اور ان پر تخریج کو کہا جاتا ہے۔

۷۔ **الوجه:** امام محترمؒ کے اصولوں، یا ان کے ایماء، دلیل، تعلیل، یا امام احمدؒ کے کلام کے سیاق یا قوت کلام کا اتباع کرتے ہوئے کسی مسئلے کا قیاس کے ذریعے دوسرے ایسے حکم سے مسئلہ مستنبط کرنا جو اس سے ملتا جلتا ہو۔ وجہ کہلاتا ہے۔

۸۔ **الاحتمال:** وجہ کا ہم معنی ہے۔ فرق یہ ہے کہ وجہ میں فتوی دینا پڑتا ہے احتمال میں جزم نہیں ہوتا۔

۹۔ **المذهب:** اس سے مراد حنبلی مذہب میں معمول یہ شے ہے خواہ وہ امام کی طرف سے ہو یا حنبلی فقہاء کی طرف سے۔ خواہ وہ نص سے ثابت ہو یا ایماء و تخریج سے۔

۱۰۔ **ظاهر المذهب:** ایسا لفظ جس میں دو معنوں کا احتمال ہو مگر ان میں سے ایک دوسرے سے اظہر ہو، وہ ظاہر

کہلاتا ہے۔لہٰذا ان میں قوی معنی کو لینا ہی جائز ہوگا۔اس سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مشہور مذہب یہی ہے۔یہ لفظ اس وقت استعمال ہوگا جب کسی مسئلہ میں وہاں اختلاف ہو۔

۱۱۔ **التوقف:** کسی مسئلہ میں اگر کوئی قول نہ ہو تو دلائل کے تعارض کی صورت میں دیگر اقوال میں سے پہلے، دوسرے قول کو ترک کرنا اور نفی یا اثبات کو ترک کرنا اور کچھ نہ کہنا توقف کہلاتا ہے۔

۱۲۔ **الروایتان:** روایت کا تثنیہ ہے۔جب یہ کہا جائے کہ اس مسئلہ میں دو روایتیں ہیں تو اس سے مراد ایک روایت نص کے ساتھ ہے اور دوسری ایماء کے ساتھ۔ یا ایک اور نص سے تخریج کی گئی ہے۔یا وہ ایسی نص سے ہوگی جو ناپسندیدہ ہو۔اگر یہ کہا جائے کہ اس مسئلہ میں ایک روایت ہے تو اس سے مراد امام کی اس حکم میں ایک ہی نص ہوگی۔

۱۳۔ **القولان:** دونوں قول یا تو امام کی نص سے ہوں گے یا ان میں سے ایک نص سے ہوگا اور دوسرا ایماء سے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان میں اس کے برعکس وجہ ہو یا تخریج یا احتمال ہو۔

۱۴۔ **الوجھان:** وجہ تخریج کے بغیر نہیں ہوتی۔جب یہ کہا جائے کہ اس مسئلہ میں دو صورتیں ہیں تو اس سے مراد یہ ہوگا کہ امام محترمؒ کی اس مسئلے میں کوئی نص نہیں بلکہ ان کے اصحاب نے اس مسئلہ میں تخریج کر کے حکم لگایا ہے۔ایسی صورت میں ان اصحاب کے مابین اجتہادی اختلاف ہوا تو نتیجۃً ہر اجتہاد کی الگ الگ صورت ظاہر ہوئی۔

☆☆☆☆☆

ائمہ اربعہ کے فقہی مناہج پر تبصرہ

آپ نے ہر مسلک کے طریقہ استنباط واصول کا مطالعہ کیا۔تجزیہ یہی بتاتا ہے: کہ امام احمدؒ بن حنبل جو امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں اور دنیائے اسلام میں ایک مسلمہ امام ہیں۔انہوں نے اپنے شیخ محترم کے معین اصولوں کو تقریباً قبول کیا ہے اور عمل بھی کیا ہے۔صرف امام شافعیؒ کے اصولوں میں دو باتوں میں اضافہ کیا یا ترمیم کی۔

۱۔ہمارے قیاس سے اقوال صحابہ بہتر ہیں۔ ۲۔خبر واحد قابل عمل ہے۔

ان اصولوں کی وجہ سے امام احمدؒ بن حنبل کا امام شافعیؒ کے مسلک سے اختلاف بہت کم مسائل میں نظر آتا ہے۔امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب سے امام شافعیؒ نے تقریباً بیس فی صد مسائل میں اختلاف کیا ہے۔یہ اختلافات عبادات میں کم تر اور معاملات میں نمایاں ہیں۔حنفی مذہب سے امام شافعی رحمہ اللہ نے تقریباً ستر فی صد مسائل میں اختلاف

کیا ہے۔ یہ اختلافات عبادات، معاملات غرضیکہ ہر فقہی شعبہ میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی طرح امام محترم چاروں مصادر سے استنباط مسائل کرتے تھے اور انہیں قابل استدلال سمجھتے تھے۔ مگر آپ احناف کے استحسان کو اور مالکیوں کے مصالح مرسلہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

ائمہ اربعہ کے تراجم و فقہی واجتہادی سرگرمیوں کو پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان ائمہ کرام کے ادوار میں مسلمان پوری آزادی اور حریت فکر کے ساتھ سوچتے اور کسی خاص مذہب کے پابند نہ تھے کیونکہ ان ائمہ کرام نے نہ سینئرز کی پابندی کی اور نہ ہی خود کسی کو پابند کیا۔ عام مسلمان نے بھی دین میں کوئی ایسی شق نہ پائی جو ان ائمہ کرام میں سے کسی ایک کے استنباط واجتہاد کو حتمی حیثیت دیتی۔ باقی یہ سوچنا بھی محال ہے کہ ان ائمہ کرام نے اپنی ساری جدو جہد اپنے مذاہب کی ترویج کے لئے کی تھی۔ چہ جائے کہ مذہبی یا مسلکی پابندی کی بات ہو۔ نیز نقطہ نظر کے اختلاف کو جس طرح انہوں نے اپنے لئے پسند فرمایا دوسرے کے لئے بھی ضرور پسند فرمایا ہوگا۔ ان ائمہ اربعہ کے بارے میں شاہ ولی اللہ محدثؒ دہلوی اپنا تبصرہ یوں پیش فرماتے ہیں:

وَكَانَ أَعْظَمَهُمْ شَأْنًا وَأَوْسَعَهُمْ رِوَايَةً وَأَعْرَفَهُمْ مَرْتَبَةً وَأَعْمَقَهُمْ فِقْهًا أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ وَإِسْحٰقُ بْنُ رَاهُوِيَةَ، وَكَانَ تَرْتِيبُ الْفِقْهِ عَلَى هٰذَا الْوَجْهِ يَتَوَقَّفُ عَلَى جَمْعِ شَيْءٍ كَثِيرٍ مِنَ الْأَحَادِيثِ وَالْآثَارِ۔ محدثین میں سب سے زیادہ محترم، وسعت روایت کے حامل، مراتب حدیث کے عارف اور گہرے فقیہ امام احمد بن حنبل اور امام اسحٰق بن راہویہ تھے۔ ان کے ہاں فقہ درجہ بالا کمالات پر ہی موقوف تھی کہ بہت سی احادیث اور آثار کو جمع کر کے فقہ کو مرتب کیا جائے۔

پھر امام احمدؒ کے بعد کے محدثین کے ذکر میں لکھا ہے۔

وَكَانَ أَوْسَعَهُمْ عِلْمًا عِنْدِيْ وَأَنْفَعَهُمْ تَصْنِيفًا وَأَشْهَرَهُمْ ذِكْرًا رِجَالٌ أَرْبَعَةٌ مُتَقَارِبُونَ فِي الْعَصْرِ، أَوَّلُهُم أَبُو عَبدِ اللّٰهِ الْبُخَارِيُّ وَكَانَ غَرَضُهُ تَجْرِيدُ الْأَحَادِيثِ الصِّحَاحِ الْمُسْتَفِيضَةِ الْمُتَّصِلَةِ مِنْ غَيْرِهَا، وَاسْتِنْبَاطِ الْفِقْهِ وَالسِّيْرَةِ وَالتَّفْسِيرِ مِنْهَا، فَصَنَّفَ جَامِعَهُ الصَّحِيحَ وَوَفّٰى بِمَا شَرَطَ۔ ان میں سب سے زیادہ علم اور مفید علمی تصانیف پیش کرنے والوں میں چار مشہور ترین اشخاص ہیں جن کا زمانہ قریب قریب کا ہے۔ ان میں اول حیثیت امام ابوعبداللہ البخاری کی ہے ان کی تصنیف کا مقصد یہی تھا کہ احادیث صحیحہ کو الگ الگ کر دیا جائے، جس سے فقہ وسیرت وتفسیر مستنبط کی جا سکے۔ یہی شرط انہوں نے اپنی کتاب میں پوری کر دکھائی۔

پھر ذکر محدثین کے بعد لکھا ہے:

وَكَانَ بِإِزَاءِ هٰؤلاءِ فِي عَصْرِ مَالِكٍ وَسُفْيَانَ وَبَعْدَهُمْ قَوْمٌ لَا يَكْرَهُونَ الْمَسَائِلَ، وَلَا يَهَابُونَ الْفُتْيَا، وَيَقُولُونَ عَلَى الْفِقْهِ بِنَاءُ الدِّينِ، فَلَابُدَّ مِنْ إِشَاعَتِهِ، وَيَهَابُونَ رِوَايَةَ حَدِيثِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ۔ امام مالک وامام سفیان ثوری کے زمانہ میں محدثین کے مقابلہ میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جو کثرت سوال کو برا نہیں جانتی تھی اور بے دھڑک فتوی دے دیتی اور کہتی تھی کہ دین کا دارومدار فقہ ہی پر تو ہے۔ ضرور اس کی اشاعت ہونی چاہئے۔ مگر روایت حدیث سے وہ بھاگتے تھے۔

پھر دوسرے مدرسہ فقہاء کا تذکرہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

لَمْ يَكُنْ عِنْدَهُمْ مِنَ الْأَحَادِيثِ وَالْآثَارِ مَا يَقْدِرُونَ بِهِ عَلَى اسْتِنْبَاطِ الْفِقْهِ عَلَى الْأُصُولِ الَّتِي اخْتَارَهَا أَهْلُ الْحَدِيثِ وَلَمْ تَنْشَرِحْ صُدُورُهُم لِتَنْظُرَ فِي أَقْوَالِ عُلَمَاءِ الْبُلْدَانِ، وَجَمْعِهَا، وَالْبَحْثِ عَنْهَا۔ وَاتَّهَمُوا أَنْفُسَهُم فِي ذٰلِكَ، وَكَانُوا اعْتَقَدُوا فِي أَئِمَّتِهِم أَنَّهُمْ فِي الدَّرَجَةِ الْعُلْيَا مِنَ التَّحْقِيقِ، وَكَانَ قُلُوبُهُمْ أَمْيَلُ شَيْءٍ إِلَى أَصْحَابِهِمْ كَمَا قَالَ عَلْقَمَةُ: هَلْ أَحَدٌ مِنْهُمْ أَثْبَتُ مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ، وَقَالَ أَبو حَنِيفَةَ: إِبْرَاهِيمُ أَفْقَهُ مِنْ سَالِمٍ وَلَو لَا فَضْلُ الصُّحْبَةِ لَقُلْتُ: عَلْقَمَةُ أَفْقَهُ مِنِ ابْنِ عُمَرَ۔ ان لوگوں کے پاس احادیث وآثار ایسے نہ تھے جس سے وہ محدثین کی طرح مسائل استنباط کر سکتے۔ ان کے سینے اس بات کے لئے بھی نہ کھل سکے کہ دوسرے علاقوں کے علماء کے اقوال پر بھی غور وفکر کیا جائے۔ یا انہیں جمع کیا جائے اور اس میں صحیح کو تلاش کیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے خود کو متہم بھی کیا تھا۔ اپنے ائمہ کرام کے بارے میں ان کا یہ اعتقاد تھا کہ وہ بحث وتحقیق کی بلندیوں کو چھوتے ہیں۔ ان کا میلان بھی حد درجہ اپنے اساتذہ کرام کی طرف تھا۔ جیسے علقمہ نے کہا: کہ عبداللہ بن مسعود سے بڑھ کر بھی کوئی ثقہ ہے؟ اور امام ابوحنیفہؒ نے کہا: ابراہیم نخعی، سالم سے بڑھ کر فقیہ ہیں۔ اگر صحابی کے فضل کی بات نہ ہوتی تو میں کہتا کہ علقمہ، عبداللہ بن عمر سے زیادہ بڑے فقیہ ہیں۔

مذاہب اربعہ میں قیاس اور رائے کا سب سے زیادہ استعمال احناف نے کیا اور سب سے کم اہل ظاہر نے۔ اور نصوص یا صحیح احادیث سے استدلال سب سے زیادہ شوافع اور حنابلہ نے کیا اور سب سے کم احناف اور موالک نے کیا ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ائمہ اربعہ کا اپنا دور زمانہ اخیر کا ہے۔ اپنے مشائخ اور اساتذہ کے علم سے یہ بھی منور ہوئے۔ اللہ کا دین ان کے قلوب ونگاہ میں اس بات سے بلند تھا کہ وہ رائے، عقل یا قیاس کو اس پر ترجیح دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص کو مقبولیت بخشی اور ان کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیل گیا۔ ان کا ذکر جمیل جاری ہو گیا۔ ان کے بعد ان

کے عقیدت مند دو اعتبار سے سامنے آئے:

ایک جماعت تو ان کے اتباع میں انہی کے مطابق رہی۔اللہ نے انہیں توفیق دی کہ انہوں نے وہی طریقہ جاری رکھا جس پر ان بزرگوں کو پایا تھا کسی کی جانب داری ان میں نام کو نہ تھی۔ وہ اپنے بزرگوں کی طرح حجت ودلیل کا ساتھ دیا کرتے تھے۔حق کا رخ جدھر پاتے اپنا منہ فوراً اسی طرف پھیر لیا کرتے تھے۔حق کا دامن تھامتے رہے اور اسی کے گرد گھومتے رہے۔صحیح دلیل ثابت ہوتے ہی اکیلے یا با جماعت اس کی طرف لپک جاتے۔حدیث رسول سنتے ہی پروانہ وار جھومتے جھومتے آتے اور اسے قولاً وعملاً اپناتے۔یہی ان کا عقیدہ تھا۔وہ جانتے تھے کہ قرآن وحدیث کے مقابلے میں کسی انسان کا قول وحجت کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔قرآن وحدیث کا مقابلہ رائے یا قیاس سے کرنا گویا ان کی توہین وحقارت کے مترادف ہے۔

دوسری جماعت نے تقلید پر ہی قناعت کر لی جس نے تعصب کو جنم دیا۔اس سے پھوٹ اور تفریق پیدا ہوگئی۔جدا جدا گروہ بندیاں ہوگئیں اور اپنے اپنے جداگانہ اصول وفروع ایجاد کر لئے گئے۔ہر کوئی ان پر بخوشی جم گیا۔ان میں سب سے بڑا دین دار اسے سمجھا جانے لگا جو سب سے زیادہ اپنے امام کی تقلید میں متعصب ثابت ہوا اور یوں ان لوگوں نے یہ نعرہ لگایا: ﴿وجدنا علیه آبائنا وإنا علی آثارهم لمقتدون﴾۔(اعلام الموقعین:۱/۲۶)

ائمہ اربعہ کے نکتہ ہائے نظر کو سمجھنے کے بعد ہمارے لئے یہ فرق کرنا غالباً مشکل نہیں ہوگا کہ کسی مسئلہ میں احناف کیا کہتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کیا فرماتے ہیں؟ شوافع کا کیا نکتہ نظر ہے اور امام شافعی کا کیا؟ امام مالکؒ یا امام احمدؒ کس نکتہ نظر کے حامی ہیں اور موالک وحنابلہ کس کے؟ اس لئے کہ ان ائمہ کرام کے علمی مقام ومرتبے کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان کی انتھک کاوشوں کو بے قیمت سمجھا جاسکتا ہے جنہوں نے اپنی ساری عمریں شریعت اور اس کے علوم کی خدمت ونگرانی میں گذار دیں یہاں تک کہ یہ علوم ہم تک پہنچے۔اور ہم ان سے استفادہ کے لائق ہوئے۔اللہ تعالیٰ ان علماء کو ہماری طرف سے اور شریعت کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین۔مگر بعد کی کاوشوں کو یا تخریجات کو ان کی فقہ کہنا نامناسب لگتا ہے۔

☆☆☆☆☆

چوتھا باب:

فقہی تقسیم اور تناؤ

ائمہ مجتہدین کرام جب تک اجتہاد کی حدود کی پابندی کرتے رہے اس وقت تک اجتہاد باعث رحمت رہا۔اس مشروط اجتہاد میں ایک مبارک روش واضح طور پر نظر آتی ہے کہ اختلاف رائے ، کے باوجود رواداری، حوصلہ اور درگزر کا پہلو غالب رہا۔تعصب کی بجائے فکر ونظر کو تازگی ملتی رہی اور اسلام اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر رہا۔ مگر جونہی ان شرائط کو نظر انداز کیا گیا۔مذہبیت بتدریج غالب آ گئی اور مسلمان اپنے اسلاف کے منہج سے بتدریج ہٹتے گئے ۔یہ سلسلہ کب شروع ہوا؟ اس بارے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ حجۃ اللہ البالغۃ: ج ا ص ۴۳۸ فرماتے ہیں:

> اعْلَمْ أَنَّ النَّاسَ قَبْلَ الْمِائَةِ الرَّابِعَةِ كَانُوا غَيرَ مُجْمَعِينَ عَلَى التَّقْلِيدِ الْخَالِصِ لِمَذْهَبٍ وَاحِدٍ بِعَيْنِهِ۔ آپ کے علم میں یہ بات ہونی چاہئے کہ مسلمان چوتھی صدی ہجری سے قبل کسی ایک مذہب کی تقلید خالص پر متفق نہ تھے۔

آپ فرماتے ہیں کہ جونہی حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی کی اصطلاحات متعارف ہوئی ہیں ہمارا یہ خیال ہے کہ اسلامی فقہ کا عظیم دور گزر گیا اور اس کی جگہ مذہبی دور آ گیا۔ہوسکتا ہے کئی سیاسی اور عقلی عوامل اس مذہبیت کے پیچھے ہوں مگر بعد میں شخصیت پرستی (تقلید) کی روح عوام میں بتدریج سرایت کر گئی۔جس میں علماء بھی شامل ہو گئے اور یوں فہم دین میں بتدریج زوال آنا شروع ہوا۔

فقہی مذاہب کا آغاز:

دوسری صدی ہجری کے آخیر میں فقہ اسلامی کا رنگ بدل گیا۔علمی سرگرمیوں کے نتیجے میں ماحول وشخصیات کی فکر کے تعلق سے دو اہم مدارس وجود میں آ گئے: جو مدرسہ حدیث (Hadith School) اور مدرسہ رائے (Anology School) کہلائے۔ان مدارس نے اپنی فکر کے انتشار میں جو تگ ودو دکھائی اور اصول بنائے اور اپنی فقہ کی عمارت انہی اصولوں پر قائم کی۔اس کا تفصیلی تذکرہ امام شہرستانیؒ (۵۴۸ھ) جو امت اسلامیہ میں مختلف فرقوں اور مذاہب کے بننے اور بگڑنے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔اسی موضوع میں لکھی گئی اپنی مستند کتاب الملل والنحل میں یوں فرماتے ہیں:

ثُمَّ الْمُجْتَهِدُونَ مِنْ أَئِمَّةِ الأُمَّةِ مَحْصُورُونَ فِي صِنْفَيْنِ، لاَ يُعَدَّانِ إِلَى ثَالِثٍ، أَصْحَابُ الْحَدِيثِ وَأَصْحَابُ الرَّأْيِ۔

أَصْحَابُ الْحَدِيثِ هُمْ أَهْلُ الْحِجَازِ وَأَصْحَابُ مَالِكِ بْنِ أَنَسٍ وَأَصْحَابُ مُحَمَّدِ بْنِ إِدْرِيسَ الشَافِعِيِّ وَأَصْحَابُ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ وَأَصْحابُ أَحمدَ بْنَ حَنبلٍ وَأَصْحابُ دَاوُدَ بْنِ عَلِيِّ بْنِ محمدٍ الإصفهانيِّ، وَإِنَّمَا سُمُّوا أَصْحَابُ الحديثِ لِأَنَّ عِنَايَتَهُمْ بِتَحْصِيلِ الأَحَادِيثِ وَنَقْلِ الأَخْبَارِ وَبِنَاءِ الأحكامِ عَلَى الْمَنْصُوصِ وَلاَ يَرْجِعونَ إِلَى الْقِيَاسِ الْجَلِيِّ وَالْخَفِيِّ مَا وَجَدُوا خَبَرًا۔

وَأَصْحَابُ الرَّأْيِ وَهُم أَهْلُ الْعِرَاقِ: هُم أَصحابُ أَبِي حَنِيفَةَ النُّعمانِ بْنِ ثابتٍ وَمِنْ أَصحابِهِ محمدُ بْنُ الْحَسَنِ وَأَبُويوسُفَ يَعقوبُ بْنُ محمدٍ القاضيُّ وَزُفَرُ بْنُ هُذَيلٍ وَالْحَسَنُ بْنُ زِيادٍ اللُّؤْلُؤِيُّ وَابْنُ سَمَاعَةَ وَعَافِيَةُ القاضيُّ وأبومُطِيع الْبَلْخِيُّ وَالْبِشْرُ الْمِرِّيْسِيُّ، وَإِنَّمَا سُمُّوا أَصْحَابُ الرَّأْيِ لِأَنَّ عِنَايَتَهُمْ بِتَحْصِيلِ وَجْهٍ مِنَ الْقِيَاسِ وَالْمَعنَى الْمُسْتَنْبَطُ مِنَ الأَحكامِ وَبِنَاءِ الْحَوَادِثِ عَلَيهَا، وَرُبَّمَا يُقَدِّمُونَ الْقِيَاسَ الْجَلِيَّ عَلَى أَخْبارِ الآحَادِ۔ ائمہ مجتہدین کی دو ہی قسمیں ہیں تیسری کوئی قسم نہیں: اصحاب حدیث اور اصحاب رائے۔

ا۔ اصحاب حدیث کا مسکن حجاز ہے جن میں امام مالک اور ان کے تلامذہ، امام شافعی اور ان کے شاگرد، سفیان الثوری اور ان کے رفقاء، امام احمد کے ساتھی اور امام داؤد اور ان کے خدام، انہیں اصحاب حدیث اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کی زیادہ تر توجہ حدیث اور اخبار کی طرف ہے، یہ لوگ احکام کی بنیاد نصوص پر رکھتے ہیں۔ جب حدیث موجود ہو تو یہ لوگ قیاس جلی ہو یا خفی اس کی پروا نہیں کرتے۔

۲۔ اہل عراق کو اصحاب رائے کہا جاتا ہے جو امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ ہیں، انہی میں امام محمد، امام ابو یوسف قاضی، زفر بن ہذیل، حسن بن زیاد، ابن سماعہ، قاضی عافیہ، ابومطیع البلخی اور بشر المریسی وغیرہ شمار ہوتے ہیں۔ انہیں اصحاب رائے اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کی زیادہ تر توجہ قیاس اور معانی کے استنباط کی طرف ہے یہ لوگ احکام کی بنیاد قیاس پر رکھتے ہیں اور بسا اوقات قیاس جلی کے سامنے خبر واحد کی بھی پروا نہیں کرتے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی معروف کتاب حجۃ اللہ البالغۃ کے باب الفرق بین أهل الحديث وأهل الرأی میں شہرستانی کی اسی بات کی مزید شرح بھی فرمائی ہے۔ جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

تقسیم کی وجہ: ائمہ کرام کے بعد یہ مسلمان علماء کیسے منقسم ہوئے؟ وجوہات کیا تھیں؟ تاریخ کے امام مشہور مورخ وناقد علامہ ابن خلدون (۸۰۸ھ) کا درج ذیل اقتباس بھی اس وجہ کو سمجھانے کے لئے قابل غور ہے۔ فرماتے ہیں:

وَانْقَسَمَ الْفِقْهُ فِيهِمْ إِلَى طَرِيْقَيْنِ: طَرِيقُ أَهْلِ الرَّأْيِ وَالْقِيَاسِ وَهُم أَهْلُ الْعِرَاقِ، وَطَرِيقُ أَهْلِ

الْحَدِيثِ وَهُم أهلُ الحِجازِ، وَكَانَ الحديثُ قَليلاً فِي أهلِ العِراقِ لِمَا قَدَّمْنَاهُ، فَاسْتَكْثَرُوا مِنَ الْقِيَاسِ وَمَهَرُوا فِيهِ، فَلِذَلِكَ قِيلَ أهلَ الرَّأيِ، وَمُقَدَّمُ جَمَاعَتِهِمُ الَّذِي اسْتَقَرَّ الْمَذْهَبُ فِيهِ وفِي أصحابِهِ: أبو حنيفة ؒ وَإِمَامُ أَهْلِ الْحِجازِ مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ وَالشافِعِيُّ مِنْ بَعْدُ۔

پہلوں میں فقہ کے دو طریقے رائج ہو گئے۔ایک طریقہ اہل عراق (کوفہ وغیرہ) والوں کا ہے اور دوسرا محدثین کا جو حجاز (مکہ ومدینہ) والوں کا ہے۔اہل عراق میں جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔حدیث کا ذوق کم تھا۔لہٰذا انہوں نے بکثرت قیاس سے کام لیا اور اسی میں مہارت حاصل کی۔جس کی وجہ سے انہیں اہل الرائے کہا گیا۔اس جماعت کے سرخیل امام ابوحنیفہؒ قرار پائے۔ان میں اور ان کے شاگردوں میں مذہب نے قرار پکڑا۔اہل حجاز (مکہ و مدینہ) والوں کے پیشوا امام مالکؒ اور پھر امام شافعیؒ ٹھہرے۔ (مقدمہ ابن خلدون:۳۸۹)

خیر القرون میں ہر فقیہ کا یہ حق تھا کہ وہ صورت مسؤلہ کا جواب دے اس لئے کہ لوگ اس سے فقہی سوالات کا حل مانگتے تھے۔اور جب اس نے اجتہاد کیا تو اپنے علم کے مطابق یہی سمجھا کہ میری نظر میں یہی حق ہے۔بعد میں فقہاء کرام کی یہ کوششیں انفرادی حیثیت اختیار کر گئیں جو ہر شہر میں اپنے اپنے مسلک کی تھیں۔وہ اپنے ماحول اور حالات کے لحاظ سے معذور بھی تھے۔ان تک صحیح احادیث رسول نہیں پہنچ سکیں بلکہ وہ احادیث ضعیفہ، آثار اور فتاوی پر اکتفاء کرتے رہے۔انہی حالات میں تدوین حدیث ہوئی اور ضعیف وموضوع یا مرسل ومنقطع روایات بے وزن ہو گئیں مگر بعض علماء، نے پھر بھی انہیں اپنی کتب کی زینت بنایا اور واعظ حضرات بھی اپنے خطبوں میں ان کا تذکرہ کرتے رہے۔مکہ کے فقہاء ہوں یا مدینہ کے، عراق کے ہوں یا یمن کے، مصر کے ہوں یا شام کے سب کی فقہی جزئیات اور قابل اعتماد ذرائع علیحدہ علیحدہ تھے۔کوئی جامع ضابطہ نہ تھا جو حدیث کی صحت وضعف کا معیار قائم کر سکتا اور نہ ہی کوئی اصول وقواعد تھے۔بلکہ ہر شہر کا فقیہ اور فقہ علیحدہ علیحدہ تھی۔اجتہاد، افتاء اور استنباط مسائل کے لئے احادیث صحیحہ کے مقابلے میں مرسل، منقطع اور موقوف روایات پر اعتماد وانحصار تھا۔اسی بناء پر امام زرکشیؒ نے **المحصول** میں مسلکی فقہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

هُوَ مَعْرِفَةُ أحْكَامِ الْحَوَادِثِ نَصًّا وَاسْتِنباطًا عَلَى مَذْهَبٍ مِنَ الْمَذَاهِبِ۔ جدید مسائل کے احکام کو نصوص واستنباط کے ذریعے سے کسی بھی مذہب کی روشنی میں جاننا۔ ۱۱؍۹۴

ان تمام ائمہ کی طرف نسبت سے فقہ مدون ومرتب ہوئی جو فقہ حنفی، فقہ مالکی، فقہ شافعی فقہ جعفری اور فقہ حنبلی کے نام سے موسوم ہو کر وجود میں آئی۔اس طرح ہر فقہ ایک ہی مسلک کی محدود فقہ بن گئی۔

مذہبی شدت : شاہ صاحب نے تقلید کے زمانہ کی جو تحدید کی ہے ہمارا خیال یہ ہے کہ غالباً اس کا آغاز ائمہ حضرات کے دور میں ہی ہو چکا تھا۔ اس مذہبی فقہ کا قاری با آسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ مسئلہ اور اس کا ردعمل، اندلس میں مالکی فقہاء اور مشرق میں حنفی فقہاء کی اپنے اپنے قاضیوں کی مناصب پر تعیین اور ان کی پیشگی شرائط، امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کے فقہی مناظرے، امام شافعیؒ کے بارے میں مالکی فقہاء کی بددعائیں، کتب فقہیہ میں مناظرانہ رنگ اور علمی احترام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک دوسرے پر شدید ردود، اپنے فقہاء کے بارے میں غلو اور دوسروں کی اہانت، شاعرانہ چشمک نے یہ مذہبی عصبیت شروع ہی سے پیدا کر دی تھی۔

امام بخاری رحمہ اللہ کو ان کے آخری ایام میں بخارا سے بدر کروانے میں شاید یہی عوامل کارفرما تھے کہ امام بخاریؒ کے فتاوی نصوص پر تھے جن کے مقابلہ میں حنفی علماء کے فتاوی اپنے مسلک کے مطابق تھے کیونکہ سلطنت عباسی کے سایہ شفقت میں بخارا و سمرقند میں فقہ حنفی کا تسلط تھا۔ فقہاء وعلماء کے درمیان ایسی صورت حال پیدا ہوتی رہی جو ایک دوسرے کے لئے پریشان کن تھی۔ مثلاً: بعض فقہاء کا یہ فتوی تھا کہ مدہوشی کی حالت میں طلاق مؤثر ہوتی ہے ان کے مقابل یہ فتوی دیا گیا کہ حالت نشہ میں دی گئی طلاق غیر مؤثر ہوتی ہے۔ فقہاء نے وجہ یہ بتائی کہ لفظ طلاق کی ساتھ نیت ضروری نہیں۔ دوسروں نے کہا: نہیں بلکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: **إنما الأعمال بالنيات**. عمل کے مؤثر ہونے کا دارومدار نیت پر ہے۔ مے نوش جب حالت نشہ میں طلاق دیتا ہے تو اس کی نیت طلاق دینے کی نہیں ہوتی لہٰذا اس کے الفاظ، لغو الفاظ ہیں اور طلاق مؤثر نہیں۔

اسی طرح ایک فتویٰ یہ بھی سامنے آیا کہ جبر، تشدد اور اکراہ سے حاصل کی گئی طلاق مؤثر ہے۔ یہ فتوی بھی یہ کہتے ہوئے رد کر دیا گیا کہ یہ طلاق غیر مؤثر ہے اس لئے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جبری طلاق نہیں ہوتی۔

فقہاء نے کہا: نکاح کے لئے لڑکی کی رضا ضروری نہیں ہے۔ دوسروں نے فتوی دیا: نکاح کے لئے لڑکی کی رضا ضروری ہے آپ ﷺ نے اس لڑکی کا نکاح کالعدم قرار دیا تھا جس نے اظہار کراہت کیا تھا۔ اور کراہت کا ضد لفظ رضا ہے، اجازت نہیں ہے۔

یہ فتویٰ بھی سامنے آیا: نکاح سے قبل طلاق دینا جائز ہے۔ دوسرے فقہاء نے فرمایا ایسا کرنا درست نہیں اس لئے یہ قرآن کے حکم کے خلاف ہے نکاح سے قبل طلاق کا جواز ہی نہیں بلکہ ایسی طلاق لغو ہے۔

فقہاء نے کہا: نکاح وطلاق میں قاضی کا فیصلہ ظاہر وباطن میں نافذ ہوتا ہے۔ دیگر فقہاء نے فتوی دیا یہ بھی درست

نہیں۔ عمداً جھوٹ بول کر یا عمداً جھوٹے گواہ بنا کر اگر عدالت کا فیصلہ لے لیا جائے تو عورت بیوی نہیں بنتی۔ جب کہ پہلوں نے کہا وہ بیوی بن جاتی ہے۔

یہ بھی فتویٰ سامنے آیا: ایک قطرہ دودھ پینے سے عورت رضاعی ماں بن جاتی ہے۔ جواب میں کہا گیا یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ایک دو گھونٹ پینے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

مذہبی شدت کے یہ انمٹ آثار ہماری ان کتب کی زینت ہیں جنہیں ہمارے ہاں قابل قدر اثاثہ و سرمایہ سمجھ کر پڑھایا جاتا ہے۔ امام خطیب بغدادیؒ حنبلی مسلک رکھتے تھے کسی مسئلہ پر تحقیقی وعلمی انداز سے سوچا تو امام شافعیؒ کی رائے وقیع ومدلل نظر آئی چنانچہ انہوں نے اس کے مطابق فتوی دے دیا۔ صبح جب اپنے کمرے سے باہر آنا چاہا تو حنبلیوں نے راتوں رات ان کے دروازے پر دیوار چن دی۔ مالکیوں نے امام بقیؒ بن مخلد محدث اندلس کے ساتھ جو کچھ کیا کہ اندلس میں اس عالم حدیث کا وجود تک برداشت نہ کر سکے۔ ماضی میں معمولی فقہی مسائل پر شوافع اور احناف کے درمیان باقاعدہ میدان جنگ سجے اور بزعم خود شہادتوں کے ڈھیر لگے۔ تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کے تاخت وتاراج کے پس منظر میں یہی فرقہ واریت ہی تو ہے۔ ہاتھ چھوڑ کر نماز مالکی پڑھتے ہیں۔ پوچھا جائے کہ اس کی دلیل تمہارے پاس کیا ہے جب کہ امام محترم اپنی کتاب موطأ میں ہاتھ باندھنے کی حدیث بطور دلیل کے پیش فرماتے ہیں اور وہ خود بھی اس پر عامل رہے؟ ان کا جواب یہی ہے کہ چونکہ ہمارے امام کا یہ آخری عمل ہے۔ اس لئے ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ بعض کتب فقہ میں بڑے بڑے ائمہ مجتہدین کے خلاف ایسا تلخ وترش لب ولہجہ استعمال ہوا ہے جو کسی بھی طرح ایک طالب علم کو علماء وفقہاء اور محدثین کے ادب واحترام کا خوگر نہیں بناتا بلکہ دیگر مسالک سے تعصب اور نفرت کا داعیہ پیدا کرتا ہے۔ کسی کو گمراہ قرار دینے یا کفر تک پہنچانے کے رجحانات بھی بہت تیز وشدید پائے جاتے ہیں۔ عموماً یہ رجحان فروعات کے بارے میں ہے جب کہ فروعی مسائل میں اختلاف کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

اسی طرح مسانید ابی حنیفہؒ کے نام سے ایک کتاب ساتویں ہجری میں ایک حنفی عالم ابوالمؤید الخوارزمی نے مرتب کی۔ اولاً تو اس کتاب کی ثقاہت بیشتر علماء ومحدثین کے نزدیک محل نظر ہے جس کی تفاصیل ہمیں حجۃ اللہ البالغۃ میں مل جائیں گی۔ نیز اس کی بیشتر احادیث سند اور متن دونوں اعتبار سے محدثین کے ہاں ضعف اور وضع سے بھرپور ہیں۔ پھر بھی مؤلف مرحوم کا تصنیفی داعیہ ملاحظہ فرمایئے لکھتے ہیں:

زَعَم أَنَّهٗ لَيْسَ لِأَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ مُسْنَدٌ، كَانَ لَا يَرْوِيْ إِلَّا عِدَّةَ أَحَادِيثَ فَلَحِقَتْنِي حَمِيَّةٌ دِينِيَّةٌ رَبَّانِيَّةٌ، وَعَصَبِيَّةٌ حَنَفِيَّةٌ نُعْمَانِيَّةٌ فَأَرَدْتُ أَنْ أَجْمَعَ بَيْنَ خَمْسَةَ عَشَرَ مِنْ مَسَانِيدِهِ...... (مقدمہ جامع المسانید از خوارزمی) مخالف یہ دعوی کرتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی کوئی مسند نہیں ہے۔ نیز یہ کہ وہ چند احادیث ہی کو روایت کرتے تھے۔ تو مجھے دین کی ربانی غیرت نے اور حنفی نعمانی عصبیت نے للکارا اور جوش دلایا۔ اس بنیاد پر میں نے چاہا کہ ان پندرہ مسانید کو جمع کر ڈالوں۔۔۔

جس فقیہ کے یہ الفاظ ہوں اس نے کیا جمع کیا ہوگا؟۔

ہونا یہ چاہئے تھا کہ تمام فقہاء کی کاوشوں اور اجتہادات سے بھرپور فائدہ اٹھا کر فقہ کو محدود کرنے کی بجائے وسیع کیا جاتا جو کم از کم اسلامی فقہ تو کہلاتی۔ اس لئے کہ ان فقہاء کرام نے یہ سب کاوشیں دین اسلام کے لئے کیں نہ کہ اپنی ذات یا اپنے مسلک کو رواج دینے کے لئے۔ جب چاروں فقہاء برحق ہیں تو ایک مسلک سے جڑ کر ان کی فقہ کو اسلامی فقہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟۔ مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ میں سب سے بڑے امام سعید بن المسیب رحمہ اللہ (م:۹۳ھ) ہیں ان کا فرمانا ہے:

لَيْسَ مِنْ عالِمٍ ولَا شَرِيفٍ ولَا ذِي فَضْلٍ إِلَّا وفيهِ عَيْبٌ، ولٰكِن مَن كانَ فَضْلُهُ أَكْثَرَ مِنْ نَقْصِهِ، ذَهَبَ نَقْصُهُ لِفَضْلِهِ، كَمَا أَنَّهُ مَنْ غَلَبَ عَلَيْهِ نُقْصَانُهُ ذَهَبَ فَضْلُهُ۔ وقا لَ غيرُهُ: لا يَسْلَمُ العَالِمُ مِنَ الخطإِ ، فَمَنْ أَخْطَأَ قليلاً وأَصابَ كثيراً فهُوَ عالِمٌ، ومَنْ أَصابَ قليلاً وأخطأَ كثيراً فهو عالِمٌ، ومَنْ أصابَ قليلاً وأخطَأَ كثيراً فهُوَ جاهِلٌ۔ (جامع بیان العلم از ابن عبد البر ۲/۴۸) علماء، شرفاء اور صاحب فضل لوگوں میں کوئی ایسا نہیں جس میں کوئی عیب نہ ہو۔ ہاں جس کی خوبی اس کی خامی سے زیادہ ہو وہ یقیناً خوبی میں برتر ہو گیا اور جس کی خامی اس کی خوبی سے کم ہو اس کی عزت گئی۔ ایک اور فقیہ فرماتے ہیں: کوئی عالم غلطی سے نہیں بچا۔ جس کی غلطی کم اور صواب زیادہ ہو وہ یقیناً عالم ہے اور جس کا صواب کم اور غلطی زیادہ ہو وہ یقیناً جاہل ہے۔

سلف وخلف میں اکثر مجتہدین ایسے ہو گذرے ہیں جنہوں نے کسی مسئلہ پر کچھ کہا یا کیا تو وہ بدعت تھی مگر انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ بدعت ہے۔ یا تو ضعیف احادیث کی وجہ سے انہوں نے ایسا کہہ دیا یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ احادیث صحیح ہیں یا آیات کا مفہوم انہوں نے ایسا ہی لے لیا جو ان آیات کا تھا ہی نہیں۔ یا انہیں کوئی رائے سوجھی مگر اس مسئلہ میں وارد نصوص ان تک نہ پہنچ سکیں۔ اس لئے جو بندہ اپنے رب سے جس قدر بھی ڈرتا ہے وہ اللہ تعالی

کے اس ارشاد میں شامل ہوجاتا ہے: ﴿ربنا لا تؤاخذنا إن نسينا أو أخطأنا﴾ اور صحیح روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: قد فعلْتُ۔ میں نے ایسا کردیا۔ (الفتاوی الکبری ۱۹۱/۱۹)

سوال یہ ہے کہ ان مذہبی اختلافات سے بچنے اور تمام فقہاء کرام کو ان کا جائز مقام واحترام دینے کی آخر سبیل کیا ہے؟ اس سلسلے میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کا ایک صائب مشورہ ہے کہ:

ہر مذہب کے تین حصے کرلیجئے۔

وہ حصہ جس میں حق واضح ہواور کتاب وسنت کے موافق ہو شرح صدر سے اس کے مطابق فتوے دیجئے۔

دوسرا وہ حصہ جو مرجوح ہے اور دلائل کے اعتبار سے بہت کمزور۔ اس کے مطابق نہ فتوی دیا جائے اور نہ ہی مسائل بتائے جائیں بلکہ اس حصے کو تو ذہن سے ہی نکال دینا چاہئے۔

تیسرا حصہ وہ جس میں دلائل کی کشش دونوں طرف موجود ہے اس میں جیسے طبیعت چاہے فتوی دیا جاسکتا ہے یا اسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

یہ بھی خیال میں رہے کہ مذہبی فقہ کے مراتب مختلف ہیں۔ نیز بیشتر مسائل میں استاد شاگرد کا اصولی ونظری اختلاف بھی موجود ہے جو اس کی استدلالی حیثیت کو مشکوک بنادیتا ہے اس لئے یہ مذہبی فقہ کسی بھی مقام پر رد وقبول کے لئے معیار نہیں قرار پاسکتی۔ ہاں اگر مقدار و پیمانہ کا تعین ہوجائے تو درایت کے اعتبار سے مذہبی فقہ قابل قبول ہوسکتی ہے۔

مسلکی فقہ کی اشاعت کے اسباب

۱۔ **قاضیوں کا کردار:** ان مذاہب کی فقہی اشاعت میں اپنے اپنے علاقے میں متعین قاضیوں کا بڑا کردار تھا۔ جو چیف جسٹس کی طرف سے متعین ہوتے تھے۔ اس بات کو ذرا تفصیل سے شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی بستان المحدثین صفحہ ۱۱ میں یوں فرماتے ہیں:

این دو مذهب در عالم از راه ریاست و سلطنت رواج و اشتهار گرفته اند؟ مذهب ابو حنیفة ومذهب مالك ؒزیراكه قاضی ابو یوسف قضاء كل ممالك بدست آورده، از طرف او قضاة میر فتند۔ پس بر هر قاضی شرط میكرد كه عمل وحكم بمذهب ابوحنیفةؒ نماید.... امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے مذاہب دنیا میں اقتدار اور منصب کی بدولت رواج پا گئے اور مشہور ہوئے۔ اسلئے کہ قاضی ابو یوسفؒ نے تمام اسلامی ریاستوں کی قضا اپنے ہاتھ میں لی ہوئی تھی۔ انہی کی طرف سے قاضی

مامور ہوتے۔ جنہوں نے ہر قاضی کے لئے یہ شرط رکھی کہ عمل اور تمام فیصلے حنفی مذہب کے مطابق کرنا ہوں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے گو اس کی وجوہات کچھ اور بتائی ہیں ان کی زبانی سنئے:

وَكَانَ وَأَشْهَرُأَصْحَابِهِ ذِكْرًا أَبُو يُوسُفَ، فَوَلِّي قَضَاءَ أَيَّامَ هَارُونَ الرَّشِيدِ، فَكَانَ سَبَبًا لِظُهُورِ مَذْهَبِهِ، وَالْقَضَاءُ بِهِ فِي أَقْطَارِ الْعِرَاقِ وَخُرَاسَانَ وَمَا وَرَاءَ النَّهْرِ الخ"۔ حجۃ اللہ البالغہ۔۱۵۱) امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں میں بڑے مشہور و معروف شاگرد امام ابو یوسفؒ تھے۔ جنہیں ہارون رشید کے عہد میں چیف جسٹس کا منصب ملا۔ یہی منصب ہی ان کے مذہب کو عام کرنے اور اسی مذہب کے مطابق عراق وخراسان اور ماوراء النہر کے علاقوں میں قضاء و فیصلہ جات نافذ ہوئے۔

۲۔فقہاء کے میلانات: ماضی میں کچھ فقہاء ایسے پیدا ہوئے جن کے پاس اتنی احادیث نہ تھیں جن سے وہ مسائل کا استنباط کرتے۔ بلکہ وہ اپنے اساتذہ کے بارے میں بہت خوش گمان اور معتقد تھے اور انہی کے بتائے ہوئے قواعد واصول کے مطابق بے دھڑک فتوے دے دیا کرتے تھے۔ اور دوسرے علماء کے اقوال دیکھنا، سننا بھی ان کو پسند نہ تھا۔ (حجۃ اللہ البالغہ) اس رجحان کا تذکرہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی درجہ بالا کتاب میں کیا ہے۔ اس سے فقہی مسائل کی حقیقت کا اور ان کے معیار کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اندلسی مورخ اور عالم علامہ ابن خلدونؒ کے مقدمہ تاریخ سے ہم پہلے روشنی ڈال چکے ہیں۔ ان شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ:

...... کچھ فقہاء قرآن وحدیث کو ہی اپنے استنباط (deduction) کا محور سمجھتے۔ ان کا زیادہ میلان حدیث کی طرف رہا۔

...... بعض فقہاء، حدیث وسنت کا مزاج نہ رکھنے کے باعث عقل ورائے کے ذریعے استنباط کیا کرتے۔

...... کچھ فقہاء نے ان مسائل کے بارے میں اپنی بروقت فقہیات پیش کیں۔ جو وقوع پذیر ہوچکی تھیں۔ یا ہو رہی تھیں۔

...... بعض فقہاء نے مفروضہ مسائل یا مستقبل میں امکانی حد تک پیش آنے والے مسائل کے بارے میں اپنی فقہیات پہلے سے ہی پیش کردیں۔ اور ہر دور میں تخریج در تخریج کرتے گئے۔

...... بعض فقہاء نے اس خوش گمانی میں کہ ہمارے اسلاف کے وضع کردہ فقہی قواعد واصول ہی بہتر ہیں۔ انہیں یہ درجہ دے دیا:

أَنَّ كُلَّ آيَةٍ تُخَالِفُ قَوْلَ أَصْحَابِنَا فَإِنَّهَا تُحْمَلُ عَلَى النَّسْخِ أَوْ عَلَى التَّرْجِيحِ، وَالْأَوْلَى أَنْ تُحْمَلَ عَلَى التَّأْوِيْلِ مِنْ جِهَةِ التَّوْفِيقِ- مِنْ مَسَائِلِهِ أَنَّ مَنْ تَحَرَّى عِنْدَ الاِشْتِبَاهِ وَاسْتَدْبَرَ الْكَعْبَةَ جَازَ عِنْدَنَا لِأَنَّ تَأْوِيلَ قَوْلِهِ تَعَالَى ﴿ فولوا وجوهكم شطره﴾ إِذَا عَلِمْتُمْ بِهِ، وَإِلَى حَيْثُ وَقَعَ تَحَرِّيْكُمْ عِنْدَ الاِشْتِبَاهِ۔ اصول کرخی:۱۲)

ہر وہ آیت قرآنیہ جو ہمارے فقہاء کے اقوال کے خلاف ہے اسے یا تو نسخ پر محمول کیا جائے گا یا ترجیح پر۔ زیادہ بہتر یہی ہے

کہ اسے تاویل پر محمول کیا جائے تاکہ موافقت پیدا ہو جائے۔ مثلاً کوئی شخص شک کی وجہ سے کعبہ کا صحیح رخ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پشت کر کے بیٹھ جاتا ہے تو یہ بیٹھنا جائز ہوگا۔ کیونکہ اللہ کے اس فرمان (اپنے چہرے اسی کی طرف پھیر لو) کی تاویل یہی ہوگی کہ جب تم شبہ کے وقت کوشش کر کے اس کی سمت جان لو۔ تو اسی طرف رخ پھیر لو۔

...... نتیجتاً ایسا غلو سامنے آیا کہ فقہ حنفی کی کتب کو خدائی کتاب کا درجہ دیا جانے لگا: الْهِدَايَةُ كَالقرآن۔ کتاب الہدایہ قرآن کی مانند ہے۔ جن کتب کا سنگھار ایسے جملے ہوں وہاں پھر احادیث رسول کے بارے میں کیا سوچ بنے گی؟۔

...... یہ رنگ بھی شاعرانہ تخیل پرواز میں اپنایا گیا:

فَلَعْنَةُ رَبِّنَا أَعْدَادُ رَمْلٍ عَلَى مَنْ رَدَّ قَوْلَ أَبِي حَنِيفَةَ

اس شخص پر ریت کے ذروں کے برابر ہمارے رب کی لعنت ہو جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول کو رد کرتا ہے۔

قیاسی مسائل اور ان کی بے محل تخریج بھی ماضی میں عام رہی۔ جس کی وجہ سے ان فقہاء کے پاس ایسا ذخیرہ جمع ہو گیا جس کا پڑھنا اور جاننا یا اس سے مستفید ہونا وقت کا ضیاع ہی محسوس ہوتا ہے۔ بلکہ ایک سعی لاحاصل بھی۔

۳۔ غلو: ان ائمہ کرام کو رب ذوالجلال نے علمی اور فقہی مقام عطا فرمایا جس اخلاص اور محبت الٰہی میں ڈوب کر دین کی اشاعت وترویج اور فقہ واجتہاد کا کام ان بزرگوں نے کیا یہی ان شاء اللہ تعالیٰ روز قیامت، میدان محشر میں ان کی سرخروئی اور جنت میں رفع درجات کا باعث ہوگا۔ ان سے محبت، ان کا احترام ایمان کی علامت ہے اور ان سے بغض، نفرت اور ان کی ذرہ برابر توہین کا ارتکاب اپنی عاقبت کو تباہ کرنے کا نام ہے۔ اسی طرح ان ائمہ کرام کو ان کے مقام ومرتبہ سے اٹھا کر نبوت کے مقام پر لے جانا، اور انہیں معصوم عن الخطا سمجھنا اور ان کی ہر بات کو وحی کا درجہ دینا یا ان ائمہ میں سے کسی ایک کے علم کو حرف آخر سمجھنا اور دیگر ائمہ کرام کے علم سے خود بھی اور دوسروں کو بھی محروم کرنا، یہ سب کچھ بھی شرعی، اخلاقی اور دینی اعتبار سے ہرگز ہرگز درست نہیں۔ قرآن مجید کا دیا ہوا یہ سبق ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہے کہ: ﴿یا أهل الكتاب لا تغلوا فی دینكم﴾ اے کتاب والو! اپنے دین میں غلو مت کرو۔ اسی طرح یہ آیت بھی: ﴿ وفوق كل ذی علم علیم﴾۔ ہر عالم کے اوپر ایک اور عالم ہوتا ہے۔ جس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ علم کی حد بندی نہیں کی جا سکتی اور نہ علماء کرام کی۔ ہمارے اسلاف نے اور معاصر معتدل علماء نے اس کو محسوس کرتے ہوئے اس بے اعتدالی اور غلو کا نہ صرف نوٹس لیا ہے بلکہ اعتراف کرتے ہوئے اس کی نشاندہی بھی فرمائی ہے۔ دیکھئے آگے بحث تقلید۔

طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَرُبَّ اِنْسانٍ مِنْكُمْ يَبْلُغُهُ حَدِيثٌ مِنْ اَحَادِيثِ نَبِيِّكُمْ فَلاَ يَعْمَلُ بِهِ، وَيَقُولُ: إِنَّمَا عَمَلِي عَلَى مَذْهَبِ فُلاَنٍ لاَ عَلَى الْحَدِيثِ، ثُمَّ احْتَالَ بِأَنَّ فَهْمَ الْحَدِيثِ وَالْقَضَاءُ بِهِ مِنْ شَأنِ الْكُمَّلِ الْمَهَرَةِ، وَأَنَّ الأَئِمَّةَ لَمْ يَكُونُوا مِمَّنْ يَخْفَى عَلَيْهِمْ هَذَا الْحَدِيثُ فَمَا تَرَكُوهُ إِلاَّ لِوَجْهٍ ظَهَرَ لَهُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ نَسْخٍ وَمَرْجُوحِيَّةٍ۔ (تفہیمات ج۱،ص۲۱۵) تم میں بہت سے طالب علموں کو رسول کریم ﷺ کی حدیث مل جاتی ہے لیکن وہ اس پر عمل نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہیں: اس حدیث کے ہوتے ہوئے پھر بھی میرا عمل فلاں امام کے مذہب پر ہے۔ پھر بہانہ یہ بناتے ہیں کہ حدیث سمجھنا اور اس کے مطابق فیصلہ کرنا کامل اور ماہر لوگوں کا کام ہے نہ کہ ہمارا۔ اور یہ بھی کہ ان ائمہ کرام سے یہ حدیث پوشیدہ نہ تھی کوئی وجہ ضرور ہوگی جس کی بناء پر ان ائمہ نے اس پر عمل نہیں کیا۔

آگے نتیجہ میں فرماتے ہیں: بھائی یہ قطعاً دینی رویہ نہیں اور نہ ہی علم کی شان ہے بلکہ تم صرف جناب رسالت مآب ﷺ کی اطاعت کرو خواہ وہ مذہب کے مخالف ہو یا موافق۔ کیونکہ اللہ کی مرضی یہی ہے کہ تم کتاب وسنت کی اطاعت کرو۔

مستقبل میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بارے میں جو غلو آمیز باتیں کی گئیں وہ بھی مذہبی داستان کے علاوہ کچھ نہیں۔ مثلاً:

..... یہ کہ جناب خضرؑ نے پانچ سال تک جناب امام ابوحنیفہؒ کے در اقدس پہ روزانہ صبح حاضری دے کر علم حاصل کیا۔

..... سیدنا امام ابوحنیفہؒ کی وفات پر سیدنا خضر نے نہایت تضرع وزاری سے بارگاہ خداوندی میں مزید علم کے حصول کی درخواست کی۔ صرف اتنی اجازت ملی کہ ان کی قبر پہ جا کر سیکھ آیا کرو۔ چنانچہ پچیس سال تک قبر مبارک پر حاضر ہو کر علم حاصل کرتے رہے۔

..... سیدنا خضر علیہ السلام نے جو علم شریعت امام عالی مقام سے حاصل کیا تھا۔ وہ انہوں نے سیدنا امام قشیری کو سکھا دیا۔ امام قشیری نے اسے لکھ کر ایک صندوق میں بند کر کے دریائے جیحون میں ڈال دیا۔ تا کہ جب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نزول فرمائیں تو انہی کتب کو نکال کر اس پر عمل درآمد فرمائیں۔

۴۔ **ایک اور نمونہ:** برصغیر میں معاصر علماء احناف کے سرخیل مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی یہ آہ اور حسرت بھی اس قابل ہے جس پر غور کیا جاسکتا ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ ایک تحریر میں فرماتے ہیں: میں نے ایک مرتبہ جناب

سید انور شاہ کشمیریؒ کو مغموم حالت میں سحری کے وقت سر پکڑے دیکھا تو عرض کی: حضرت مزاج کیسا ہے۔؟ فرمانے لگے کیا مزاج پوچھتے ہو، عمر ہی ضائع کر دی۔ میں نے عرض کی حضرت بات کیا ہے؟ فرمایا: ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا اور ہماری ساری کدو کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں اور امام ابوحنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔ اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ (وحدت امت ص:۱۶)

۵۔ **تلخ یادیں:** حرم پاک میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب ترکی کے بادشاہ فرح بن برقوق نے نویں صدی ھجری کے اوائل میں حرم پاک میں چار مصلے قائم کیے تو دنیا یہ تماشہ دیکھتی تھی کہ شوافع اگر نماز باجماعت پڑھ رہے ہیں تو احناف ایک طرف بیٹھے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا امام ابھی حنفی مصلے پر نہیں آیا اور نہ ہی ان کی نماز کا وقت ہوا ہے۔ بعینہ اسی طرح حنبلی اور مالکی بھی اپنے اپنے امام اور اپنے مصلے پر نماز پڑھنے کا شوق رکھتے تھے۔ یہ مرکز اسلام کی تصویر تھی جو ترکی بادشاہوں نے ہم آہنگی کے لئے اپنی سرپرستی میں پیش کرنا چاہی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اسلام کی یہ بھیانک تصویر اب حرم کعبہ میں نظر نہیں آتی اور سبھی ایک امام کے پیچھے باجماعت نماز پڑھنا سعادت سمجھتے ہیں۔ نعوذ باللہ یہ حالت اگر اب بھی باقی رہتی تو میڈیا بھی شاید اس اختلاف کو ہوا دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا۔

۶۔ **تقلید:** مسلمانوں کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ لفظ تقلید بھی شاید صلاۃ وصیام یا اطاعت واتباع کی اصطلاح کی طرح ایک دینی اصطلاح ہے جب کہ یہ ایک نئی مذہبی اصطلاح ہے۔ ایک باشعور آدمی اگر اس کے معنی ومفہوم کو جان لے تو وہ نہ صرف لفظ تقلید، مقلد وغیر مقلد جیسی اصطلاحات کے استعمال سے گریز کرے گا بلکہ اس اصطلاح پر فخر محسوس کرے گا جسے قرآن مجید نے استعمال کیا ہے یا رسولِ اکرم ﷺ نے۔

لغوی معنی: لفظ "تقلید" کا مادہ ق ل د ہے۔ اسی سے لفظ "قلادہ" ہے جو گلے کے پٹے کو کہتے ہیں۔ اور اسی سے باب تفعیل کے وزن پر تقلید کا لفظ ہے۔ عربی زبان میں تقلید کا مطلب ہے گلے میں پٹہ ڈالنا۔ اور مقلّد اس جانور کو کہتے ہیں جس کے گلے میں کوئی انسان پٹہ ڈال کر اپنی رسی سے اسے کھینچتا جائے اور جانور اس کے پیچھے چلتا جائے۔ عربی زبان کی تمام قدیم وجدید لغات وقوامیس یہی معنی بتاتی ہیں۔

اصطلاحی معنی: علمائے فقہ میں ملا علی القاریؒ نے شرح قصیدہ اُمالی میں اس کی تعریف یہ کی ہے:

اَلتَّقْلِیْدُ: قَبُوْلُ قَوْلِ الْغَیْرِ بِلَا دَلِیْلٍ۔ کسی غیر کی بات کو دلیل کے بغیر قبول کر لینا تقلید کہلاتا ہے۔

امام غزالیؒ نے کہا:

هُوَ قَبُولُ قَولٍ بِلاَ حُجَّةٍ۔ کسی کی رائے کو بغیر دلیل کے قبول کرنا تقلید ہے۔

اور کسی نے کہا:

هُوَ الْعَمَلُ بِقَولِ مَنْ لَيْسَ قَوْلُهُ إِحْدَى الْحُجَجِ بِلاَحُجَّةٍ۔ کسی شخص کے ایسے قول پر جو حجت نہ ہو بلا کسی دلیل کے عمل کرنا تقلید کہلاتا ہے۔

کمال الدین ابن الہمام (م: ۸۶۱) اپنی معروف کتاب التحریر فی أصول الفقه (ص: ۳۴۰، مطبعہ امیریہ ۱۳۱۷ھ) میں لکھتے ہیں:

التَّقْلِيْدُ الْعَمَلُ بِقَولِ مَنْ لَيْسَ قَوْلُهُ إِحْدَى الْحُجَجِ بِلاَحُجَّةٍ۔ تقلید اس شخص کے قول پر بلا حجت عمل کرنے کا نام ہے جس کا قول کوئی حجت کی حیثیت نہیں رکھتا۔

اس تعریف سے قول رسول بھی نکل گیا اور اجماع امت بھی۔ اور مفتی کے قول سے ایک عام فرد کا عمل بھی تقلید سے نکل گیا۔ اس لئے کہ قول رسول، اجماع امت اور قول مفتی تو حجت قائم کرتے ہیں۔ اسی لئے تقلید کی اگر کوئی بھی حجت ہو تو یہ بذات خود تقلید کی معنوی نفی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی امام فقیہ یا مجتہد نے عام وخاص کے لئے تقلید کو جائز قرار نہیں دیا۔ امام بخاریؒ نے تقلید شخصی کو ناجائز قرار دیتے ہوئے اس آیت کو دلیل بنایا: ﴿ولا تقف ما ليس لک به علم﴾ کہ جس چیز کے بارے میں تمہارے پاس علم ہی نہیں تو اس کے پیچھے مت پڑو۔ اس لئے کہ عمل سے قبل علم ضروری ہے۔ جب کہ مقلد بے علم ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کی بات کو صحیح یا غلط جانے بغیر ماننا درست نہیں۔ دین کے معاملے میں تو محتاط ہونا ہے۔ مقلد جب قول امام پر عمل کرتا ہے تو اسے کچھ علم ہی نہیں ہوتا۔ کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح۔ **مقلد:** کسی کی بات کو بغیر دلیل کے قبول کئے عمل کرنے والا شخص مقلد کہلاتا ہے۔

تبصرہ: اس میں اب کونسی معقولیت ہے؟ کہ ایک مسلمان کو کسی امتی عالم یا فقیہ کے ساتھ ایسے الفاظ سے جوڑ دیا جائے جس میں اس کے شعور، شخصیت، احترام اور اشرف المخلوقات ہونے کا تصور ہی ختم ہو جائے؟ ایسا تو رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی اللہ نے نہیں چاہا۔ اور نہ آپ ﷺ نے چاہا۔ اگر کسی عالم یا فقیہ کے ساتھ کسی کو جوڑنا بھی تھا تو کوئی اور مناسب لفظ ہو سکتا تھا جس میں انسانی توقیر تو ہوتی۔ اس میں انسانی آزادی اور ذہنی اڑان پر پابندی ہے۔ جب کہ دین اللہ ورسولؐ کے ذریعے بھی یہ پابندی نہیں لگانا چاہتا۔ ﴿لا إكراه في الدين﴾ دین میں کوئی جبر نہیں۔ بلکہ

تدبر اور تفکر کی دعوت دیتا ہے۔ لفظ تقلید، شخصیت پرستی کے مفہوم کو اجاگر کرتا ہے جبکہ لفظ اطاعت واتباع، شخصیت پرستی کی جڑ کاٹتا ہے۔ اس لیے خود کو متبع رسول کہنا اور کہلوانا ہی زیادہ موزوں ہے۔

ہماری رائے ہے کہ اگر اس لفظ کا استعمال انسانی عزت، شرافت اور وقار کے مناسب حال ہوتا تو قرآن میں یا رسول اکرم ﷺ کی زبان میں اس کا استعمال ضرور ملتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس لفظ کے نامناسب مفہوم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے نہ قرآن میں استعمال کیا ہے اور نہ رسول کریم ﷺ نے اپنی زبان میں، بلکہ اس جیسی اصطلاحات تو بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ''خیر القرون'' کے بعد کی پیداوار ہیں۔

تقلید کی ابتداء: تقلید کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی؟ اسے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے لفظوں میں ملاحظہ کیجئے۔ حضرت قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

> اعْلَمْ أَنَّ النَّاسَ قَبْلَ الْمِائَةِ الرَّابِعَةِ كَانُوا غَيْرَ مُجْمَعِينَ عَلَى التَّقْلِيدِ الْخَالِصِ لِمَذْهَبٍ وَاحِدٍ بِعَيْنِهِ۔ آپ کے علم میں یہ بات ہونی چاہئے کہ مسلمان چوتھی صدی ہجری سے قبل کسی ایک مذہب کی تقلید خالص پر متفق نہ تھے۔

یعنی جناب رسالتمآب ﷺ اصحابِ کرامؓ، اور اسلاف کی ان ساری چار صدیوں میں موجودہ تفریق نہ تھی۔ سب قَالَ اللّٰهُ و قَالَ الرَّسولُ کے متلاشی اور اسی پر عمل پیرا تھے۔ بالفرض اگر تقلید کا جواز ﴿ **فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون** ﴾ اہل علم سے پوچھ لیا کرو اگر تمہیں علم نہ ہو۔ سے بھی لے لیا جائے جب کہ آیت میں اہل علم یعنی علماء کی بات کی گئی ہے نہ کہ ایک عالم کی۔ تو بھی سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا امام ابوحنیفہؒ سن ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ امام مالکؒ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ امام شافعیؒ ۱۵۰ھ اور امام احمدؒ ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ان بزرگوں کی پیدائش سے قبل کے مسلمان اپنے آپ کو کیا کہلواتے تھے؟ اور وہ کس کی اقتداء کرتے تھے؟ خود یہ ائمہ کرام کس کی اقتداء کرتے تھے؟ اس اقتداء کو کیا کہا جاتا تھا؟ یہ الزام کہ اگر یہ اقتداء جسے تقلید کہا جاتا ہے، نہ کی جائے، تو آدمی خود علامہ یا مجتہد ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا وہ خواہش کا غلام بن جاتا ہے۔ فقہ، مالکی، حنفی، شافعی اور حنبلی کی تمام معتبر کتب میں بے شمار مسئلے ایسے پائے جاتے ہیں جو ان ائمہ کرام اور ان کے عظیم شاگردوں کے مابین مختلف فیہ ہیں۔ یعنی شاگرد اپنے استاد کی تقلید نہیں کرتا بلکہ اپنی مستقل رائے رکھتا ہے۔ ان کے بارے میں کیا رائے دی جائے؟ بتائیے یہ خواہش نفس ہے اور کیا ان شاگردانِ خاص نے اپنے استادِ محترم کے خلاف رائے دیکر کوئی جرم کیا ہے؟ اگر نہیں تو

پھر یہ پابندی و ناراضگی کیوں؟ نیز جب چاروں حق پر ہیں تو تین کو چھوڑ کر ایک کو اپنانے میں دیگر ائمہ کی توقیر کی جا رہی ہے یا تحقیر؟

تقلید کا حکم: یہ بحث بھی فضول لگتی ہے کہ تقلید ضروری ہے یا نہیں؟ آپ مقلد ہیں یا غیر مقلد؟ شریعت میں تقلید کو علماء نے بنیادی طور پر مذموم بتایا ہے۔ کوئی مسلمان یہ حیثیت ہی نہیں رکھتا کہ امت کے کسی بڑے عالم یا مجتہد کو یہ مقام دے دے کہ اس کی پیروی بے سوچے سمجھے شروع کر دی جائے؟ بلکہ اطاعت کو ہی اپنے لئے باعث اعزاز سمجھتا ہے۔ تقلید کا لفظ ہی عصبیت کا نام ہے۔ مزید یہ کہ جن کی تقلید کی جا رہی ہے انہوں نے کب اور کہاں فرمایا ہے کہ میری تقلید کرو؟ کیا ان کے شاگردوں نے کی؟ صحابہ رسول ہوں یا تابعین وہ اس لفظ سے نا آشنا تھے چہ جائیکہ ان کے دور میں اس کے جواز کی صورت ملتی ہو۔

تقلید کے بارے میں علماء دو رائے رکھتے ہیں۔ جو فریق اس کو بالکل ناجائز سمجھتا ہے۔ وہ قرآنی آیات و احادیث کو پڑھ کر کپکپا اٹھتا ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے ہم کیسے اپنے آپ کو کسی بھی عالم یا مفتی کے حوالے کر دیں؟ اور اگر کرنا بھی ہے تو کیوں نہ رسول اللہ ﷺ ہی کے حوالے کریں؟ کیوں نہ ہم اطاعت و اتباع کے الفاظ و اصطلاحات کا استعمال کریں جو اللہ و رسول نے ہمیں عطا کئے ہیں۔ جن کے معنی ہیں افعال و احکام میں اسوہ رسول ﷺ کی فرمانبرداری۔ پھر یہ الفاظ صرف اللہ و رسول ﷺ کیلئے مستعمل ہیں نہ کہ دوسروں کیلئے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي﴾ آپ کہئے! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔

ان الفاظ کی اتنی زبردست اہمیت ہے کہ چالیس سے زائد مقامات پر قرآن میں آئے ہیں۔ اللہ و رسول کی اطاعت و اتباع کا اس لئے کہا گیا ہے تاکہ دین خالص رہے اور اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہونے پائے۔ مزید یہ کہ رسول معصوم ہوتا ہے اور غلطیوں سے مبرا بھی۔ اور کوئی معصوم نہیں۔ دوسرے سے غلطی کا امکان ہے اور بلا شبہ اس سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ شاہ صاحبؒ دوٹوک الفاظ میں فرماتے ہیں:

إِنْ آمَنْتُمْ بِنَبِيِّكُمْ فَاتَّبِعُوهُ خَالَفَ مَذْهَبًا أَوْ وَافَقَهُ. (تفہیمات ۱/۲۰۲) اگر تم اپنے نبی ﷺ پر ایمان لائے ہو تو پھر آپ ﷺ ہی کی اطاعت کرو خواہ وہ مذہب کے خلاف ہو یا موافق۔

تقلید کے نتائج: چونکہ تقلید شخصیت پرستی کا نام ہے اس لئے جب شخصیات کو ایک دوسرے پر فوقیت دی جائے گی

تو لامحالہ حب علیؓ اور بغض معاویہؓ کی کیفیت تو پیدا ہو گی۔ اس تقلید کی گرویدگی نے مسلمانوں کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اور جو کام مسلمانوں سے کروائے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

وَتَرَى الْعَامَةَ سِيَّمَا الْيَومَ فِي كُلِّ قُطْرٍ يَتَقَيَّدُونَ بِمَذْهَبٍ مِنْ مَذَاهِبِ الْمُتَقَدِّمِينَ، يَرَوْنَ خُرُوجَ الإِنْسَانِ مِنْ مَذْهَبِ مَنْ قَلَّدَهُ وَلَو فِي مَسْئَلَةٍ، كَالْخُرُوجِ مِنَ الْمِلَّةِ كَأَنَّهُ نَبِيٌّ بُعِثَ إِلَيهِ، وَافْتَرَضَتْ طَاعَتُهُ عَلَيهِ، وَكَانَ أَوَائِلُ الأُمَّةِ قَبْلَ الْمِائَةِ الرَّابِعَةِ غَيرَ مُتَقَيِّدِينَ بِمَذْهَبٍ وَاحِدٍ۔ ہر علاقہ کے عوام مروجہ مذاہب میں سے کسی ایک کی تقلید کرتے ہیں۔ ایک معمولی سے مسئلہ میں بھی تقلید سے آزاد ہو کر کسی کا سوچنا ان کے نزدیک ایسا ہے جیسا کہ کوئی ملت اسلامیہ سے نکل گیا ہو گویا ان کا امام ایک نبی مبعوث ہے جس کی اطاعت ان پر فرض ہے۔ ایک ہی مذہب کی پیروی کا یہ انداز قرون اولی میں نہیں تھا۔

یہ عبارت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تفہیمات ۱۵۱/۱ سے لی گئی ہے اصل دین کو اجاگر کرنے کی وہ کوشش جو شاہ صاحب مرحوم نے ایک تحریک کی صورت میں چلائی تھی افسوس ان کے معتقدین میں باقی نہ رہی۔ سلطان العلماء شیخ عز بن عبدالسلام رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

یہ حیران کن بات ہے کہ مقلد فقہاء کو جب اپنے امام کے بتائے ہوئے مسئلے کی کمزوری کا علم ہو جائے اور جس کے عذر و مداوے کی کوئی صورت بھی نہیں ہوتی تب بھی وہ اپنے امام کی تقلید کیے جاتے ہیں۔ اس تقلید اور مذہبی جمود کے باعث انہیں کتاب وسنت اور صحیح قیاس کو ترک کرنے میں بھی کوئی باک نہیں ہوتا بلکہ اس سلسلے میں دفاع امام کے لئے دوراز کار قیاس و باطل تاویلات کا سہارا لیتے ہیں۔

علماء سلف کے ان اقوال کی روشنی میں جو نقصان مسلم امہ کو پہنچا اس میں:

...... سلف صالحین کے طریقہ کار کو چھوڑ دیا گیا جنہیں قرآن کریم نے خود متعارف کرایا تھا کہ

﴿ والسابقون الأولون من المهاجرين والأنصار والذين اتبعوهم بإحسان رضي الله عنهم ورضوا عنه﴾ (التوبۃ:۱۰۰)

یعنی یہ تین قسم کے لوگ تھے۔ اولا: مہاجرین میں السابقون الاولون۔ ثانیاً: مہاجرین کے مددگار۔ انصار اور ثالثًا: وہ جو انہی کی احسن طریقے سے پیروی کرتے رہے۔ اور انہی کے منہج پہ چلتے ہیں۔ اس کے برعکس:

...... ہم نے اپنے فقہاء کی دوسرے فقہاء پر برتری ثابت کی۔

......انہیں معصوم قرار دے کر اپنے عقیدے کو خراب کیا۔

......دوسرے فقیہ کو کم تر جانا۔

......ہم نے فقہ اسلامی کو اختلافات اور جھگڑوں کی تاریخ بنا کر اسے نئی طبیعتوں کے لئے بوجھل کر دیا۔

......ان کے نام سے گروہ بندیاں کیں۔

......ہم نے نہ سوچا کہ دنیا اپنے سائنس دانوں کی (Theories + Research) پڑھ کر اپنی (Theory) دے دیتی ہے اور پہلے کی تھیوری کو غلط یا قدیم قرار دے کر رد بھی کر دیتی ہے مگر اس کے باوجود ان کے ہاں پہلے سائنس دان کا احترام قائم رہتا ہے۔ ہماری شریعت نے بھی بیشتر وہ احکام جو توراۃ وانجیل کے تھے انہیں منسوخ کیا اور نا قابل عمل کہہ کر نئے احکام دیئے۔ مگر ہم ایسا نہ سوچ سکے۔

اس رویے کے جو بھیانک نتائج سامنے آئے وہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کی زبانی سنئے:

> فقہ کے مذاہب اربعہ جب مشخص ومدوّن ہو گئے اور تقلید شخصی کا التزام ہو گیا تو سوال پیدا ہوا کہ ان چاروں اماموں میں افضل کون ہے حضرت امام ابوحنیفہؒ یا حضرت امام شافعیؒ؟ اب بحث شروع ہوئی اور بحث نے جنگ وقتال کی شکل اختیار کی۔ چنانچہ ہلاکو خان کو اسلامی ممالک پر حملہ کی سب سے پہلی ترغیب خراسانیوں کے اسی جھگڑے سے ملی تھی۔ حنفیوں نے شافعیوں کی ضد میں آکر بلاوا بھیجا اور شہر کے پھاٹک کھول دیئے۔ جب تاتاریوں کی تلوار چل گئی تو اس نے نہ شافعیوں کو چھوڑا نہ حنفیوں کو۔" ﴿فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَفْعُولًا﴾ (ملخص ترجمان القرآن ۲/۴۹۴)

مقلد وغیر مقلد؟ مقلد وغیر مقلد کی پھبتی بھی ہمارے ہاں عام ہے۔ یہ کون ہوتے ہیں؟ مسجد میں نہ آنے والا مسلمان تو اس قسم کی پھبتیوں سے ناواقف اور نالاں ہے مگر ہمارا عام مسلمان بھی ان کا استعمال بڑے فخریہ طور پر کرتا ہے۔ یہ کیا نام وصفات ہیں؟ ان کا جواب صرف یہی ہے کہ یہ سب اصطلاحات رد عمل کے طور پر ابھری ہیں نہ کہ کسی قابل فخر جدوجہد کا ثمرہ ہیں۔ اب ان کی تعریف ملاحظہ فرمائیے:

مقلد: وہ ہوتا ہے جو کسی بھی امام، یا مجتہد یا قائد کے افکار ونظریات کی روشنی میں قرآن وحدیث کو سمجھے۔ اور اسی امام یا مجتہد کی فکر کا پابند رہے اور اپنے آپ کو اسی کی طرف منسوب کرے اور باقی ائمہ مجتہدین کو چھوڑ دے اور ان کے علم سے فائدہ نہ اٹھائے۔

غیر مقلد: وہ ہوتا ہے جو ایسا نہ کرے۔ یہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔

ا۔ وہ غیر مقلد جو قرآن وحدیث کے ہوتے ہوئے کسی امام یا مجتہد کی فکر کا پابند نہ ہو۔ بلکہ اسلاف کا جو دین کو اخذ

کرنے کا طریقہ کار رہا ہے اس کا بھی وہی معروف طریقہ ہو۔ قرآن کے بعد صحیح حدیث ہی اس کا مرکز ہو۔ وہ اپنے آپ کو کسی عالم کا یا بخاریؒ و مسلمؒ کا مقلد نہیں کہلاتا بلکہ اس کی بات جو قرآن یا صحیح حدیث سے ثابت ہے یا صحیح سند کے ساتھ مروی ہے اس کا متبع کہتا ہے۔ عوام کا تو یہ کام ہی نہیں کہ وہ اجتہاد کریں یہ تو علماء کا کام ہے کہ وہ دین کو اس کے اصل سرچشمہ سے لے کر انہیں دیانتداری سے بتائیں۔

ب۔ یہ غیر مقلد وہ ہوتا ہے جو نہ تو کسی امام یا مجتہد کی فکر کا پابند ہوتا ہے اور نہ ہی قرآن وحدیث کو سمجھنے اور جاننے کے ثابت شدہ اصولوں کا۔ بلکہ اس کی اپنی ایک آزاد فکر ہوتی ہے اور نادر قسم کا اجتہاد اس سے اگلواتی ہے۔ جو سبیل المؤمنین نہیں ہوتا۔ وہ نصوص یعنی قرآن وحدیث کے مفہوم کو بدلنے کے لیے لغت کا سہارا لیتا ہے۔ اور قرآنی تفسیر ہو یا حدیث رسول ان دونوں کے فہم میں اس کا طرز استدلال معروف تفسیری وحدیثی اصول وقواعد سے ہٹ کر ہوتا ہے تا کہ وہ دور کی کوئی کوڑی لا سکے جو تفسیری وحدیثی انحراف ہے۔

۷۔ گروہ بندیاں: ان کی تعداد تو اللہ کو ہی معلوم ہے کہ مسلمانوں میں اب کتنے گروہ ہیں مگر صرف اہل سنت میں اہل حدیث اور حنفی حضرات کے تفرقے کو ہی اگر دیکھا جائے تو بناؤ کی جگہ بگاڑ آخر تک پھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اہل حدیث مختلف جماعتوں میں بٹ گئے۔ حنفی حضرات دیوبندی، بریلوی اور حنفی میں تقسیم ہوگئے۔ اس لئے کہ کچھ حنفی ایسے ہیں جو اپنے آپ کو دیوبندی اور بریلوی کہلوانا پسند نہیں کرتے۔ جن میں نامور مذہبی جماعتیں اور ان کے امراء شامل ہیں۔ پھر دیوبندی حضرات حیاتی اور مماتی کے عقیدے میں ایسے الجھے کہ ان میں واضح طور پر تقسیم ہوگئی۔ عقائد ہی بدل گئے۔ رسول اللہ ﷺ کو قبر میں زندہ ثابت کرنے کے لئے یہ تک مبالغہ کیا گیا کہ آپ ﷺ نے قبر مبارک سے ہاتھ نکال کر فلاں سے مصافحہ کیا۔ اہرام مصر میں فرعونیوں۔۔۔ کے لئے رکھے گئے ساز وسامان اور سونا وغیرہ اور پھر ان کی قبر میں ہی شادی اور خوشی کے لمحات تا کہ اسے تنہائی محسوس نہ ہو وغیرہ۔۔۔ کے تصورات سے مختلف یہ عقیدہ نہیں ہے۔ بریلوی حضرات تصوف کے ہی گرویدہ ٹھہرے، انہیں ذکر ووظائف کا ہر نیا طریقہ ایک نئے سلسلے کی طرف لے گیا جو بالآخر مفاخرت سلاسل پر جا کر نقشبندی، قادری، چشتی، سہروردی وغیرہ پر منتج ہوا۔ ان گروہ بندیوں میں ہر ایک کے الگ الگ امیر بنے، اپنی اپنی مساجد قائم ہوئیں اور مدارس بنے۔ اس تفریق کے ہوتے ہوئے یہ کہنا بھی بڑی عجیب بات ہوگی کہ چونکہ ہم مسلمانوں میں اکثریت ہیں لہٰذا ہمارا ہی مذہب یا فقہ بہت بہتر ہے۔

دین اسلام کا حال ہمارے سامنے
اسلام
اہل سنت
اہل تشیع
منحرف گروہ
قادیانی واحمدی
پرویزی
یہ دونوں گروہ شخصیت اور عقیدہ کی بنیاد پر تاریخی اعتبار سے کئی حصوں میں بٹے جن میں مثلاً:
اہل سنت: مالکی، حنفی، شافعی، حنبلی میں اور شیعہ: جعفری، امامی، اسماعیلی، بوہری وغیرہ میں
حنفی بھی بٹ گئے
حنفی
دیوبندی
بریلوی
حنفی: جماعت اسلامی، اصلاحی گروپ، تنظیم اسلامی
دیوبندی: حیاتی اور مماتی میں تقسیم ہو گئے۔ جن میں: ایک جماعت
توحید و سنت اور دوسری تبلیغی جماعت و ۹۵٪ دیوبندی۔
بریلوی: نقشبندی، سہروردی، چشتی، قادری، اویسی وغیرہ
اہل حدیث: یہ بھی کئی معمولی
بنیادوں پر بٹ گئے۔ مثلاً:
مرکزی جمعیت اہلحدیث
جماعت اہل حدیث
جماعت غرباء اہل حدیث

پھر کون سا فرقہ برحق ہے؟ اس کا جواب یہ حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

یہود ونصاریٰ میں بہتر فرقے بنے میری امت میں تہتر بن جائیں گے۔ سب دوزخ میں جائیں گے سوائے ایک کے۔

صحابہ نے عرض کی: من هم يا رسول الله! اللہ کے رسول وہ کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ماأنا عليه وأصحابي۔

جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔

یہ سوچنا ہمارا کام ہے کہ کیا صحابہ کرام اس طرح فرقوں میں بٹے ہوئے اور مختلف ناموں و جماعتوں پر تھے؟ ایسی صورت میں تو جماعت کے ساتھ کام کرنے میں رحمت نہیں بلکہ زحمت ہے۔

۸۔ **جماعت سازی اور امارت**: اسی طرح جب بھی کوئی نئی جماعت بنتی ہے اس کی کوئی نہ کوئی ایسی توجیہ پیش کی جاتی ہے جس سے نئی لیڈرشپ یا نئی جماعت کا جواز فراہم کیا جاسکے۔ اور رکن سازی و بیعت ذاتی کے بھنور میں ہی سنجیدہ مسلمان کو گھمایا جائے۔ اسلام میں کہیں بھی اور کسی بھی حیثیت سے یہ پسند نہیں کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت پر جماعت بنتی جائے اور یوں وہ افتراق در افتراق کا شکار ہوتے چلے جائیں۔ اگر حدیث میں یہ آیا ہے: لَا جَمَاعَةَ إِلَّا بِإِمَارَةٍ...... جماعت امیر کے بغیر نہیں ہوتی۔ یعنی امراء نہیں ہوتے بلکہ ایک امیر ہوتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے: إِذَا بُويِعَ لِخَلِيفَتَيْنِ فَاقْتُلُوا الآخِرَ مِنْهُمَا (مسلم: ۱۸۵۳)...... جب ایک امیر منتخب کرلیا جائے تو بعد والے کو قتل کردو۔ خواہ وہ کتنا ہی نیک اور پارسا کیوں نہ ہو۔ کیونکہ وہ افتراق کا سبب بن رہا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا پہلا امیر جب منتخب ہوگا تو بعد والے امیر اس حدیث کے بارے میں کیا کہیں گے؟

اس ضمن میں آپ کا یہ ارشاد بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ الأَمِيرُ الضَّعِيفُ مَلْعُونٌ۔ (سنن بیہقی)...... کمزور امیر ملعون ہے۔ کچھ کر نہیں سکتا نہ ہی اس کا کوئی کہنا مانتا ہے تو کیوں وہ امارت کی کرسی سے چمٹ کر بیٹھا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ کرسی چھوڑ دے تاکہ اہل لوگ آئیں اور دینی کام کو آگے بڑھائیں۔ اور یوں ان کی صلاحیتیں کام آئیں۔ یا اپنی جماعت کے جواز کے لئے ایک دلیل یہ بھی فراہم کی جاتی ہے: يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ...... کہ اللہ کا جماعت پر ہاتھ ہوتا ہے۔ مگر اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہوتا ہے، جماعتوں پر نہیں۔

ہمیں اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان تمام فرقہ بندیوں اور امارتوں سے توبہ کرکے، قرآن وسنت کی بنیاد پر ایک ہو جانا چاہئے۔ حکومت تمام مکتب فکر کے علماء پر مشتمل ایک اعلیٰ اختیاراتی بورڈ بنائے، جس کے ارکان غیر متعصب، دین دار اور معتدل مزاج ہوں، روادار ہوں، صحیح معنوں میں عالم ہوں اور قدیم وجدید پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ یہ سب ہر فقہ سے فائدہ ضرور اٹھائیں مگر قرآن وسنت کو زندہ کریں۔ یہ نہ اجتہاد کی دعوت ہے اور نہ مذاہب

خمسہ کے خلاف علم بغاوت۔قرآن مجید میں ہی ہے:

﴿من الذين فرقوا دينهم و كانوا شيعا لست منهم في شيء﴾۔جن لوگوں نے دین کوٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور مختلف گروہوں میں وہ بٹ گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔یہ آیت ہمارے پیش نظر رہے۔

۹۔فروعی مسائل: فقہ میں فروعات پر مباحث بے شمار ہیں۔جو ہر فقیہ کے دینی فہم کی عکاس ہیں۔ان فروعات کے بارے میں نہ مجتہد کوئی حتمی رائے دے پاتا ہے اور نہ ہی کوئی اور۔مگر یہ ایک واضح بات ہے کہ فروعات پر مجتہد کے کام نے اور استدلالی طریقہ کار نے سوچنے سمجھنے اور دلائل کو جاننے کا ذوق فقہ کے طالب علم میں ضرور پیدا کر دیا ہے۔ فروعات وہ مخفی مگر زیادہ تر معمولی مسائل ہوتے ہیں جو آیات واحادیث کو سامنے رکھ کر مستنبط کئے جاتے ہیں۔فقہی کتب کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی تدوین تین انداز سے ہوئی۔

ا۔مسئلہ اٹھنے کے بعد: مثلاً کسی نے نماز شروع کی۔اور نماز میں کسی بات پر قہقہہ آ گیا۔ایسی نماز کا کیا ہوگا کیا یہ نماز ٹوٹ گئی یا اسے اپنی نماز جاری رکھنی چاہئے؟ قرآن مجید کی آیات کی طرف دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ نماز میں خشوع وخضوع کے ساتھ کھڑے ہونے کا کہا گیا ہے۔تو کسی فقیہ نے کہا کہ نماز جاتی رہی۔دوسرے فقیہ کی نظر حدیث پر پڑی تو اس نے کہا کہ نماز نہیں بلکہ وضو بھی جا تا رہا۔دلائل کو دیکھا گیا تو عقلی طور پر پہلے کی بات درست نظر آئی کیونکہ قہقہہ خشوع کی کیفیت سے مکمل متضاد کیفیت ہے اس لئے زیادہ سے زیادہ اس کی نماز ہی ٹوٹ گئی۔ دوسرے فقیہ کی دلیل یہ نظر آئی کہ کوئی نابینا جماعت میں شامل ہونے کے لئے صف کی طرف آ رہے تھے کہ اچانک ہی ایک کھڈ جو راستہ میں تھا اس میں جا گرے۔صحابہ کرام جو آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے انہوں نے جب یہ منظر دیکھا تو نہ صرف ہنسی آئی بلکہ ان کے قہقہے نکل گئے۔آپ ﷺ نے نماز کے بعد انہیں فرمایا: جاؤ تم لوگ دوبارہ اپنا وضو کرو۔محدثین نے اس حدیث کو دیکھا تو درایت کے اعتبار سے یہ حدیث جہاں گئی گذری انہیں محسوس ہوئی وہاں نقلی اعتبار سے بھی انہوں نے اسے موضوع قرار دیا۔

۲۔مسئلہ اٹھنے سے پہلے: ایسے فروعی مسائل میں یہ فرض کر لیا گیا کہ مستقبل میں اگر ایسا ہو جائے تو؟ مثال کے طور پر شادی شدہ خاتون کا شوہر لاپتہ ہو گیا۔تلاش بسیار کے باوجود کچھ علم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں ہے؟ یا آیا وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے؟ سوال یہ اٹھایا گیا کہ ایسی عورت اب کیا کرے؟ آیا وہ انتظار کرے یا دوسری شادی کر لے؟ اگر وہ انتظار بھی کرتی ہے تو کب تک؟ کسی فقیہ نے کہا: گم شدہ خاوند اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی نہیں کرائی جائے

گی۔ہاں جب اس پر ایک سو بیس سال گذر جائیں گے تو اس کی موت کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔اس کی تائید میں انہوں نے یہ دلیل پیش کی: وَلَنَا قَوْلُهُ ﷺ: امْرَأَةُ الْمَفْقُودِ امْرَأَتُهُ حَتّٰى يَأْتِيَهَا الْبَيَانُ. آپ ﷺ کا ارشاد ہے: مفقود کی بیوی اسی کی بیوی ہے جب تک کہ اس کی موت کا پروانہ نہیں آتا۔ان کا استدلال یہ ہے کہ انسان کی طبعی عمر اتنی ہی ہوسکتی ہے اس دوران اگر وہ آ گیا تو خیر ورنہ وہ عورت عدت گذارے گی بعد از عدت جہاں چاہے وہ شادی کر سکتی ہے۔اس فرعی مسئلے کی دلیل کو دیکھا گیا تو محدثانہ اعتبار سے نہ صرف ضعیف منکر و باطل نظر آئی بلکہ امام العینیؒ نے العنایہ میں اس حدیث کو دلیل بنانے پر سر پکڑا ہے۔اور شیخ عبدالحی لکھنویؒ نے اس حدیث کو بطور دلیل پیش کرنے پر کہا ہے کہ ایسے لوگوں کا جب یہ میدان ہی نہیں تو اتنی خامہ فرسائی کیوں؟

اس فتوے کے بارے میں ہمارا حسنِ ظن یہی ہے جس فقیہ نے بھی یہ فتوی دیا اس کا علم وفضل، زہد وتقوی، وقت نظر، وسعت ادراک، اسلام اور اس کے مصالح کے متعلق اس کے گہرے احساسات، امت اسلامیہ کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت ہیں۔لیکن معلوم نہیں کیا حالات تھے؟ یا کیا اصل صورتِ حال تھی جو اس عظیم فقیہ نے اس وقت اپنی صواب دید کے مطابق فتوے کی شکل میں اپنی رائے دی۔بہر حال وہ اپنے اجتہاد میں مخلص تھے۔درست اور صحیح تھے۔ان کا اجتہاد اگر صحیح بھی نہیں تو بھی اللہ تعالیٰ انہیں اجر وثواب سے از روئے حدیث محروم نہیں فرمائے گا۔

دوسرے فقیہ نے اس مسئلہ میں اپنی اجتہادی رائے یہ دی کہ آیات واحادیث میں تو ایسے مسئلے کی چونکہ وضاحت نہیں ملتی ہاں جناب امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہادی فیصلہ ہے کہ عورت کے صبر اور خاوند کے بیوی سے دوری پر صبر کی مدت زیادہ سے زیادہ چار سال ہوسکتی ہے اس لئے وہ چار سال تک انتظار کر لے بصورت دیگر وہ عدت گزار کر شادی کر لے۔اس رائے سے نہ صرف ام المومنین جنابہ حفصہؓ کا اتفاق ہے بلکہ جناب عثمان، ابن مسعود، ابن عمر، ابن عباس کا بھی اتفاق ہے۔پھر امام مالکؒ نے نہ صرف موطأ میں اس کی تائید کی بلکہ دیگر ائمہ امام شافعی وامام اوزاعی نے بھی اسی مسئلہ کو قبول کرنے کی نصیحت کی ہے۔

لیکن یہ سوال بھی قابل غور ہے کہ اگر جوان عورت کے لئے چار سال کا عرصہ نا قابل برداشت ہے تو وہ کیا کرے؟ اُس زمانہ میں تو دینی بیداری تھی۔خدا خوفی تھی۔آج کا دور تو فتنوں کا دور ہے۔خدانخواستہ کسی غلط رجحان کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔کیا یہ ممکن نہیں کہ جج اپنی صواب دید پر خاتون کے حالات اور عمر کے تقاضوں کا صحیح اندازہ کر کے جلدی فیصلہ کر دے؟ آخر مجاہدین کو بھی سیدنا فاروق اعظمؓ نے چار ماہ بعد چھٹی کر کے گھر آنے کی اجازت بھی تو مرحمت

فرمائی تھی۔

یہ سوال بھی ہے کہ کیا مستقبل کی ایک مفروضہ صورت پر فتوی دیا جاسکتا ہے؟ کیونکہ اصل صورت حال میں تو کئی اور عوامل بھی ہوسکتے ہیں جو اس وقت فقیہ کے ذہن میں نہ ہوں۔

۳۔ ذاتی رائے اور فرعی مسئلہ: بعض فروعی مسائل محض اپنے خیال و تجربہ کی بناء پر حکمت سمجھ کر بیان کئے گئے کہ شاید لوگ اس طرح نیکی کی طرف مائل ہوں اور برائیوں سے اجتناب کرنے لگ جائیں۔ مثال کے طور پر ایک مسلمان عمر بھر نماز نہیں پڑھتا۔ آخری عمر میں اسے خیال آتا ہے کہ نماز پڑھنی چاہئے۔ اب وہ اپنی گذشتہ ترک کی ہوئی نمازوں کا کیا کرے؟ کسی عالم یا فقیہ نے کہا کہ وہ توبہ کرے اس لئے کہ نماز کا عمداً ترک کرنا کبیرہ گناہ ہے اور کبیرہ گناہ سوائے توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔ اس لئے قضاء عمری کا کہنا شریعت سازی ہے جو اسلام کے اس اصول سے انحراف ہے۔ کسی عالم یا مفتی نے کہا کہ وہ قضاء عمری دے یعنی وہ اپنی چھوڑی ہوئی نمازوں کی قضاء دے اور طریقہ یہ بتایا کہ اپنی ہر نماز کے ساتھ وہ ایک گذشتہ نماز پڑھتا جائے۔ اور اگر مر گیا ہے تو اپنی ان نمازوں کا فدیہ دے جو فی نماز تقریباً پچیس روپے ہیں۔ کسی اور فقیہ نے کہا کہ قضائے عمری کا کتب فقہ میں ذکر ہی نہیں ہاں سونے، بے ہوش ہونے یا غفلت کی وجہ سے فوت شدہ نمازوں کی قضاء کا تو ذکر ہے مگر جان بوجھ کر چھوڑنے والے کی نماز کا ذکر نہیں نیز ان کا بھی قلت و کثرت کو سامنے رکھ کر قضاء وعدم قضاء کا فیصلہ کیا جائے گا۔ مثلاً:

> مَنْ أُغْمِيَ عَلَيهِ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فَمَا دُونَهَا قَضَاهَا إِذَا صَحَّ، فَإِنْ فَاتَتْهُ بِالإِغْمَاءِ أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ لَمْ يَقْضِ ...... یعنی بے ہوش کی پانچ نمازیں یا کم رہ جائیں تو وہ ہوش میں آنے کے بعد ان کی قضاء دے دے گا اور اگر زیادہ رہ گئیں تو ان کی قضاء نہیں۔

اس کی وجہ فقیہ نے یہ بتائی: ایک اصول ہے کہ جب مدت مختصر ہو تو اس کی قضاء میں حرج یعنی تکلیف نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے جیسے سوئے ہوئے کے لئے نماز قضاء پڑھنا اس لئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک دن سو لے گا مگر جب مدت طویل ہو تو پھر ایسی قضاء باعث حرج ہوتی ہے۔ جیسے حائضہ عورت کی نماز، اگر وہ حیض سے فراغت کے بعد اپنی نمازوں کی قضاء دینے لگ جائے تو اس کے لئے باعث حرج ہوگا اس لئے وہاں قضاء کی بات ہی نہیں کی۔

(دیکھئے: اللباب فی شرح الکتاب، آخر باب صلاۃ المریض، ج۱ص۱۰۱، مؤلف شیخ عبدالغنی المیدانی)

فقیہ نے یہ بھی کہا: فقہاء و محدثین کے ہاں ایسے نام نہیں پائے جاتے اور نہ ہی ان کا یہ طرز عمل ہے کہ بات ہو

فوت شدہ نمازوں کی اور قیاس کرتے ہوئے اسے وہ قضاء عمری کا نام دے دیں۔ محدثین کرام نے بے شمار مسائل احادیث سے مستنبط (Deduce) کر کے ابواب سازی (Headings) کی ہے۔ مگر کسی محدث نے **قضاء المتروکات** کا باب (Heading) نہیں باندھا۔ ہاں ایک موضوع حدیث ضرور ملتی ہے جس میں یہ نام مستعمل ہے۔ مگر محدثین میں یا چاروں فقہاء میں سے کسی نے کسی کتاب میں اس نام کی نماز کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ **المُختَصَر** قدوری جو فقہ حنفی کی اہم کتاب ہے اس میں باب **قَضَاءِ الفَوَائِتِ** کے حاشیہ نمبر تین میں قضاء الفوائت اور دوسری نمازوں کے درمیان ایک اور باریک فرق بتایا گیا ہے جو اہل علم کیلئے قابل غور ہے:

"إِنَّمَا قَالَ قَضَاءُ الْفَوَائِتِ وَلَمْ يَقُلْ قَضَاءُ الْمَتْرُوكَاتِ لِأَنَّ الظَّاهِرَ مِنْ حَالِ الْمُسْلِمِ أَنَّهُ لَا يَتْرُكُ الصَّلَاةَ عَمَدًا بَلْ تَفُوتُهُ بِاعْتِبَارِ غَفْلَةٍ وَنَومٍ وَنِسْيَانٍ" مؤلف نے **قضاء الفوائت** کہا ہے نہ کہ: **قضاء المتروکات** یعنی چھوڑی ہوئی نمازیں۔ کیونکہ مسلمان بظاہر نماز کو جان بوجھ کر ترک نہیں کیا کرتا بلکہ اس سے غفلت، نیند یا بھول کی وجہ سے نماز چھوٹ جایا کرتی ہے۔

رہا قضاء عمری کا فدیہ تو اولاً کسی حدیث سے یہ ثابت ہی نہیں بلکہ لَا كَفَّارَةَ إِلَّا ذٰلِكَ میں بھی آپ ﷺ نے فوت شدہ نماز کے بارے میں یہی فرمایا کہ جب اسے یاد آجائے وہ اسی وقت فوت شدہ نماز کو پڑھ لے اس کا کفارہ ہی یہی ہے۔ دیگر یہ کہ کسی قابل ذکر فقیہ یا امام نے اس کی تائید ہی نہیں کی جو شذوذ ہے۔ مزید یہ کہ فدیہ کے تعین پر بھی اتفاق نہیں کہ وہ کتنا ہو؟ نماز کی قضاء پر تو ہمارا اتنا اصرار ہو آخر ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ایک مسلمان مال دار ہوتے ہوئے زکوۃ ادا نہیں کرتا۔ کیا اس کی بھی کوئی قضاء عمری ہے؟ وغیرہ۔

فقہاء کی ان ساری محنتوں پر ان کے خلوص وتقوی پر شک کئے بغیر ہمیں ہمیشہ یہ حدیث پاک سامنے رکھنی چاہئے کہ الْمُجْتَهِدُ قَدْ يُخْطِيءُ وَيُصِيبُ فَإِنْ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ وَإِنْ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ وَاحِدٌ۔ مجتہد خواہ وہ امام ہو یا فقیہ، اپنے اجتہاد میں کبھی خطا بھی کر سکتا ہے اور کبھی نہیں کرتا۔ اگر اس کا اجتہاد درست ہو تو اس کے لئے اللہ کے ہاں دوہرا اجر ہے اور اگر خدانخواستہ اس کے اجتہاد میں خطا ہوئی ہے تو پھر بھی اس کے لئے ایک اجر ضرور ہے۔ ان فروعی مسائل میں صحابہ وتابعین اور ائمہ فقہاء کے بھی مختلف اقوال وفتاوی ہو سکتے ہیں اور ہیں۔ ظاہر ہے سب پر بیک وقت عمل ناممکن ہے۔ اس لئے ان پر عمل کے لئے چند جانچنے کے اصول ہیں جو ہمارے پیش نظر رہیں:

فروعی مسائل جانچنے کے اصول

۱۔ قرآن مجید اور صحیح وحسن احادیث کے مخالف وہ فتوی یا اجتہاد نہ ہو۔

۲۔ وہ فرعی مسئلہ قرآن مجید اور صحیح وحسن حدیث میں نہ ہو۔

۳۔ اکثر صحابہ وتابعین اور ائمہ کرام کا اس پر اتفاق ہو۔

۴۔ اقوال ائمہ وفقہاء میں سے عادل فقیہ کا صحیح ترین قول لے لیا جائے۔

فروعات کا صحیح منہج اور معیار دیکھنا ہو تو کتب حدیث کی وہ فہارس ملاحظہ فرمایئے جو ابواب میں مزین کردی گئی ہیں۔ یہ وہ فروعات ہیں جو ہر مؤلف کے دور میں اٹھے جن کا حل واضح اور صحیح نصوص سے پیش کیا گیا۔ شاہ صاحبؒ تفہیمات ۲/۲۴۰ میں لکھتے ہیں:

در فرع پیروی علماء محدثین که جامع باشند میان فقه وحدیث کردن۔ ودائماًتفریعات فقهیه را بر کتاب وسنت عرض نمودن وآنچه موافق باشد در حیز قول آوردن والا کالائے بد یرش خاوند دادن۔ امت را هیچ وقت از عرض مجتهدات بر کتاب وسنت استغناء حاصل نیست وسخن متقشفه فقهاء که تقلید عالمے را دستاویز ساخته تتبع سنت را ترک کرده اند۔ نه شنیدن وبدیشان التفات نه کردن وقربت خدا جستن بدوری اینان۔ فروع میں علماء محدثین جن کی فقہ حدیث دونوں پر نظر ہو۔ کی پیروی کرنا۔ فقہ کے فروعی مسائل کو ہمیشہ کتاب وسنت پر پیش کرنا، جو ان کے موافق ہو اسے قبول کرنا اور جو مخالف ہو اسے رد کردینا چاہئے۔ امت کو اپنے اجتہادی مسائل کتاب وسنت پر پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں متقشف فقہاء کی بات قطعاً نہ سنے۔ جنہوں نے اہل علم کی تقلید کر کے کتاب وسنت کو ترک کردیا ہے ان کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھے۔ ان سے دور رہ کر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے۔

نتائج: درجہ بالا تجزیہ سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ یہ سب خودساختہ، واقعات وحوادث ہیں۔ جنہیں علمائے احناف نے بھی قطعاً پسند نہیں فرمایا۔ اس غلو نے جو انتہائی رنگ دکھایا اور جسے لغزش ہی کہا جاسکتا ہے کہ ائمہ کی محبت نے اور اپنے اساتذہ اور بزرگوں کی عقیدت نے مخالفین پر تنقید کی راہیں کھول دیں۔ اور ایک دوسرے کے علم وفہم پر حملے ہونے لگے۔ احناف نے امام شافعیؒ کے علم وفضل سے متعلق ایسے الفاظ استعمال کئے جو حضرت امام شافعیؒ کے مقام کے لحاظ سے قطعاً نامناسب تھے۔ اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کے علم وفضل پر دوسری جانب سے حرف گیری کی گئی۔ جس سے امام ابوحنیفہؒ کا مقام کہیں بلند تھا۔ مالکیوں اور حنبلیوں میں بھی بعض اہل علم اس حرف گیری سے نہ بچ سکے۔

انہی جھگڑوں میں اپنی ساکھ بحال رکھنے کے لئے احادیث تک گھڑلی گئیں اور کچھ پختہ اصول ایسے بنا دیے گئے جن میں یہ کہہ دیا گیا کہ اگر قرآن کی کوئی آیت یا حدیث رسول ہمارے امام محترم کے قول کے مخالف ہو تو اس کی کچھ نہ کچھ تاویل ہوگی۔ اسلام کی واضح صورت ان اختلافات کی نذر ہوگئی اور ہمارے یہاں یہ پنپ نہ سکا۔

تدوین نو کی ضرورت

ہمارے اس دور میں علوم کے ہر فن میں تدوین نو بھی ہوئی ہے جس سے وہ علم مزید نکھرا ہے۔ فقہ کا علم بھی دور جدید میں تدوین نو کا متقاضی ہے تا کہ یہ علم بھی نکھرے اور عوام کو اس میں تکلف وشدت کی بجائے سادگی اور آسانی نظر آئے۔ اور یہ تدوین نو قرآن وسنت کی روشنی میں از سر نو ہو۔ اس کے چند ایک فوائد یہ ہیں:

☆...... تمام مذاہب کے ماہرین اور مقلدین قریب آئیں گے اور نفرت کم کی جا سکے گی۔

☆...... قرآن وسنت کے مقابلے میں قدیم فقہی کتب خود بہت دقیق، مشکل اور انتہائی مختصر ہیں۔ انہیں سلیس انداز میں پیش کرنا بہت بڑی خدمت ہوگی۔

☆...... مسلکی غلبے کی وجہ سے ان کتب کا علمی معیار بھی محدود ہے۔ انہیں سمجھنا ایک عام طالب علم تو کیا فارغ التحصیل عالم کے لئے بھی خاصا دشوار ہے۔ یہ تدوین نو فقہ کی آسانی کا بڑا سبب بنے گی۔

☆...... ان کتب میں ایسے احکام بکثرت ہیں جن کی علت ہی بیان نہیں کی گئی۔ اس خدمت کے ذریعے علت واسباب پیش کر کے ہر ایک کو قائل کیا جا سکے گا۔

☆...... ان کتب کا اسلوب ایک جیسا نہیں۔ معمولی مسائل میں غیر ضروری طوالت ہے۔ پانی کا استعمال، چاہے وہ کنویں کا ہو یا بہتا پانی یا کھڑا، اس پر مسائل وضو میں لمبی مفروضہ بحثیں ہیں۔

ایک طالب علم ان قدیم فقہی کتب سے کتنا مستفید ہوتا ہے؟ ایک مصری عالم کا حال دل سنئے:

جامعہ ازہر میں ہم نے باب وضوء تین ماہ میں پڑھا۔ مگر وضوء کی حقیقت وسہولت سمجھ نہ آئی۔ یہاں تک کہ فقہ السنہ نے آنکھوں پر سے پردہ اٹھایا۔ ہم میں بہتیرے جامعہ ازہر میں بارہ بارہ اور پندرہ پندرہ برس رہتے ہیں۔ اور مذاہب اربعہ میں کسی ایک مذہب کی اکثر وبیشتر کتابیں پڑھ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ فضیلت کی سند بھی مل جاتی ہے۔ لیکن جب آخر میں غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اتنی کتابیں رٹ جانے کے خود اس مذہب کی بھی تحقیق حاصل نہیں ہو پائی۔ دوسرے مذاہب کی تحقیق اور تفسیر وحدیث کا علم تو بہت دور رہا۔ چنانچہ

ہم ہمیشہ حیرت واضطراب میں پڑے رہتے ہیں کہ اختلافی مسائل میں طریق ترجیح تک نہیں جانتے"

(مقدمہ ھدی الرسول ص ۴)

عجیب رویے

......مسلکی فقہ کی سچائی اور برتری ثابت کرنے کے لئے عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ حدیث میں تو بڑا اختلاف ہے اس لئے اسے سمجھنا ہر فرد کا کام نہیں۔ بلکہ اس کے لئے فقہاء کرام نے فقہی مسائل کو ترتیب دے دیا ہے اسے سمجھنا ہی اب زیادہ بہتر ہے۔

......اسی طرح کچھ فقہی اصول وضابطے بھی ایسے مہیا کر دیئے گئے جن میں آیات واحادیث کو متعارض اور مختلف ثابت کیا گیا اور آیات کو علم قطعی قرار دے کر نتیجتاً احادیث کو علم ظنی بنا دیا گیا جن سے صحیح حدیث کی تخفیف ہوئی۔

......احادیث کی اہمیت مزید کم کرنے کے لئے یہ بھی باور کرایا گیا کہ ان احادیث سے عقیدہ ثابت نہیں کیا جا سکتا بلکہ آیات سے عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔

☆......ان رویوں کا جواب دینا مقصود نہیں بلکہ صرف اتنا ضرور عرض کرنا فرض سمجھتے ہیں کہ یہ سب رویے تقلید کے کرشمے ہیں جو اس کی بقا کے لئے اپنائے گئے ہیں۔ جن میں تضاد ہے۔ اس لئے کہ جہاں یہ ضابطہ لاگو ہوتا نظر نہ آیا وہاں نہ صرف حدیث کو سر آنکھوں پہ رکھا گیا بلکہ اس کی ایسی تاویل کی گئی جہاں اصول بھی اپنا سر پکڑ بیٹھے۔

☆......ہم یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم جس دل میں ہو وہ ایسے رویوں کی ضرور نفی کرے گا۔ وہ ضرور یہ باور کرے گا کہ ان مصادر میں اختلاف کی بجائے اپنی لاعلمی یا اس صلاحیت کا فقدان ہے جو قرآن وسنت کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے کیونکہ قرآن وسنت کے بظاہر اختلاف کو سمجھنا صلاحیت نہیں بلکہ اس کے مدلل حل کو سمجھنا ہی اصل صلاحیت واہلیت ہے۔ ہم اگر شخصیت پرست نہ بنیں۔ غلو سے اجتناب کریں اور رسالت کی عقیدت میں آ جائیں تو سارا دین ایک خوب صورت گلدستہ نظر آئے۔

☆......اس کے برعکس موجودہ فقہی سرمایہ میں ذکر شدہ فتاوی واستنباطات یا اجتہادات میں بظاہر یہ اختلاف قرآن وسنت کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ جو نہ صرف فروعی ہے بلکہ اصولی بھی ہے۔ کہیں سہو ہے تو کہیں غلطی اور کہیں بالکل لاعلمی۔ مگر ہماری عقیدت یہاں ان کے لئے اعذار تلاش کرتی ہے اور عجیب وغریب تاویلات بھی!!!

☆......ہمیں ماننا چاہئے کہ یہ سب فقہاء کرام کی مثبت کاوشیں تھیں اور مسائل کے ادراک میں ان کا یہ توسع تھا جسے

اپنے دور کے جدید تقاضوں کے مطابق انہوں نے پیش کیا۔ یہ ائمہ ہدیٰ ہمیشہ حق کی طلب میں رہتے۔ ان کے یہ اجتہادات نہ عصبیت وعناد پر مبنی تھے اور نہ ہی شہرت وجدال کی خاطر تھے۔ بلکہ ان کی یہ ساری محنت، خدمت دین کے لئے ہی تھی۔ یہی وہ سچائی ہے جسے ہم اگر سمجھ لیں تو شاید ہمارا تعصب وتصلب ماند پڑ جائے اور مسلکی مسائل کی شدت میں بھی کمی آئے۔

☆......یہ بھی درست نہیں کہ کسی ایک فقیہ کے اقوال وفتاویٰ کو ہی دین کی حقیقی اور صحیح تعبیر سمجھ لیا جائے۔ ایسا کرنے سے ہم جہاں قرآن وسنت کے معانی کو ایک ہی فقیہ کے فہم تک محدود کر دیں گے وہاں دیگر فقہاء کرام کے علم سے بھی محروم ہوں گے۔ یہی تو نتائج ہیں اس عقیدت کے کہ بغیر سند کے بیان شدہ ایک قول، صحیح حدیث سے بھی زیادہ درجہ پا جاتا ہے۔ اور حدیث کے ابلاغ، اس پر کی گئی صحابہ وتابعین اور تبع تابعین کی تحقیق ومحنت کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی۔ بلکہ منفرد مسلکی امتیازی مسائل کی اہمیت، سنت رسول سے اور اپنی فقہی کتب کی اہمیت کتب حدیث سے بھی برتر ہو جاتی ہے۔

☆......یہ بھی ایک عام خیال ہے کہ کوئی اگر مروجہ مسلکی فقہ پڑھ لے تو اسے فقہ آ جاتی ہے۔ وہ نہ صرف فقیہ ہوتا ہے بلکہ فتاوے لکھنے کا بھی اہل ہو جاتا ہے۔ مگر کیا فتویٰ لکھنا اور فقاہت کے منصب عالی پر فائز ہونا اتنا آسان ہے؟ ہمارے خیال میں یہ فقہ کی توہین ہے۔ اگر فقیہ بننا اتنا آسان ہوتا تو ہمارے ائمہ اسلاف اس دشت میں صحرا نوردی نہ کرتے اور علم وتجربہ اور عمر رسیدگی کے باجود افتاء میں بھی انتہائی محتاط نہ رہتے۔ فقاہت تو ایسا ملکہ ہے جو طویل مگر مسلسل گہرے مطالعے کا متقاضی ہے اور تمام ائمہ فقہاء کے تجربہ وعلم سے مستفاد فہم کا نام ہے جو محدود علم اور محدود تجربہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ مروجہ فقہ ایک تو محدود علم کا نام ہے اور دیگر فقہاء کرام کی فقاہت وبصیرت سے لاعلمی کا بھی۔ اس لئے اس فقہ میں زیادہ سے زیادہ مسلکی نمائندگی تو ہو سکتی ہے مگر اسلامی فقہ کی نہیں۔ کیونکہ اسلامی فقہ میں وسعت ہے جہاں آپ کو نہ صرف چاروں فقہاء کرام کی فقاہت نظر آئے گی بلکہ آج تک فقاہت کے جتنے بھی مثبت مظاہر دیکھنے یا سننے میں آئے ہیں وہ بھی اس میں ملیں گے۔

☆......اسی طرح یہ خیال بھی درست نہیں کہ اگر کوئی حدیث پڑھنا شروع کر دے تو فقاہت اس سے رخصت ہو جائے گی۔ کیونکہ حدیث رسول، فقاہت کی پہلی اینٹ ہے۔ صحیح کی کتب ہوں یا کتب سنن وموطا یہ سب فقہ وحدیث کے مجموعے کا نام ہے اور اسی فقاہت کے مظاہر ہیں جو ان کے مؤلفین نے ابواب لکھ کر پیش کئے ہیں۔ فقہاء، محدثین

کی وہ جماعت جو فقہ اور حدیث کی ماہر تھی انہیں امام وفقیہ دونوں کا خطاب دیا گیا اور بعض فقہاء ومحدثین صرف ایک خصوصیت رکھتے تھے تو انہیں ان کے اپنے اپنے میدان میں مہارت کی بناء پر امام کے لقب سے ملقب کیا گیا۔ بعض محدثین صرف احادیث کو جمع کرنے والے تھے جنہیں مُسند کا لقب دیا گیا۔

☆......قرآن وسنت میں مکمل مہارت کے بغیر اجتہاد یا تفقہ ممکن نہیں۔ اسی کا تقاضا ہے کہ فقیہ کے اجتہادات یا فقہی مسائل کو اس علمی مہارت کی روشنی میں پرکھا جائے جس طرح دوسرے علوم کے ماہرین کو پرکھا جاتا ہے۔ علماء حدیث نے بعض کتب فقہ کا مطالعہ کیا تو وہ اپنے محسوسات قلم بند کئے بغیر نہ رہ سکے: ملا علی القاریؒ لکھتے ہیں:

لَا عِبْرَةَ بِنَقْلِ النِّهَايَةِ وَلَا بِبَقِيَّةِ شُرَّاحِ الْهِدَايَةِ ، فَإِنَّهُم لَيْسُوا مِنَ الْمُحَدِّثِينَ، وَلَا أَسْنَدُوا الْحَدِيثَ إِلَى أَحَدٍ مِنَ الْمُخَرِّجِينَ۔ (الأسرار المرفوعة: ۳۵۶ بیروت) نہایۃ شرح ہدایۃ اور دیگر شارحین ہدایہ کی نقل کردہ روایات حدیث کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ ایک تو وہ محدث نہیں دوسرے وہ روایات کا (source) ماخذ بھی بیان نہیں کرتے کہ کس محدث نے اس روایت کی تخریج کی ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ مصنف ہدایہ کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں:

اگر حدیثے آوردہ نزد محدثین خالی از ضعفے نہ، غالبا اشتغال وقت آں استاذ در علم حدیث کم تر بودہ است۔ (شرح سفر السعادۃ ص ۲۳، طبع لکھنو) یعنی صاحب ہدایہ ایسی احادیث نقل کرتے ہیں جو محدثین کے نزدیک خالی از ضعف نہیں غالبا انہیں علم حدیث سے کم دلچسپی تھی۔

مولانا عبدالحی لکھنویؒ فرماتے ہیں:

إِنَّ الْكُتُبَ الْفِقْهِيَّةَ وَإِنْ كَانَتْ مُعْتَبَرَةً فِي نَفْسِهَا بِحَسْبِ الْمَسَائِلِ الْفَرْعِيَّةِ، وَكَانَ مُصَنِّفُوهَا أَيْضًا مِنَ الْمُعْتَبَرِينَ وَالْفُقَهَاءِ الْكَامِلِينَ لٰكِنْ لَا يُعْتَمَدُ عَلَى الأحاديثِ الْمَنقولَةِ فِيهَا اعْتِمَادًا كُلِّيًّا، وَلَا يُجْزَمُ بِوُرُودِهَا وَثُبُوتِهَا قَطْعًا بِمُجَرَّدِ وُقُوعِهَا فِيهَا، فَكَمْ مِنْ أحاديث ذُكِرَتْ فِي الْكُتُبِ الْمُعْتَبَرَةِ وَهِيَ مَوضُوعَةٌ مُخْتَلِقَةٌ۔۔الخ۔ مقدمۃ عمدۃ الرعایۃ ص ۱۳ تحت الدراسۃ الرابعۃ۔۔۔وَمِنَ الْفُقَهَاءِ مَنْ لَيْسَ لَهُ حَظٌّ إِلَّا ضَبْطُ الْمَسَائِلِ الْفِقْهِيَّةِ مِنْ دُونِ الْمَهَارَةِ فِي الرِّوَايَاتِ الْحَدِيثِيَّةِ۔ کتب فقہ اگر چہ فی نفسہ فروعی مسائل میں قابل اعتبار ہیں اور ان کے مصنفین بھی بلاشبہ معتبر اور اجلہ فقہاء میں سے ہیں مگر ان کی کتب میں منقول احادیث پر کلی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی ان کتابوں میں کسی حدیث کا وجود اس کے ورود وثبوت کے لئے کافی ہے کیوں کہ بے شمار ایسی احادیث ہیں جو فقہ

کی معتبر کتب میں درج ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ موضوع اور گھڑی ہوئی ہیں۔ مولانا لکھنویؒ کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں: یعنی فقہاء کرام فقہی مسائل کے ضبط وتحریر سے تو بہرہ ور ہیں لیکن روایات حدیث میں بعض کو کوئی مہارت حاصل نہیں ہے۔

یعنی فقہی مسائل کو دیگر کتب یا فقہاء سے نقل کرنے میں تو ماہر ہیں مگر احادیث جو بطور دلیل بیان کرتے ہیں ان کی صحت وضعف سے لاعلم۔ مزید امام بدر الدین العینی نے البِنایَة میں اور عبدالقادر قرشی نے اپنی شرح العنِایَة فِي مَعْرِفَةِ أحادیثِ الْهِدَایَةِ میں اور امام زیلعی نے نَصْبُ الرَّایَةِ میں اور امام ابن حجر نے الدِّرَایَة میں ان کا پایہ بتا دیا ہے کہ کونسی قابل استدلال ہیں اور کونسی نا قابل استدلال۔

سوال یہ ہے کہ جب فقہی مسائل ہی ضعیف وموضوع احادیث سے بیان کئے اور لکھے جائیں تو ان کا وزن کیا ہوگا؟ کیا انہیں فقہ یا فقہی مسائل کہنا درست ہوگا؟ فقہ کے بارے میں اس قسم کے ریمارکس کوئی نئی بات نہیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ جس فقیہ نے حفظ مسائل ومتون یا ان کی شروح پر اکتفاء ہی کافی سمجھا ہو یا اپنے مسلک کے مسائل اور علم الخلاف میں مہارت پیدا کرنا ہی اہم سمجھا ہو تو وہ فقیہ تو ہوگا مگر اس فرق کے ساتھ کہ وہ اپنے مسلک کا فقیہ ٹھہرے گا۔ جب کہ فقاہت کی منصبی شرائط کچھ اور ہیں جو اوپر کے اقتباسات میں علماء نے ضمناً بیان کر دی ہیں۔ شخصی استنباطات واجتہادات اگر موافق حدیث ہیں تو قابل قبول ہو سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ اسی طرح نص اور اس کے فہم صحیح میں بھی ملاوٹ فقہ نہیں۔ انہیں رد تو کیا جا سکتا ہے مگر صحیح حدیث کو نہیں۔ کیونکہ وہ فقہ کی روح ہے۔

☆☆☆☆☆

قبولیت کی چند شرائط

یہ وہ شرائط ہیں جن سے نہ صرف فقہ اسلامی کی صحیح پہچان ہوتی ہے بلکہ اس کی ثقاہت ومتانت اور شرع سے ہٹے ہوئے مسائل کا بھی ادراک ہوتا ہے۔ فقہ چونکہ ایک فرعی مسئلے کو دلیل سے بیان کرنے کا نام ہے اس لئے علمی ثقاہت ہی اجتہادی کوشش کی بنیاد ہوگی۔ اور اسی کو اولین حیثیت حاصل ہوگی۔ اس لئے وہ اجتہادات جو دلائل سے مزین نہیں ان کی عدم قبولیت پر ہی اجماع ہے۔ فقہاء کرام کے اجتہادات میں دلائل دیکھنا اور تلاش کرنا ان کے فقہی مرتبے اور علمی شان کو دوبالا کر دے گا۔ اور صحیح مدلل فقہی مسائل امت میں خیر کا باعث بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بالکل درست ہے:

﴿لا يأتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه' تنزيل من حكيم حميد﴾ (السجدۃ ۴۲)
اس پر جھوٹ کا حملہ نہ آگے سے ہو سکتا ہے اور نہ پیچھے سے' یہ دانا و خوبیوں والے اللہ کی نازل کردہ ہے۔
آپ ﷺ کا بھی ارشاد ہے:

قَدْ تَرَكْتُكُمْ عَلَى الْبَيْضَاءِ، لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا، لَا يَزِيغُ عَنْهَا بَعْدِيْ إِلَّا هَالِكٌ ۔ میں تمہیں ایک واضح اور روشن دین دے کر جا رہا ہوں جس کی رات بھی اس کے دن کی مانند ہے اس سے پھرنے والا ہی میرے بعد ہلاک ہو گا۔ (کتاب السنۃ لابن ابی عاصم: ۳۳)

اس لئے معتدل رویہ یہی ہونا چاہئے کہ جن مسائل واستنباطات پر علماء وفقہاء کی کثرت نے دلائل سے نکیر فرمائی ہے انہیں ترک کر دیا جائے اور جو فقہی مسئلہ دلائل کی بنیاد پر بیان فرمایا ہے اسے قبول کر کے اختلاف کو ختم کر دیا جائے۔ یہ وہ ضابطے ہیں جو قرآن نے ہمیں عطا کئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فإن تنازعتم في شيء فردوه إلى الله والرسول إن كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر ذلك خير وأحسن تاويلا﴾۔ پھر اگر تم کسی مسئلہ میں اختلاف کرنے لگو تو اگر تم اللہ تعالیٰ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا لے جاؤ۔ ایسا کرنا ہی خیر ہے اور انجام کے لحاظ سے بہتر ہے۔

۱۔ **اطاعت واتباع اور ترک تقلید:** قرآن مجید نے اپنی وضاحت، اللہ کی عبادت، احکام شریعت پر عمل اور اس کے صحیح فہم کے لئے رسول اکرم ﷺ کی اطاعت واتباع کرنے کا مطالبہ تقریباً چالیس سے زائد مقامات پر کیا ہے۔ اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ وہ احکام وعقائد جو جناب رسالت مآب ﷺ ایک مسلمان کو ارشاد فرمائیں تو مسلمان تسلیم ورضا کا پیکر بن کر نہ صرف دل وجان سے انہیں مانے بلکہ ان پر عمل بھی کرے۔ جب کہ اتباع کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے احکامات کو قبول کرنے کے علاوہ جو آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے نمایاں خدوخال تھے انہیں بھی حرز جان بنائے۔ تاکہ مسلمان رنگ ونسل، علاقہ وعادات کی تمیز کے بغیر ایک ہی کلچر اور تہذیب میں رنگے جائیں اور اسی کے خوگر رہیں۔ اطاعت کا مطالبہ اس لئے بھی ہے کہ آپ ﷺ کی رسالت دراصل دینی سیادت کا نام ہے اس کی راہنمائی میں آپ ﷺ کا کوئی شریک وسہیم نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے علاوہ ہم کسی اور کی عصمت کا اعتقاد بھی نہیں رکھ سکتے۔

؎ اطاعت واتباع کے یہ دونوں لفظ یا تو اللہ کے لئے مستعمل ہوتے ہیں یا پھر ہادی برحق رسول اکرم ﷺ کے لئے۔

ان الفاظ میں پیروی۔۔۔ایمان، محبت اور یقین کامل سے کرائی گئی ہے۔ جس میں جبر کا مفہوم نہیں۔ اطاعت رسول کا آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ اپنے تمام تر میلانات کو آدمی ذہن سے نکال کر اگر سیرت رسول اور احادیث رسول کا مطالعہ کرے تو خود بخود یہ جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ فقہی اختلاف کی صورت میں مسلمان صحیح حدیث کو ہی بہر حال ترجیح دیتا ہے۔ اور یہی قرآن کی تعلیم ہے۔ لہٰذا مقلد یا غیر مقلد یا تقلید جیسے الفاظ کی بجائے ایک بندہ مومن اپنے لئے لفظ اطاعت یا اتباع کے استعمال کو معمول بنائے۔ کیونکہ اتباع میں بات دلیل سے ہوتی ہے اور تقلید میں بغیر دلیل کے۔

۲۔ **صحیح حدیث: ائمہ اربعہ کا رجحان:** اسلامی فقہ کا خوگر بننے کے لئے شرعی تقاضا یہ بھی ہے کہ ایک مسلمان کو جب حدیث رسول ﷺ مل جائے یا وہ اس کے سامنے آجائے تو پھر فقہی مسئلہ حدیث رسول سے لے اور ہر قسم کے میلانات وگفتگو ترک کردے۔ حدیث کا تعلق کسی مسلک سے نہیں بلکہ یہ تو سب مسالک کی مشترکہ دولت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر مسلک نے اپنے ذوق اور فہم کی بنیاد پر چند احادیث کا انتخاب کرکے اپنی راہ متعین کی ہے۔ اس لئے ہماری رائے میں چند نہیں بلکہ تمام احادیث سے مستفید ہونا ضروری ہے تاکہ مسالک ومذاہب کا اختلاف اپنی اپنی خواہش کے مطابق نہ رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر فقہاء کرام کے فقہی مسائل اور اجتہادات واستنباطات ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر ہی پرکھ لئے جائیں تب بھی ایک اصولی بات ضرور واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ یہ مسئلہ ان ائمہ کرام کے ہاں بھی اجماعی ہے۔ کہ اگر صحیح حدیث مل جائے تو وہ خود کیا بلکہ تمام صحابہ کرام کے لئے لازمی ہوگا کہ وہ صرف اسے ہی قابل عمل سمجھیں اور اپنے اپنے اجتہادات کی طرف مت دیکھیں۔

امام ابوحنیفہؒ کا نقطہ نظر: امام محترم فرماتے ہیں:

حَرَامٌ عَلَى مَنْ لَمْ يَعْرِفْ دَلِيْلِيْ أَنْ يُفْتِيَ بِكَلَامِيْ۔ (میزان شعرانی: ۳۸) جسے میرے اجتہاد واستنباط کی دلیل (قرآن وحدیث سے) معلوم نہ ہو اس کے لئے حرام ہے کہ میرے کلام سے فتویٰ دے۔

درمختار میں ہے:

إِذَا صَحَّ الْحَدِيثُ فَهُوَ مَذْهَبِي إِنْ تَوَجَّهَ لَكُمْ دَلِيلٌ فَقُولُوا بِهِ۔ (ج ۱ ص ۵۰) میرے قول یا اجتہاد کے مقابلے میں جب کوئی صحیح حدیث آجائے تو میرا مذہب بھی وہی ہوگا۔ اگر تمہیں کوئی دلیل قرآن وحدیث سے مل جائے تو اسی پر عمل کرو اور اسی کے مطابق فتویٰ دیا کرو۔

امام مالکؒ کا نقطہ نظر : اپنے بارے میں ان کا یہ قول بہت مشہور ہے۔

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ أُخْطِئُ وَأُصِيْبُ فَانْظُرُوْا فِيْ رَأْيِيْ فَكُلُّ مَا وَافَقَ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ فَخُذُوْهُ وَكُلُّ مَا لَمْ يُوَافِقْ فَاتْرُكُوْهُ۔ لوگو! میں ایک انسان ہوں کبھی میری بات ٹھیک ہوتی ہے اور کبھی غلط۔ تم میری اس بات کو لے لو جو کتاب وسنت کے مطابق ہو اور جو اس کے خلاف ہو اسے چھوڑ دو۔ ایقاظ ہمم: ۱۰۲

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نقل فرماتے ہیں:

مَا مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَمَأْخُوذٌ مِنْ كَلَامِهِ وَمَرْدُودٌ عَلَيهِ إِلَّا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ۔(الانصاف:۱۳ عقد الجید:۸۰) دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں کہ اس کی تمام باتیں قبول کی جائیں سوائے جناب رسالت مآب ﷺ کے۔

امام شافعیؒ کا نقطہ نظر: صحیح حدیث کے بارے میں امام شافعیؒ کا قول یہ ہے:

إِذَا صَحَّ الْحَدِيثُ فَهُوَمَذْهَبِي، وَإِذَا رَأَيْتُمْ كَلَامِيْ يُخَالِفُ الْحَدِيثَ فَاعْمَلُوا بِالْحَدِيثِ وَاضْرِبُوا كَلَامِيْ الْحَائِطَ۔ (عقد الجید:۸۱) صحیح حدیث ہی میرا مذہب ہے۔ جب تم میرے اجتہاد واستنباط کو حدیث کے خلاف پاؤ تو حدیث پر عمل کرو اور میرے قول کو دیوار پر دے مارو۔

امام احمدؒ کا نقطہ نظر: امام اہل السنۃ ہیں مگر پھر بھی فرماتے ہیں:

لَيْسَ لِأَحَدٍ مَعَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ كَلَامٌ۔ (عقد الجید:۸۱) اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں کسی کا کلام کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

ان کا یہ ارشاد بھی ہے:

لَا تُقَلِّدُونِيْ وَلَا تُقَلِّدَنَّ مَالِكًا وَلَا الأَوْزَاعِيَّ وَلَا الثَّوْرِيَّ، وَخُذُوا الأَحْكَامَ مِنْ حَيْثُ أَخَذُوا مِنَ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ۔ (عقد الجید:۸۱) خبردار! کبھی میری تقلید نہ کرنا اور نہ امام مالکؒ کی، نہ اوزاعی اور نہ ثوری کی بلکہ جہاں سے یہ بزرگ احکام لیا کرتے تھے وہیں سے تم بھی لیا کرو۔ یعنی قرآن وحدیث سے۔

یہ بیانات ائمہ کرام کی طرف سے اعلان عام ہیں کہ لوگوں کی طرف سے عائد کردہ یہ تقلیدی روش اور اس کی دعوت ہمارا نہیں اور نہ ہی ہم اس کے داعی ہیں۔ ان کے نزدیک حدیث صحیح ہی ایک سپریم لاء کی حیثیت رکھتی ہے جس نے فقہی مسائل کو نہ صرف حل کیا ہے بلکہ ان کے حل کا راستہ بھی دکھا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب علماء وفقہاء کا اس کی

اس حیثیت پر اجماع واتفاق بھی ہے۔

۳۔ **غیر واقع مسائل سے اجتناب:** انسانی مسائل کی چونکہ حدود متعین نہیں ہیں بلکہ وقتاً فوقتاً یہ پیش آتے رہتے ہیں مثلاً کلوننگ، تبدیلی اعضاء وغیرہ۔ اس لئے ان کے حل کے لئے شریعت کی طرف ہی رجوع کرنا پڑتا ہے۔ البتہ یہ سوال برمحل ہے کہ کیا مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے مسائل کا ابھی سے ادراک کرکے، ان کا فقہی حل تلاش کرلیا جائے۔ کیا ایسا کرنا صحیح ہوگا؟ اس بارے میں عموماً دو آراء سامنے آتی ہیں:

أ۔ پہلی رائے کے مطابق اگر ان مسائل کا ادراک فقہاء وعلماء کرلیں تو انہیں زیر بحث لانے اور ان کا حل پیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لئے کہ علم روز بروز زوال پذیر ہے۔ علماء وفقہاء رخصت ہورہے ہیں ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں ایسے علماء پیدا نہ ہوں جو اس قابل ہوں کہ فقہی استنباط کرسکیں اس لئے موجود فقہاء اگر لَو کَانَ کی بنیاد پر مفروضہ مسائل کا حل پیش کردیں تو یہ امت پر بڑا احسان ہوگا اور ان کے آسمان علم سے دنیا مستفید ہوگی۔

ب۔ دوسری رائے یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں وہ مسئلہ پیدا نہ ہوا اس وقت تک اس تکلف کی ضرورت ہی نہیں کہ کوئی رائے دی جائے اور فرضی مسائل بنائے جائیں۔ وہ یہ کہتے ہیں: کہ عِلْمُ مَا لَمْ یَقَعْ وَالْجَھْلُ عَمَّا وَقَعَ **جو واقع نہیں ہوا اس کا جاننا اور جو واقع ہو چکا ہے** اس سے لاعلم رہنا **فقہ نہیں۔** ہاں **جب وقوع پذیر ہوں گے تو ان شاء اللہ امت ان** علماء وفقہاء سے بانجھ نہیں ہوگی جو اپنے علم کی حد تک ان کا اسلامی حل پیش **نہ کرسکے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو باقی رکھنا ہے** اور اس کے خادمین کو بھی۔ ماضی میں جو مسائل بھی ابھرے **فقہ اسلامی نے اپنی** تازگی اور شگفتگی کے سبب **ان کا جواب دیا۔** مگر جب سے یہ تکلف سامنے آیا کہ **غیر وقوع مسائل بھی موضوع بحث** بنے ان سے کتب کی ضخامت تو بڑھ گئی مگر ان سے مستفید ہونا تو کجا ایک عام مسلمان بھی انہیں جان نہ سکا اس لئے کہ مفروضہ دور میں ان جدید مسائل کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بیشتر علماء وفقہاء محض عقلی اور مفروضہ مسائل کے بیان کرنے کو...... فقہی حدود سے تجاوز سمجھتے ہیں۔

فقہ اسلامی پرکھنے کے معیارات:

......عام وخاص جب مطالعہ کتب فقہ وحدیث کرتے ہیں تو انہیں دونوں لٹریچر میں اختلاف نیز ترجیح کے انبار نظر آتے ہیں اور اسی بنیاد پر اس کا ذہن یا تو فقہی ہوکر حدیث سے متنفر ہوجاتا ہے یا حدیثی بن کر فقہ کو مخالف حدیث سمجھ بیٹھتا ہے۔ جبکہ یہ سب علمی باتیں ہیں جو محض ایک دو کتب کو پڑھ کر یا چند ایک لیکچرز سن کر طالب علم کو معتدل نہیں

بنا تیں۔ بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ کتب کا بتدریج اور گہرائی سے مطالعہ کیا جائے۔

......کتب حدیث ہوں یا مصطلحات دونوں بہر حال فقہ واصول فقہ سے قبل کے علوم ہیں۔ کیونکہ حدیث تو زمانہ رسول سے بہ سند چلی آ رہی ہے مگر فقہ کے احکام خمسہ اوران کی اصطلاحات سے صحابہ رسول واقف نہ تھے۔ یہی حال مصطلحات کا ہے جو روایت حدیث کے ساتھ ہی متعارف ہوئی ہیں جیسا کہ اصول فقہ، تدوین فقہ کے ساتھ۔

......عصر اول میں محدثین متن حدیث سے استنباط کرتے اور مسئلہ کے تمام ادلہ حتی کہ اقوال رجال تک دھیان نہ دیتے مگر مفتی یا فقیہ مسئلہ کو سمجھ کر دوسری اشیاء بھی مستحضر کر لیتے۔ نتیجتاً فقیہ ومحدث کے کلام میں اختلاف ہوتا۔

......کتب حدیث میں عصری مسائل کا جواب صرف متن حدیث سے دیا جاتا اور بلا دلیل مفروضہ سے حتی الامکان اجتناب کیا جاتا۔ مگر فقہی کتب میں گو مسائل بکثرت ہوتے ہیں مگر زیادہ تر اقوال اختلافی یا بلا دلیل مفروضوں پر مبنی ہوتے ہیں۔

......کتب حدیث میں نصوص سے استدلال زیادہ ہے مگر کتب فقہ میں قیاس سے زیادہ ہے۔

......ایک بڑی کمی جو کتب فقہ میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ فقہی مذہب کی ہر کتاب خواہ اس میں طویل اختلاف کو بیان کیا گیا ہو یا عالی ونازل کو۔ ان میں حدیث پر نظر اپنے مذہب کے مطابق ہی کی جاتی ہے۔ ایک وسعت پسند طالب علم کے لئے کتب فقہ میں یہ عام کمی ہے جسے پھر وہ احادیث میں غور کر کے مکمل کرتا ہے۔

......اصول استنباط کیا ہیں؟ اصول فقہ ہی ہیں اس لئے فقیہ اگرچہ متون کو کھنگالتا ہے اور استنباط وترجیح بھی ان سے کرتا ہے مگر تقلید سے وہ بچ نہیں پاتا اور مسائل کو اپنے مذہب کے مطابق ترجیح دیتا ہے۔

......بعض فقہی کتب میں تفرقہ اور اختلاف کا ایسا انداز اپنایا گیا ہے جو اتفاق اور باہمی مودت کی بجائے بغض وعداوت کو انگیخت دیتا ہے۔ نتیجتاً طعن، لعن، اور ہمز ولمز کے ساتھ لڑائی اور مقاطعہ تک شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرے کے پیچھے نماز چھوڑ دی جاتی ہے۔ یہ سب ایسے امور ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے۔

......اس لئے فقہی مسائل کی تشہیر کے وقت ہمارے ہاں مختلف گروہی انداز سامنے آتے ہیں۔ مسئلہ پوچھنے پر یا تو صراحتہ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہماری فقہ میں اس کا حل یہ ہے۔ یا بعض دفعہ سواد اعظم ہونے کی دلیل دی جاتی ہے کہ چونکہ اکثریت ہماری ہے اس لئے یہ مسئلہ اس فقہ کے مطابق یوں ہے۔ مگر حدیث رسول جو وضاحت سے مسئلے کو پیش کر رہی ہوتی ہے اس سے صرف نظر عام دیکھنے یا سننے میں آتا ہے۔ یہ مذہبی اور گروہی تعلیمی انداز تو اسلاف کے نہ

تھے اور نہ ہی انہیں اقلیت و اکثریت کا خبط تھا۔ تلاش حق کے لئے یہ ذریعہ بھی انتہائی کمزور ہے اس لئے کہ ہر مسلک مختلف مسالک ونظریات کا پرچارک ہے اور ہر ایک تقسیم در تقسیم ہو چکا ہے۔ دینی اعتبار سے ایک مسلمان معیار حق اکثریت کو نہیں بلکہ مدلل بات کو بناتا ہے جو قرآن وسنت رسول میں کہہ دی گئی ہے اس لئے ان دونوں مآخذ سے مستنبط مسائل ہی کو فقہ اسلامی کہا جا سکتا ہے نہ کہ ان بے جا دعووں کو۔

ایسی فقہ اسلامی ہمیں درج ذیل طریقوں سے معلوم ہو سکتی ہے۔

فقہی کتب اور ان کا انتخاب: فقہاء نے کتب فقہ میں وارد مسائل کو ثقاہت کے اعتبار سے تقسیم کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ سب مسائل کتب حدیث سے ہی ماخوذ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان مسائل کی حقیقت جاننے اور صحیح وغلط میں تمیز کرنے کے لئے کسی بھی مسئلہ کا ریفرنس ضرور دیکھنا ہوگا۔ تاکہ قاری کو مسئلے کی صحت اور ضعف کا اندازہ ہو سکے۔ ریفرنس دیکھتے وقت درج ذیل کتب کی catagories کو ہمیشہ یاد رکھئے اور انہی کا ہی مطالعہ کیجئے یہ آپ کو رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ڈائریکٹ جوڑ دیں گی۔ انہی کی روشنی میں فقہی مسئلہ کو فہرست کتاب میں تلاش کیجئے اور بآسانی پرکھئے۔ واضح رہے یہ تقسیم کتب ہر مکتب فکر کے فقہاء وعلماء کے ہاں مسلمہ ہے۔

پہلا درجہ: کتب متفق علیہ اور موطا کا ہے۔ یعنی صحیح بخاری وصحیح مسلم کی وہ احادیث جنہیں دونوں مؤلفین نے اپنی کتب میں روایت کیا ہے۔ اس لئے کہ علماء امت کا اتفاق ہے کہ یہ دونوں قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتب ہیں۔ موطأ امام مالک بھی اسی درجہ کی کتاب ہے۔ اس میں مسند مرفوع احادیث کے علاوہ اقوال وفتاویٰ صحابہ وتابعین بھی ہیں۔ مگر ہمارے لئے صرف متصل مسند مرفوع احادیث ہی اولین حیثیت رکھتی ہیں۔

دوسرا درجہ: اس درجہ میں سنن ابی داؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی اور ابن ماجہ کی کتب شامل ہیں جنہیں سنن اربعہ کہا جاتا ہے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مرتب فقہی مسائل ہیں۔ جہاں ان مؤلفین نے حدیث کے ضعیف ہونے کی نشاندہی کی ہے اسے ہم ظاہر ہے ترک کر دیں گے۔ اور جو مسئلہ دوسرے درجہ کی کتب میں بالوضاحت نہیں تو ان کتب سے ہم مدد لیں گے۔ مسند احمد کو بھی اس درجہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ چند وہ احادیث قابل اعتناء نہ سمجھی جائیں جو امام احمد کے بیٹے عبد اللہ اور ان کے شاگرد ابوبکر قطیعی نے اضافہ کی ہیں۔

تیسرا درجہ: یہ کتب مصنف ابن أبی شیبہ، مصنف عبد الرزاق، امام طحاوی کی کتب ودیگر غیر معروف کتب ہیں جن میں ہر قسم کی موضوع، ضعیف، مرسل روایات بکثرت ہیں۔ مگر صحیح بہت کم۔

چوتھا درجہ: ان کتب کا ہے جو مختلف مسالک کے فقہاء کرام نے لکھی ہیں۔ ان میں چونکہ مسلکی مسائل کی تفصیل اوران کی دیگر مسالک کے مسائل ودلائل پر ترجیح قائم کی جاتی ہے نیز استاد وشاگرد کا اختلاف بھی ان میں نمایاں ہوتا ہے اس لئے صحیح اور ثابت دلیل کی بنیاد پر فقہی مسئلے کو قبول کیا جائے گا خواہ وہ کسی بھی امام کا ہو۔

انتخاب: بے شمار فقہی کتب مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔ ان کے انتخاب میں ان دو امور کا ضرور خیال رکھیئے۔

۱۔ ان کتب کا انتخاب مت کیجئے۔ جو محض مفروضہ مسائل، غیر مستند اقوال اور غیر ضروری باتوں پر مبنی ہوں۔ اس لئے کہ ایسی کتب کے پڑھنے سے دین اور رسول کی محبت میں کمی آجاتی ہے۔ اور آدمی وسوسوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ معمولی اور غیر اہم باتیں پھر اہم ہو جاتی ہیں۔ اور اہم مسائل کی کوئی قدر نہیں رہتی۔ بلکہ ایسی کتب کا انتخاب کیجئے جن میں مسائل کو آیات قرآنیہ واحادیث رسول ﷺ یا اقوال صحابہ سے مدلل کیا گیا ہو۔

۲۔ اگر فقہی مسئلہ حدیث میں واضح نہ ہو تو پھر ایسی فقہی کتب کا انتخاب کیجئے جن میں صرف ایک ہی مذہب کی باتیں نہ ہوں۔ بلکہ چاروں مذاہب ودیگر علماء وفقہاء کی علمی کاوشوں اور دلائل کا ذکر بھی ہو۔ تاکہ سب علماء کے علمی و فکری نکتہ نظر واستدلال سے مستفید ہوا جا سکے۔ کیونکہ سبھی علماء وفقہاء برحق تھے۔ ایک کو سختی سے اختیار نہ کیجئے ورنہ ہمارے اس طرز عمل کا کہیں یہ مطلب نہ لے لیا جائے کہ دیگر علماء وفقہاء حق پر نہیں تھے یا وہ علم وفقہ میں دوسرے سے کہیں کم تر تھے۔ بلکہ سبھی کو یکساں مقام دے کر سبھی سے مستفید ہوا جائے۔

فقہی کتب: ہمارے ہاں موجود فقہ اسلامی پر مہیا مواد دو قسم کا ہے۔ ا۔ عمومی انداز۔ ۲۔ خاص مجتہدانہ انداز۔

عمومی انداز: اس لٹریچر میں فقہی مسائل کو عنوانات کی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ بھی دو قسم کے ہیں:

ا۔ **مسلکی:** جس سے مراد وہ کتب فقہ ہیں جن میں کسی ایک فقیہ کی فقہ سے مستفاد مسائل کو مربوط و مرتب شکل میں لکھا گیا۔ اور دوسرے فقہاء کرام کی فقہ کی طرف توجہ اس لئے نہیں دی گئی کہ ان کا مسلک یا فقہی نکتہ نظر مؤلف سے مختلف ہے۔ اس قسم کی فقہ تقلیدی اور جامد کہلاتی ہے جو محض متون وشروح اور فروع کے ظواہر پر قناعت کرنے کا نام ہے۔ ان عبارات کو صحیح یا غیر صحیح دیکھے بغیر من وعن قبول کر لیا گیا ہے اور مسائل لکھ دیے گئے ہیں۔ عام فہم ہے۔ عربی، اردو، انگلش میں بھی یہ دستیاب ہے۔ ان کتب میں مسلکی چھاپ ایسی نمایاں ہے۔ کہ آدمی ادھر سے ادھر نہیں ہو پاتا۔ ان کے مطالعہ کے دوران ایک قاری اصل مصادر (قدیم وجدید) سے بمشکل آگاہ ہو پاتا ہے۔ بہرحال ان

کے مطالعے سے دیگر فقہاء کرام کے علم و استدلال سے قاری محروم رہتا ہے۔

۲۔**غیر مسلکی**: اس قسم کے لٹریچر میں تقریباً بیشتر فقہاء کی فقہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔اور دیانت دارانہ طور پر سب فقہاء و مجتہدین کے طریق استدلال اور دلائل پر بحث کی گئی ہے۔ایسا مواد یقیناً اہل تحقیق کے لئے بہت ہی دلچسپ و مفید ہے۔کسی بھی اختلافی مسئلے کی حقیقت کو بآسانی جانا جاسکتا ہے۔اور عام افراد کو اس سے آگاہ بھی کیا جاسکتا ہے۔اور یوں اپنی دینی ذمہ داری کو ادا کرنے کا صحیح لطف آتا ہے۔قاری اس مرتب و مربوط فقہ سے جہاں مستفید ہوتا ہے وہاں وہ فقہاء کرام کی وسعت نظری، عدم تعصبی اور دلائل کو جان کر اپنے علم، عادات اور فکر میں ایک گونہ اضافہ کرتا ہے۔ایسے لٹریچر سے متأثر عوام اور خواص دونوں تعصبات و باہمی نفرت کو خیرباد کہنے کا ضرور سوچتے ہیں اور اس کا عزم بھی کرتے ہیں۔صحیح احادیث سے مستفاد فقہی مسائل پر مبنی لٹریچر بھی اسی میں داخل ہے۔جن میں فروعی واصولی مسائل کو احادیث سے مستنبط کیا گیا ہے۔ فقه السنه و دیگر کتب طہارت، نماز، روزہ، حج وغیرہ کے مسائل پر مبنی کتب بازار میں اب دستیاب ہیں۔جن سے فرقہ واریت کی بو نہیں آتی۔اس لٹریچر کی اساس قدیم مآخذ پر رکھی گئی ہے۔

مجتہدانہ انداز: جدید صنعتی اور فکری انقلاب نے امت مسلمہ کے سامنے جن مسائل کا انبار کھڑا کردیا ہے۔ ان میں علماء و فقہاء کرام کو تقلیدی ذہن سے نکل کر اجتہادی ذہن کی طرف آنا ہوگا۔تقلیدی انسان کا ذہنی سفر ایک حد تک پہنچ کر رک جاتا ہے اور اجتہادی انسان کا ذہنی سفر برابر آگے جاری رہتا ہے۔وہ موت سے پہلے کبھی ختم نہیں ہوتا۔اس لئے یہ بھی لمحہ فکریہ ہے کہ بے شمار چیلنجز کے ہوتے ہوئے وہ ان جدید مسائل کا شرعی حل کیونکر تلاش کریں۔گویہ ایک انتھک اور دشوار گذار کام ہے مگر علماء کے کرنے کا کام ہے یہی۔نہ کہ نماز جنازہ یا نکاح پڑھانے یا وضوء کے معمولی مسائل کو دقیق بنا کر پیش کرنے کا۔اس کام میں علماء کو قرآن و حدیث اور اسلاف کی کاوشوں کو مدنظر رکھ کر اپنے علمی و ذہنی سفر کو مسلسل ترقی کی طرف لے جائیں۔یہی اسلاف کا احترام ہے اور امہ کی ترقی کا زینہ۔اسلاف سے فائدہ اٹھایئے اور آگے بڑھتے جایئے۔

قدیم زمانہ کے مسائل بھی اس دور میں اجتہادی تھے اور آج کے مسائل بھی اجتہادی نوعیت کے ہیں۔اس لئے جیسے ماضی میں فقہاء کرام کے درمیان فکر و نظر کا اختلاف ہوا آج بھی ان متعدد مسائل میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے۔فقہ کی ہر کتاب ماضی کا یہی نقشہ پیش کرتی ہے اور آج بھی اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب اس نوع کے

اختلافات سے خالی نہیں ہونگی۔ تاہم یہ مخلصانہ کوشش قابلِ تحسین ہوگی اور مسلمانوں کی مشکلات کے حل کیلئے ایک مثبت سمت اٹھنے والا قدم بھی۔ ایسا مجتہدانہ لٹریچر کسی خاص نوعیت کے مسائل پر مبنی ہوتا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً مسلمانوں میں متنوع ضروریات(Various Neccessities) کے تحت سامنے آیا ہے۔ یہ فقہی مواد ابھی ترقی پذیر ہے۔اور مزید اجتہادی کوشش کا مستحق بھی۔ بیشتر لٹریچر جن میں بطور خاص کلوننگ، بینکنگ، سود، طب، اقتصاد وغیرہ کے مسائل ہیں جو انفرادی رائے پر مبنی ہیں۔ جن میں استدلال(Arguments) کی ابھی مزید ضرورت ہے۔ ان علوم کے ماہرین ابھی دیگر امکانات کی وجہ سے اپنے اجتہادات سے مطمئن نہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ ایسے مسائل میں علماء کی مشترکہ کاوشوں کا مسلسل دخل ہو اور کوئی بھی رائے قائم کرنے میں غور وتامل اور وسیع الصدری(Wider &More Patient) کا عنصر غالب ہو۔ یہ فقہی مواد عام افراد کی ضرورت کا نہیں۔ خواص ہی اس میں رائے دیتے ہیں اور اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ نیز جدید چیلنجز اور مسائل کا بھی شرح صدر سے جواب دینے کی ضرورت ہے۔ مثلاً احترام انسانیت، جمہوریت، حالات کی رعایت، کیا ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں؟ میدان عمل کی تبدیلی اور مسلمان کی ذمہ داری، نفاذ احکام میں تدریج، فقہ کی از سر نو تدوین، جدید امکانات کا استعمال، تفسیر بالرائے، گلوبلائزیشن وغیرہ پر مزید بھی سوچا جا سکتا ہے۔

چند مفید فقہی کتب:

۱۔ **فقہ السنۃ** (اردو) مؤلف: عاصم الحداد، لاہور۔ **فقہ السنۃ** (عربی، انگلش) مؤلف: سید سابق ؒ

۳۔ عمدۃ الأحکام (اردو) مؤلف: عبدالغنی المقدسی (اردو شرح:: ضیاء الکلام از محمود احمد غضنفر)

۴۔ **بلوغ المرام** (اردو) مؤلف: ابن حجر عسقلانی (اردو ترجمہ محمد سلیمان کیلانی) (انگلش ترجمہ از دارالسلام۔ ریاض)

۵۔ **منہاج المسلم** کا اردو ترجمہ **اسلامی طرز زندگی** کے نام سے چھپ گیا ہے۔ انگلش میں بھی منہاج المسلم کے نام سے چھپا ہے۔ دور حاضر کی بہترین کتاب ہے۔ اس کے مؤلف عالم اسلام کی معروف شخصیت اور حرم نبوی کے مدرس جناب **ابوبکر الجزائری** ہیں۔

۶۔ **اسلامی تعلیم** (اردو) مؤلف: مولانا عبدالسلام بستوی۔ یہ ایک بہت ہی شاندار اور انتہائی مفید فقہی کتاب ہے۔ تمام کتب حدیث کا مواد اس میں موجود ہے۔ اور باب باندھ کر یعنی Headings دے کر اس مسئلے سے متعلق

تمام احادیث کا اردو ترجمہ کر کے جمع کر دیا گیا ہے۔ مثلاً اگر آپ عقیقہ کے بارے میں جاننا چاہیں تو صحیح احادیث پر مبنی تمام مرتب مسائل عقیقہ کے باب میں مل جائیں گے۔

۷۔ اسی طرح فقہ اسلامی کی آسان اور سادہ سی مطبوعات میں تفهيم السنة کا پورا سیٹ، جو اُردو، انگلش وغیرہ میں اب مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔ یہ وہ کتب ہیں جن کی ہر گھر کو ضرورت ہے۔ جہاں ایک چھوٹی سی فقہی لائبریری بھی بنائی جاسکتی ہے۔

فقہی مسائل کی جانچ

۱۔ کسی بھی فقہی مسئلے کے انتخاب میں حوالہ جات دیکھنا مت بھولئے۔ حوالہ اگر مندرجہ بالا کتب میں سے چوتھے درجے کی کتب کا ہو تو اسے اس صورت میں قبول کیجئے جبکہ پہلے تین درجوں کی کتب میں وہ مسئلہ نہ ہو۔ اسی طرح تیسرے درجے کی کتب کا حوالہ ہو تو اسے اس صورت میں قبول کیجئے جبکہ پہلے دو درجوں کی کتب میں وہ مسئلہ موجود نہ ہو۔ اسی طرح آگے بھی یہی صورت اختیار کرنا ہوگی۔ یہ وہ درجات ہیں جو محدثین وفقہاء نے طے کئے ہیں۔ اور ان درجات سے ملتے جلتے ہیں جو فقہاء کے مابین پائے جاتے ہیں کہ کسی فقہی مسئلے میں اختلاف کی صورت میں کس درجے کے فقیہ کی رائے کو ترجیح الینا ہوتا ہے۔

۲۔ طلاق کا مسئلہ ہو یا نکاح کا، نماز کا ہو یا وضو کا۔ جو مسائل صحیح احادیث میں واضح ہوں انہیں لیجئے اور اس کے مقابل میں قیاس، قول اور فتوی وغیرہ سے حتی الامکان اجتناب کیجئے۔ کیوں کہ صحیح حدیث ہی تمام فقہاء کرام کا چناؤ ہے۔ اور مسلک ہے۔

۳۔ بزرگوں کے تجربے، باتیں اور خواب وغیرہ کو فقہ کا درجہ نہ دیجئے۔ یہ نہ دین ہیں اور نہ ہی عمل صالح۔

صحیح فقہی مسائل جاننے کے لئے یہ ترتیب ملحوظ رہے تو مسئلہ کا حوالہ دیکھ کر بآسانی اس کی وقعت جانی جاسکتی ہے۔

نوٹ: براہ راست قرآن پاک سے صرف استنباط مسائل کا دعوی فقہاء نے کیا ہے اور نہ ہی کوئی کر سکتا ہے۔ فقہاء کرام حدیث سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ ایسے استنباطات کا معیار تو ایک طرف، کسی ضعیف حدیث سے بھی مستنبط مسئلے کو فقہی مسئلہ کہنا ایک منصف عالم کے لئے بہت دشوار ہوتا ہے۔

فقہ سے مستفید ہونے کا طریقہ

اسلامی فقہ کی واقفیت سے آپ بآسانی اپنے اعمال کو حلال وحرام، جائز وناجائز اور مسنون وغیر مسنون وغیرہ کا درجہ

دے سکتے ہیں۔فقہ دراصل کسی بھی مسئلے کی ایک مربوط ومرتب وضاحت کا نام ہے۔اس لئے ایک عام آدمی کو فقہ جب مربوط صورت میں ملتی ہے اور وہ اسے پڑھتا ہے۔تو فقہ کا سمجھنا اس کے لئے آسان تر ہوتا ہے۔

فقہ اسلامی بذات خود کوئی مستقل موضوع نہیں بلکہ قرآن وسنت ہی کا یہ فہم ہوتا ہے۔اور اس کے تمام موضوعات انہی دونوں سے ہی ماٰ خوذ ہوتے ہیں۔قرآن میں چونکہ فقہی مضامین خال خال مگر جا بجا بکھرے ہیں۔اس لئے اس سے بیک وقت کسی مسئلے سے تفصیلی طور پر آگاہ ہونا عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہاں قرآن مجید کی مطبوعہ موضوعاتی فہارس سے مستفید ہونا ممکن ہے۔مگر حدیث کی وہ کتب جو سنن کے نام سے معروف ہیں۔ ان میں دینی مسائل کو فقہی ترتیب دے دی گئی ہے۔اس لئے پہلا گر یہی ہے کہ ان سنن کی کتب کا مطالعہ کیجئے۔فقہاء حدیث کے استنباطات کو دیکھئے جو ابواب حدیث سے پہلے صاحب کتاب نے لکھے ہیں،اور اصول وقواعد فقہیہ جو زبان رسول سے ماخوذ ہیں نوٹ کیجئے۔اور اس اندازِ استدلال کے خوگر بنئے جو محدثین نے اپنائے ہیں۔ جہاں دلائل ہیں نصوص ہیں قیاسات نہیں ہیں۔صحیح بخاری بھی اس سلسلے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔

امام بخاری کے بارے میں یہ قول: فِقْهُ الْبُخَارِيِّ فِيْ تَرَاجِمِهِ بہت مشہور ہے۔یعنی امام بخاری کی فقیہانہ شان دیکھنی ہو تو ان کی کتاب کے ابواب chapters پر نگاہ ڈالئے۔ان کتب کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی مارکیٹ میں دستیاب ہے۔ ایسی کتب کا مطالعہ شاید ان کتب سے مفید ہو جو صرف اردو میں تو لکھی گئی ہوں مگر Original نہ ہوں اور شاذ ونادر ہی ان میں کسی مسئلے کی دلیل دی گئی ہو۔اگر دی بھی گئی ہے تو وہ بھی ایسی کتب سے جن کا محدثین کیا علماء فقہ کے ہاں بھی کوئی مقام نہیں۔ان میں زیادہ تر ضعیف وموضوع احادیث کا سہارا لیا جاتا ہے۔جن پر عمل کرنا تمام اہل علم کے ہاں ناجائز بلکہ بعض صورتوں میں حرام ہوتا ہے۔حوالہ کے سلسلے میں بھی انہیں کتب کو اپنا اولین ماٰخذ بنائیے۔

دوسرا آسان گر یہ ہے کہ اپنے آپ کو اقوال رجال سے یا ان کتب سے حتی الامکان دور رکھئے جن میں ائمہ مجتہدین کی طرف منسوب ایسے غیر ضروری عجیب وغریب مسائل بیان کئے گئے ہیں جو انہوں نے نہیں کہے۔آخر وہ کیسے کہہ سکتے ہیں جب کہ سنت رسول میں صراحۃً ان مسائل کے برعکس ایسی احادیث مذکور ہیں۔جن کا رنگ یا معنی ومفہوم ان سے بالکل مختلف ہے۔اور اگر بالفرض ان سے منسوب کچھ مسائل ہیں بھی تو وجہ صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ایسے مجتہدین وفقہاء کرام کو احادیث نہیں مل سکیں۔

فقہ اسلامی کے چند مطالبات:

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب شریعت ایک ہے اس کا سرچشمہ ایک ہے اللہ کی جانب سے اسے لوگوں تک پہنچانے والا بھی ایک ہے تو اس میں اختلاف کیوں کر رونما ہوا؟ یہ شریعت تو صرف اس لئے آئی ہے کہ لوگ اس پر عمل کریں اور اپنے تمام امور میں اس کے مطابق فیصلہ کریں تو پھر اختلاف کے کیا معنی؟ بسا اوقات یہ انداز تنقید کا بھی ہوتا ہے۔ بہرحال یہ وہ شریعت ہے جس کی شان میں اللہ تعالیٰ نے قرآن عزیز میں فرمایا:

﴿وإنه لكتاب عزيز، لا يأتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه تنزيل من حكيم حميد﴾۔ یہ تو ایک عالی رتبہ کتاب ہے اس پر جھوٹ کا حملہ نہ آگے سے ہوسکتا ہے اور نہ پیچھے سے۔ یہ دانا اور خوبیوں والے اللہ کی نازل کردہ ہے۔ (فصلت:۴۱،۴۲)

نیز فرمایا:

﴿إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحفظون.﴾ بے شک یہ کتاب ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔ (الحجر:۹)

شریعت کی اساسیات کو جاننے اور فقہ اسلامی کو سمجھنے، اس پر عمل کرنے کے لئے ضروری ہوگا کہ اس اعتراض سے قبل ہم ذیل میں دیئے گئے چند شرعی مطالبات کو سمجھیں:

فقہ سے استفادہ۔ آیات واحادیث میں جہاں فقہ کا لفظ آیا ہے ان سے وہی معنی ہی مراد لینا چاہئیں جو قرون اولی کی فقہ پر منطبق ہوسکے۔ اسلامی فقہ کی گہرائی اور گیرائی لامحدود ہے۔ مسلکی فقہ اپنے چند اصول یا فروع کے گرد گھومتی ہے جب کہ فقہ اسلامی میں ہر علاقے، قوم اور احوال وحوادث پر فرد واحد کی نہیں بلکہ بے شمار افراد کی متفقہ بصیرت وفہم کا عمل دخل ہوتا ہے۔

تعصب سے اجتناب: فقہ اسلامی ایک الٰہی نعمت ہے اللہ کی نعمت پانے میں ہمیں اللہ کی رضا کو ہی سامنے رکھنا چاہئے۔ اس کا حکم سر آنکھوں پر اور ہر قسم کی محبتیں رسول ﷺ کی محبت پر قربان۔ آپ ﷺ ہی کے لئے ناراضگی اور آپ ﷺ ہی کے لئے رضامندی یہی ہمارے ایمان کا حصہ ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ آخرت میں اسی کی قدر ہے۔ مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ دین کی اطاعت کے معاملے میں شخصیت پرستی جب سے در آئی ہے یعنی اللہ کے کسی بندے کی فکر کو عام کرنے کا نظریہ اور اسی میں ہی ہمہ وقت استغراق، اس نے ہمارے معاشرے میں کوئی بہتر نتائج

نہیں چھوڑے۔ بلکہ اس چیز نے تو قبولیت حق یا اس کے اعتراف کے لئے بسا اوقات آنکھوں پہ پردہ ڈال دیا ہے۔ اس نقطہ نظر کو درست قرار دینے کے لئے عموماً دو آراء پائی جاتی ہیں۔

ایک رائے تو یہ ہے کہ کسی ایک امام کو یا فقہ کو ضرور پکڑ کر چلنا چاہئے۔ اس لئے کہ خواہشات نفس کو روکنے کا یہی ہی ایک طریقہ ہے۔ پھر اس کے بارے میں غلو اختیار کر لیا جاتا ہے مثلاً یہی امام وفقیہ ہیں جن کی بات مانی جاسکتی ہے اس لئے کہ ان سے بڑھ کر کوئی عالم وفقیہ نہیں۔ عام آدمی جو دین کو صحیح شکل میں دیکھنا اور جاننا چاہتا ہے وہ اس بات پر پریشان ہے کہ کیا ایک کو پکڑنا واقعی ضروری ہے؟ کیا ہماری فقہی کتب میں ایسے مسائل کی کوئی شہادت نہیں کہ امام ابوحنیفہؒ ہوں یا امام شافعیؒ، ان سے ان کے شاگردوں نے تمام مسائل میں سو فیصد اتفاق کیا ہے؟ اگر اتفاق نہیں کیا تو کیا یہ جرم ہے؟ کیا ان مسالک میں ایک مسئلے سے دوسرے مسئلے کو نکالنے اور اس کی طرف جانے کی گنجائشیں، اصول اور قاعدے نہیں ہیں؟۔ شرعی حیلے آخر کیا ہیں؟ کیا جب سبھی فقہاء کرام دین کی خدمت کر گئے تو سبھی سے فائدہ اٹھانا ہمارے لئے بہتر ہوگا یا سب کو جھٹک کر صرف ایک سے مستفید ہونا ہی افضل ہے۔ کیا یہ علم سے محرومی تو نہیں؟ اور کیا واقعی ایک فقیہ نے مسلمانوں کے سارے مسائل کا حل پیش کر دیا ہے؟

کیا آج جو مسائل زندہ ہیں ان کے دور میں تھے؟ مزید یہ کہ ایک کو پکڑنے کا کون کہتا ہے؟ قرآن؟ سنت رسول؟ صحابہ کرام؟ یا ائمہ کرام کا خود یہ کہنا ہے؟ نیز اس میں کونسی خواہش پرستی ہے اگر ایک مسلمان یہ اصول بنالے کہ میں ہر اس فقیہ کی بات ماننے کو تیار ہوں جس کی تائید صحیح حدیث کرتی ہو۔ دوسرے الفاظ میں صحیح حدیث اور رسول اللہ ﷺ سے ثابت شدہ مسئلہ خواہش پرستی نہیں بلکہ اطاعت، محبت اور ایمان بالرسول کا متقاضی ہے جو ہر مسلمان کو رسول اللہ کی اطاعت میں مقید کر دیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر یہ مسائل جو صحیح احادیث میں آ گئے ہیں ان کا کیا کیا جائے؟ کیا ان احادیث کو کتب حدیث سے نکال دیا جائے یا کتب حدیث کو ہی ختم کر دیا جائے؟ شاید اس نقطہ نظر میں شدت اس لئے بھی اختیار کر لی گئی ہے کہ حدیث رسول کو اختیار کرنے سے شخصیت پس پردہ چلی جاتی ہے اور یوں مسلک کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے جب کہ مسلمان کے لئے قابل فخر بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ دین رسول ﷺ کو زندہ رکھے اسی کے لئے جئے۔ نہ کہ کسی مذہب کو زندہ رکھے اور اس کے لئے جئے۔ دین تو تعصب ختم کرنے کی اور اتفاق پیدا کرنے کی علامت ہے اور شخصیت پرستی مذہبی تعصب جنم دینے کی اور افتراق وانتشار کی!

دوسری رائے یہ ہے کہ سب حق پر ہیں اور یہ سب مظاہر دراصل اللہ تعالیٰ کی ایک منشاء ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی

ہر سنت کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس نے ہر ایک کو توفیق بخشی ہوئی ہے وغیرہ۔ یہ رائے گو سیاسی ہے مگر پھر بھی ایک مسلمان اپنے معاشرے میں جب معمولی مسائل پر اختلافات کی ایک خلیج دیکھتا ہے تو اسے دین بجائے رحمت کے ایک زحمت نظر آتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ کیا رسول رحمت نے ہمیں ایسا دین عطا کیا جس میں ایک کام کے لئے مختلف عمل ہوں؟ اور ان مختلف اعمال کی بنیاد پہ شدید تعصبات ہوں؟ کیا یہ سنت رسول کی خدانخواستہ کارستانی ہے جس کے تکلیف دہ مناظر آج ہم اپنے محلوں کی مساجد یا جلسوں وغیرہ میں دیکھتے ہیں یا شخصی خیالات کی افضلیت کی لڑائی ہے؟ کیا یہ وسعت ہمیں وہاں نظر آتی ہے جو ہماری مسجد میں آ کر نماز پڑھ لے یا ہمارے اجتماع میں آ شامل ہو؟ کتنی عجیب بات ہے کہ خیالات امتیوں کے ہوں اور انہیں جامہ سنت رسول کا پہنا دیا جائے۔ ! اپنے اپنے محدود علم، فہم اور میلانات واحساسات کے اعتبار سے فقہاء کرام کے اجتہادات ومسائل میں گو نمایاں تفاوت موجود ہے مگر یہ شارع کا اختلاف نہیں کیونکہ اس نے نصوص کو اس لئے وضع نہیں کیا کہ ان میں اختلاف پیدا ہو۔

تعصّبات کو ختم کرنے کی ولی اللہی تجویز

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی دور اندیشی وصاحب بصیرت نگاہ سے ان تعصّبات کو ختم کرنے کی مثبت تجاویز دیتے ہیں، جو آج بھی مسلم امہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرسکتی ہیں، تجاویز درج ذیل ہیں۔

پہلی تجویز: حنفی وشافعی اختلافات قرآن وحدیث کے ظواہر (Apparent Indications) پر پیش کئے جائیں۔ جو ان کے مطابق ہوں یا ان کے قریب ترین ہوں، انہیں تسلیم کرلیا جائے۔ اور جو مسائل فقہی قرآن وحدیث کے خلاف ہوں انہیں ترک کردیا جائے۔

دوسری تجویز: فقہائے محدثین، قرآن وحدیث کے ظواہر کو تقدس کا اتنا درجہ نہ دیں، کہ تفقہ بالکل نظر انداز ہو جائے۔ جیسے اہل ظاہر نے کیا۔ اور فقہائے احناف اقوال ائمہ کو اتنی اہمیت نہ دیں کہ قرآن وحدیث کی نصوص (Texts) سے بھی وہ فائق تر ہو جائیں۔ بلکہ بین بین راستہ اختیار کیا جائے۔ فقہاء کرام کی فقہی کاوشوں سے بھی پورا استفادہ کیا جائے لیکن نصوص صریحہ کا بھی پورا احترام وتقدس ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ (التفہیمات الالٰہیۃ ۱/۲۷۹)

بلا شبہ ہم آج بھی ان تجاویز سے فائدہ اٹھا کر صدیوں سے مبتلا اس امہ میں فقہی جمود کو توڑنے اور مذہبی فقہی منافرت کو ختم کرنے میں کچھ مثبت کردار ادا کرسکتے ہیں۔

اختلاف کے باوجود رواداری: بعض لوگ اخْتِلَافُ أُمَّتِيْ رَحْمَةٌ اور أَصْحَابِيْ كَالنُّجُومِ جیسی احادیث

سے احتجاج کرتے اور کہتے ہیں: فقہاء کرام اور مجتہدین کا اختلاف باعث رحمت ہے۔ جب کہ پہلی حدیث بے اصل ہے جس کا سراغ محدثین بھی نہیں نکال سکے۔ اور دوسری حدیث صحیح نہیں۔ امام ابن عبدالبرؒ اور ابن حزمؒ نے اسے ناقابل احتجاج سمجھا ہے اور شیخ البانیؒ نے اسے سِلْسِلَةُ الأَحَادِيثِ الضَّعِيفَةِ میں ذکر کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ضعیف احادیث پر اتنا اصرار کیوں؟ کیا کہیں اپنی اختلافی بات کو اہمیت دینا تو مقصود نہیں تاکہ مسلمان متحد نہ ہوں؟ اور اپنی فقہی حیثیت بھی برقرار رہے؟ یا پھر ہمارے جو حالات ہیں ان میں اگر اختلاف رحمت کا موجب ہوتا تو اتفاق غضب خداوندی کا سبب بنتا! مسائل میں اختلاف عہد صحابہ میں بھی رہا تاہم یہ اختلاف ان کے مابین بغض وعناد کا سبب نہ بن سکا۔ چونکہ یہ لوگ اپنے ہی اقوال کے اندر حق محدود کرنے کے عادی نہیں تھے اس لئے اپنی رائے پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کو عزت واحترام دیتے تھے اور ان کی رائے کی قدر کیا کرتے تھے۔ آج ہم مسلمان ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے۔ مگر مسجد کے باہر باہمی معاملات خوش اسلوبی کے ساتھ بھی طے کرتے ہیں۔ کیا ہمارے اسلاف کا یہی طریقہ تھا؟ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے اصحاب برابر مدینہ کے مالکی ائمہ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے حالانکہ یہ لوگ بسم اللہ نہ تو سراً پڑھتے اور نہ جہراً۔ الحمدللہ حرمین کی طرف کھلی آمدورفت نے عوام میں یہ جذبہ رواداری بیدار کر دیا ہے اور وہ حرمین کے ائمہ کے پیچھے اپنی نماز کو نہ صرف شوق سے پڑھتے ہیں بلکہ بلاتردد اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں:

خلیفہ ہارون الرشید نے امام مالکؒ کے فتوی پر فصد کے بعد وضوء کے بغیر نماز پڑھائی۔ قاضی ابویوسفؒ نے ان کے پیچھے نماز پڑھ لی اور دہرائی نہیں۔ امام احمدؒ بن حنبل نکسیر پھوٹنے اور جسم سے خون نکلوانے کی صورت میں وضو کے قائل تھے۔ ان سے سوال کیا گیا کہ امام کے جسم سے خون نکل آئے اور وہ وضو نہ کرے تو کیا آپ اس کے پیچھے نماز پڑھ لیں گے؟ انہوں نے فرمایا: بھلا امام مالکؒ اور سعید بن المسیبؒ جیسے لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنے سے کس طرح انکار کر سکتا ہوں؟۔ قاضی ابویوسفؒ اور محمدؒ بن الحسن کے متعلق روایت ہے کہ یہ لوگ عیدین میں تکبیر ابن عباسؓ کے مذہب کے مطابق کہتے تھے اس لئے کہ ہارون الرشید کو اپنے جد امجد کی تکبیر زیادہ پسند تھی اور وہ ان کے پیچھے نماز پڑھا کرتا تھا۔ امام شافعیؒ نے ایک مرتبہ صبح کی نماز امام ابوحنیفہؒ کے مقبرہ کے قریب مسجد میں پڑھی اور امام صاحب کے مسلک کے احترام میں دعائے قنوت نہیں پڑھی اور فرمایا: ہم بھی کبھی کبھی اہل عراق کے مذہب کو اختیار کر لیتے ہیں۔ قاضی ابویوسفؒ کے متعلق روایت ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے حمام میں غسل کر کے جمعہ کی نماز پڑھائی جب

لوگ چلے گئے تو پتہ چلا کہ حمام کے کنویں میں چوہیا مری ہے۔ ان سے ذکر کیا گیا تو فرمایا کچھ مضائقہ نہیں آج ہمارا عمل اہل مدینہ کے مذہب پر ہوگا کہ پانی کی مقدار جب دو قلہ ہو جائے تو وہ پلید نہیں ہوتا۔ (الإنصاف)

فقہاء ہمارا عظیم سرمایہ: ہم مسلمانوں کی قیادت، اتباع اور اطاعت کے ذریعے رسول اکرم ﷺ کے ہاتھ میں تھمادی گئی ہے آپ ﷺ ہی کی ذات گرامی ایسی ہے جو معصوم ہے باقی سب خطا کے پتلے ہیں۔ اور ان کی خطا دین وشریعت کی خطا نہیں بلکہ وہ ان کی ذاتی خطا ہے۔ اسی طرح ان کی اجتہادی خطا بھی دین نہیں بلکہ ان کی ذاتی سوچ وفہم کی عکاس ہے۔ چشم بصیرت رکھنے والا ان خطاؤں کی اندھی پیروی کبھی نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ خود ان ائمہ محترمین نے اس سے منع فرمایا ہے۔ مختلف فقہاء کرام کو پڑھیے یہ سب ہمارا عظیم سرمایہ ہیں۔ ان کے وہ اجتہادات ہمارے لئے مشعل راہ ہیں جو دین کی صحیح تعبیر اور مقاصد شریعت سے ہم آہنگ وقریب تر ہیں۔ ورنہ صحیح احادیث تو اختلافی صورت میں ہماری راہ بر ہیں ہی۔

☆.....ایک اصول ہے: اولاً صحیح حدیث سے ہی مسئلہ کا حل تلاش کیا جائے اگر صحیح حدیث میں مسئلہ کا حل نہ ملے تو حسن حدیث ہی سہی اگر اس میں بھی نہیں ملتا تو پھر قیاس سے بہتر ضعیف حدیث ہے۔ ورنہ فقہاء کرام کے استنباطات اور اجتہادات سے مستفید ہوا جائے۔

☆.....فقہی اختلافات کو ختم کرنے اور فقہی جمود کو توڑنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ تمام فقہاء کی فقہی کاوشوں سے مستفید ہوا جائے۔ کسی ایک کے علم کو کلی سمجھا جائے اور نہ ہی ایک پر اکتفاء کیا جائے اور نہ ہی اس کے اجتہاد کو حرف آخر سمجھا جائے۔ ایسا کرنے کی نہ کسی فقیہ محترم نے تلقین کی اور نہ ہی وحی الٰہی نے۔ کیونکہ حسب فرمان الٰہی ﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ﴾۔ ہر عالم کے اوپر ایک عالم ہوتا ہے۔ رہی شریعت تو اس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ تمام فقہاء کرام کے علم کو اگر مجتمع کردیا جائے تب بھی وہ فقہ اسلامی کی تکمیل نہیں کرسکتے۔

☆.....اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ بعض فقہاء کرام کے کچھ فقہی استنباطات اور اجتہادات صحیح حدیث کے خلاف بھی ہیں۔ جس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ خدانخواستہ انہوں نے صحیح حدیث کی عمداً مخالفت کرڈالی۔ بلکہ ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ ان فقہاء محترم کو حدیث رسول ﷺ نہیں پہنچی ہوگی ورنہ وہ کبھی ایسا اجتہاد واستنباط نہ کرتے۔ مجتہدین کرام اور فقہاء عظام آخر انسان تھے اس لئے ان کے پاس جو بہتر دلیل ان کے علم کے مطابق تھی وہ استنباط کرکے مسئلہ دلیل سمیت بتادیا کرتے۔ اس لئے بغیر دلیل نہ اجتہاد ہوتا ہے نہ استنباط۔ صرف دلیل کا معیار ہی بتادیتا ہے کہ

اجتہاد کس معیار کا ہے تا کہ اسے قبول یا رد کیا جا سکے۔ اجماعی اجتہاد اور استنباط بھی دلیل کا محتاج ہوتا ہے اس لئے کہ یہ ناممکن ہے کہ مجتہدین کرام کسی، کمزور، بے اصل یا کسی دلیل کے بغیر کسی اجتہاد پر اتفاق کر لیں۔

☆......لہٰذا ایسے فتاویٰ یا اجتہادات جو لوگوں میں معروف ہیں اہل علم پر فرض ہے کہ ان کے حدیثی دلائل کو تحقیق کے بعد بیان کریں کیونکہ فقہ کی عام کتب جن سے ہمارا عام طبقہ زیادہ تر رجوع کرتا ہے وہ بے شمار منکر، بے اصل اور موضوع روایات اپنے اندر سموئے ہوئی ہیں۔

☆......امہات کتب فقہ میں بھی جب ایسی احادیث سے مسائل مستنبط کئے گئے تو علماء حدیث وفقہ سے رہا نہ گیا اور انہوں نے ان فقہی کتب میں وارد احادیث کی تخریج کر ڈالی تا کہ طلبہ علم صحیح وضعیف اور موضوع احادیث سے واقف رہیں۔ مثلاً: **الهدایه** فقیہ مرغینانی کی کتاب، **المدونة** فقیہ ابن القاسم کی کتاب، **شرح الوجیز** فقیہ الرافعی کی کتاب، **المغنی** فقیہ ابن قدامہ کی کتاب اور **بدایة المجتهد** فقیہ ابن رشد کی کتاب جو فقہ القارن کی ایک اچھی کوشش ہے۔ اسی طرح اردو میں موجود فقہی لٹریچر جوانہی کتب سے مستفاد ہے۔

☆......فروع کے استنباط کا مشغلہ ہر دور میں رہا ہے مگر خیر القرون میں کوئی شخص دوسرے کی فقہ کا پابند نہیں رہا۔

ابن القیمؒ فرماتے ہیں:

فَإِنَّا نَعْلَمُ بِالضَّرُورَةِ أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ فِي عَصْرِ الصَّحَابَةِ رَجُلٌ وَاحِدٌ اتَّخَذَ رَجُلًا مِنْهُمْ:٦)

ہم بخوبی جانتے ہیں کہ عصر صحابہ میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس نے ان میں سے کسی ایک کو پکڑ رکھا ہو۔ یعنی اس کی فقہ کو مانتا ہو یا اس کی تقلید کرتا ہو۔

☆......یہ سمجھنا کہ دور جدید کے مسائل کا حل، قدیم فقہی ذخیرہ میں ملتا ہے تو یہ بھی راست فکر نہیں اس لئے کہ:

مَنْ زَعَمَ أَنَّ الدِّيْنَ كُلَّه فِي الْفِقْهِ بِحَيْثُ لَا يَبْقٰى وَرَائَهُ شَيءٌ فَقَدْ عَادَ عَنِ الصَّوَابِ۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ سارے کا سارا دین فقہ میں اس طرح آ گیا ہے کہ اب کوئی شے باقی نہیں رہی وہ صحیح سوچ سے ہٹا ہوا ہے۔ (فیض الباری ۲/۱۰)

اجتہاد کی ضرورت: عام لوگوں کو یہ سمجھا دیا گیا ہے کہ ائمہ اربعہ نے جو اجتہاد کرنا تھے کر لئے اور جو کچھ کہنا تھا کہہ گئے۔ اس لئے موجود فقہ کافی ہے۔ وہی مجتہد مطلق تھے انہی کی بتائی فقہ کا پابند رہ کر ایک مسلمان کو زندگی گذارنی چاہئے نہ کہ وہ اجتہادی کوششیں شروع کر دے۔ کیونکہ اجتہاد کی کنجی گم ہو گئی ہے۔ اسی تصور نے اجتہاد کا دروازہ بند

کرایا ہے۔ اس لئے بعد کے اہل علم حضرات انہی حضرات میں سے کسی ایک کے خوشہ چیں اور مقلد رہے ہیں۔ ہاں حسب مراتب ان میں بعض مجتہد منتسب ہیں اور بعض مجتہد فی المذہب۔ مگر مجتہد مطلق، مستقل کوئی نہیں رہا اور نہ رہے گا۔ اس دعوی محض کے بارے میں سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ امت محمد یہ ایسی بانجھ ثابت ہوئی کہ پندرہ سو سالوں میں اس نے صرف چار مجتہد ہی پیدا کئے؟۔ اس دعوے کی محققین حضرات نے تردید کی ہے بلکہ روایتی دور کے ختم ہونے کے بعد جدید دور کے آنے پر امت کے لئے اسے نقصان دہ قرار دیا ہے۔

مولانا لکھنوئیؒ اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَالْحَاصِلُ أَنَّ مَنِ ادَّعٰى بِأَنَّهُ قَدِ انْقَطَعَ مَرْتَبَةُ الاِجْتِهَادِ الْمُطْلَقِ الْمُسْتَقِلِّ بَالأَئِمَّةِ الأَرْبَعَةِ انْقِطَاعًا لَا يُمْكِنُ عَوْدُهُ فَقَدْ غَلِطَ وَخَبَطَ، فَإِنَّ الاِجْتِهَادَ رَحْمَةٌ مِنَ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ لَا تَقْصُرُ عَلَى زَمَانٍ دُوْنَ زَمَانٍ، وَلَا عَلَى بَشَرٍ دُوْنَ بَشَرٍ۔ وَمَنِ ادَّعٰى انْقِطَاعَهَا فِي نَفْسِ الأَمْرِ مَعَ إِمْكَانِ وُجُودِ فِي كُلِّ زَمَانٍ فَإِنْ أَرَادَ أَنَّهُ لَمْ يُوجَدْ بَعْدَ الأَرْبَعَةِ مُجْتَهِدٌ اتَّفَقَ الْجُمْهُورُ عَلَى اجْتِهَادِهِ وَسَلَّمُوا اسْتِقْلَالَهُ كَاتِّفَاقِهِمْ عَلَى اجْتِهَادِهِمْ فَهُوَ مُسَلَّمٌ وَإِلَّا فَقَدْ وُجِدَ بَعْدَهُمْ أَيْضًا أَرْبَابُ الاِجْتِهَادِ الْمُسْتَقِلِّ كَأَبِي ثَوْرٍ الْبَغْدَادِيِّ وَدَاوٗدَ الظَّاهِرِيِّ وَمُحَمَّدِ بْنِ إِسْمَاعِيلَ الْبُخَارِيِّ وَغَيْرِهِمْ عَلَى مَا لَا يَخْفٰى عَلَى مَنْ طَالَعَ كُتُبَ الطَّبَقَاتِ۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جو اس بات کا مدعی ہے کہ اجتہاد مطلق و مستقل کا مرتبہ ائمہ اربعہ کے بعد ختم ہو چکا ہے یہ مرتبہ اب کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا تو وہ غلطی اور خبط میں مبتلا ہے کیونکہ مرتبہ اجتہاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت نہ کسی زمانہ پر منحصر ہے اور نہ ہی کسی انسان پر رک سکتی ہے اور جو امکان کے باوجود اس کے انقطاع کا نفس الأمر میں مدعی ہے تو اس کا منشا اگر یہی ہے کہ ائمہ اربعہ کے بعد کوئی ایسا مجتہد نہیں جس کے اجتہاد پر جمہور کا اتفاق ہوا اور انہوں نے اسے اسی طرح مستقل مجتہد تسلیم کیا ہو جیسے ائمہ اربعہ ہیں تو یہ بات قابل تسلیم ہے ورنہ ائمہ اربعہ کے بعد بھی مجتہد مستقل ہوئے ہیں جیسے امام ابوثور بغدادی، امام داؤد ظاہری، امام محمد بن اسماعیل بخاری وغیرہ کتب طبقات کا مطالعہ کرنے والا اسے اچھی طرح جانتا ہے۔ (النافع الکبیر ص:۹)

استنباط: اس لفظ کے مفہوم کو بھی سمجھنا چاہئے۔ کنویں سے پانی کے ڈول کو نکالنا استنباط کہلاتا ہے۔ گویا ایک فقیہ، اپنے علم اور خداداد بصیرت کی بناء پر کسی بھی نئے واقعے یا حادثے کا حکم قرآن وحدیث کے الفاظ سے نکالتا ہے جو دوسرے پر مخفی رہا ہو۔ یہی اجتہاد بھی کہلاتا ہے۔ صرف لفظ کو سمجھ لینا استنباط نہیں کہلاتا اور نہ لفظ کا موضوع استنباط سے

حاصل ہوتا ہے بلکہ علت سے، معنیٰ سے، شبیہ سے، نظیر سے اور متکلم کے مقصد سے ہی مسائل کا استنباط ہوتا ہے۔ صرف ظاہر لفظ کو سننا، انہیں اڑا دینا اور شائع کر دینا اللہ کے نزدیک مذموم فعل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل استنباط کی قرآن مجید میں تعریف فرمائی ہے اور انہیں اہل علم سے خطاب فرمایا ہے۔ دنیا میں نت نئے ان گنت حوادث وواقعات رونما ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ یہ حوادث تغیر پذیر ہیں اور ہر لمحہ ان میں تبدیلی اور (Modification) ہوتی رہتی ہے۔ حیات انسانی کے وہ حوادث جن میں تغیر رونما نہیں ہوتا شریعت اسلامیہ نے ان کی تفصیل وتوضیح کرنے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں اختلاف کم پایا جاتا ہے مثلاً عقائد وعبادات، احکام وراثت، نکاح ووفات سے متعلق احکام ومسائل۔ یا وہ امور جن کو جدید اصطلاح میں احوال شخصیہ کہا جاتا ہے۔ بخلاف ازیں جو امور تغیر پذیر ہیں ان کے بارے میں شریعت نے ایسے قواعد عامہ وضع کر دیے ہیں جن سے تمام حوادث وواقعات کے احکام استنباط کئے جا سکتے ہیں۔ مجتہدین عظام کا یہی کارنامہ ہے کہ واقعات کو نصوص پر منطبق کرتے ہیں اور ان سے احکام کا استنباط بھی کرتی ہیں۔

جرح وتعدیل: محدثین نے جرح وتعدیل کے جو اصول، تابعین، تبع تابعین اور بعد کے علماء کے بارے میں بنائے یہ صرف حدیث کے راویوں کے لئے نہیں تھے بلکہ یہ ہر فقیہ، محدث، مفسر اور متکلم کے لئے تھے۔ سبھی کو ان اصولوں کے تحت پرکھنا ہوگا کہ وہ کیا علمی، عملی اور ذہنی معیار رکھتا ہے۔ صرف الصحابة کلھم عدول صحابہ کرام مستثنیٰ ہیں۔ فقہاء کرام کے بھی درجات ہیں۔ انہیں پڑھ کے اندازہ ہوتا ہے کہ جرح وتعدیل سے مبرا کوئی نہیں۔ اس لئے کسی بھی اجتہاد، استنباط یا شرعی مسئلہ کی وضاحت میں کسی بھی فقیہ کی ثقاہت، عدالت، اس کے عقلی ونقلی دلائل، اس کے اجتہادات، اس کا شذوذ وغیرہ ان اصولوں کے تحت پرکھنا ہوگا تا کہ فقہی مسائل کی چھانٹی ہو سکے اور صحیح مسائل والے فقیہ یا فقہاء کو ترجیح دی جا سکے۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ نقد وجرح کا پیمانہ ایک خاص گروہ کے لئے تو ہو مگر دوسرے کے لئے نہ ہو۔ اس لئے وہ فقہاء جو فقاہت کے مقام کو چھوتے ہیں ان کے فرمودہ فقہی مسائل میں ثقاہت، اجتہادات کے دلائل سرفہرست ہوتے ہیں۔ مگر غیر ثقہ فقیہ کو کوئی حیثیت نہیں دیتا۔

اس لئے فقہی مسائل میں بقول ائمہ کرام کوئی مسئلہ یا اجتہاد قبول نہیں کیا جائے گا جب تک اس کی قوی دلیل فراہم نہ کر دی جائے۔ محض یہ کہہ دینا کافی نہیں ہوگا کہ فقہ میں ہے یا فلاں فقیہ کی فلاں کتاب میں ہے یا فلاں فقیہ نے فرمایا ہے۔ جس طرح کوئی حدیث بغیر سند اور اس کے راویوں کی ثقاہت کے قبول نہیں کی جاتی بلکہ اسے تنقیدی اعتبار سے

بھی پرکھا جاتا ہے، بعینہ اسی طرح فقہاء کے ان اجتہادات و مسائل کی بھی دلائل اور سند کے ساتھ روایت ہوئی ہے۔ ان کو بھی بغیر کسی دلیل و روایت کے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں ضرور دیکھنا ہوگا کہ مسئلہ کیا ہے؟ اس کی دلیل کیا ہے؟ اور کون اس کا راوی ہے؟ درایتی اعتبار سے وہ کیسی ہے تا کہ آپ ﷺ کے ارشاد کی صحیح تعبیر مخاطب تک پہنچ سکے۔ غیر فقیہانہ مسائل، ائمہ حضرات کی طرف منسوب اقوال و اجتہادات تو ہونگے مگر ان کی حیثیت ایک ضعیف یا موضوع حدیث سے کم نہ ہوگی۔ امام عبد اللہ بن المبارکؒ نے دین کا صحیح ادراک کر کے پہلے ہی ہمیں الرٹ کر دیا تھا کہ یاد رکھنا: الإِسْنَادُ مِنَ الدِّيْنِ، لَو لَا الإِسْنَادُ لَقَالَ مَنْ شَاءَ مَا شَاءَ۔ اسناد یعنی کسی کے قول یا مسئلے یا حدیث کے سلسلہ سند کو پیش کرنا دینی فریضہ ہے اگر اس سلسلے کو غیر اہم سمجھا جاتا تو جو شخص جو کچھ چاہتا کہہ دیتا۔ ملا علی القاری **شرح فقه الأكبر** میں فرماتے ہیں: العِلْمُ مَا فِي الإِسْنَادِ، وَمَالَيْسَ فِيهِ الإِسْنَادُ فَهُوَ مِنْ وَسْوَسَةِ الشَّيَاطِينِ۔ علم یعنی فقہ، حدیث کا اصل علم وہ ہے جس میں سند ہو اور جس علم میں سند نہ ہو وہ وساوس شیطانی ہیں۔

تخریج سے اجتناب: کتب فقہ کے مطالعہ کے دوران یہ بکثرت محسوس کیا گیا ہے کہ فقہی مسائل میں ایک امام، ان کے شاگرد، پھر ان کے بعد تقریباً ہر صدی میں ظاہر ہونے والے فقہاء کرام کا فقہی نقطہ نظر کافی پھیلتا چلا گیا ہے۔ جب کہ مذہب کے امام نے اس قدر مسائل لکھے نہ بیان کئے۔ مسائل کی یہ وسعت عجیبہ اپنے اندر مختلف نقطہ ہائے نظر بھی رکھتی ہے۔ جس میں شاگرد اپنے شیخ سے اور بعد کے فقہاء کرام اپنے مشائخ سے اختلاف کرتے ہیں۔ مسائل کا حل بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن ان میں جہاں عِندَ أبي حَنيفةَ، وعِندَ صَاحِبَيْهِ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہاں کبھی کبھار عِنْدَنَا کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے۔ فقہاء کرام نے اسے نہ تقلید کہا اور نہ ہی مذہب سے خروج۔

یہ بات بھی اکثر ذہن میں آتی ہے کہ امام محترم کی طرف منسوب یہ مسائل کوئی سند رکھتے ہیں اور نہ ہی امام محترم کی اس سلسلے میں کوئی معروف فقہی کتاب ہے پھر یہ سب کچھ ایک مخصوص فقہ کیسے بن گئی؟۔ نیز اولین شاگردوں کے پاس اپنے استاد محترم کا اتنا مواد کہاں تھا کہ وہ اس سب کچھ کو امام محترم کی طرف منسوب کرتے؟۔ ان تمام سوالوں کا جواب اسی مسئلہ تخریج میں ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ اپنے امام کے کسی قول کو یا فقہی فرعی مسئلے کو بنیاد بنا کر اس سے مسائل احکام کو اس طرح استنباط کرتے جانا اور مسائل سے مسائل کو تلاش کرتے جانا جیسے ایک مجتہد قرآن وحدیث سے استنباط کرتا ہے۔ اور یوں انہیں امام مذہب کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ یہ احکام بعد میں کتب کی زینت

بنتے ہیں اور اپنے اپنے مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں اس طرح مذہب میں وہ معمول بہا ہو جاتے ہیں۔ معروف مذاہب میں اس کے باقاعدہ متخصص لوگ ہیں۔

تخریج کا یہ انداز کیا تقلید شخصی کی نفی نہیں کرتا؟ مسئلہ تو امام محترم نے بتایا مگر اس سے اصول در اصول اور مسائل در مسائل جب نکلتے گئے تو کیا یہ اجتہاد نہ ہوا؟ پھر تقلید پر اتنا زور کیوں؟ پھر تخریج کے اس طفلی انداز میں اگر تھوڑی سی وسعت یوں پیدا کر لی جاتی کہ ہر اچھے اور قابل فقیہ کے دلائل کو بھی شامل کر لیا جاتا اور پھر تخریج کی جاتی تو شاید سب کے لئے قابل قبول ہو جاتی۔ کیونکہ اس قسم کی تخریج سے ایسی تشریع واستنباط احکام شروع ہو جاتے ہیں جو براہ راست قرآن وحدیث سے تو ماخوذ نہیں ہوتے بلکہ امام مذہب کے کلام سے مستنبط ہوتے ہیں۔ جو ایک اچھے مفہوم کو ذہن میں نہیں لاتی۔ اگر یہ سارا زور قرآن وحدیث کی نصوص پر لگایا جاتا تو یہ سارے دین کی ایک خدمت ہو جاتی۔ اس پر بھی ایک بحث ہے کہ کیا ان مخرج مسائل کو امام مذہب کی طرف منسوب کرنا درست ہے؟ کچھ نے تو اس کی اجازت دی ہے اور کچھ نے تخریجی مسئلہ کے ساتھ قید لگانے کا کہا ہے تاکہ کذب کا واہمہ نہ ہو اور امام مذہب کی نصوص سے یہ تخریج الگ رہے۔ بعض فقہاء نے اس کی اجازت نہیں دی۔

سوال صرف اتنا ہے کہ احکام کا شارع اللہ تعالیٰ ہے جو ایک اجماعی بات ہے۔ چونکہ مفتی سے ان احکام کے بارے میں سوال پوچھا جاتا ہے جو شارع سے ثابت ہوں۔ انقطاع وحی کے بعد شرعی احکام کو صرف کتاب وسنت کی نصوص سے ہی سے ثابت کیا جا سکتا ہے یا پھر اجماع وقیاس سے۔ اس تخریج میں یہ اصول کہاں ہیں؟۔ اور مفتی کا یہ فرمانا کہ ہمارے امام کے نزدیک یہ ہے وغیرہ کہاں تک درست ہے؟۔ ہمارا مقصد صحیح اور اصولی بات کرنا ہے جو معتدل ائمہ نے اختیار کی ہے۔ باقی: وَلِلنَّاسِ فِيْمَا يَعْشِقُوْنَ مَذَاهِبُ۔

☆☆☆☆☆

فتویٰ اور مفتی

فتویٰ: فتویٰ کسی بھی مسئلے کے شرعی حل کو طلب کرنا ہوتا ہے۔ یہ حل زبانی طور پر بھی مانگا جا سکتا ہے اور تحریراً بھی۔ فتویٰ اپنی لاعلمی کو دور کرنے یا علم کو پختہ کرنے کیلئے اپنے سے بڑے عالم یا عالم دین سے مانگا جاتا ہے۔ چاہے اس کا تعلق عقائد وعبادات سے ہو یا اخلاق ومعاملات سے یا باہمی نزاع سے۔ عالم دین کو رسوا کرنے یا زچ کرنے کے لئے استفتاء نہ ہو۔ کیونکہ یہ طریقہ اہل ایمان کا نہیں۔ جس سے یہ حل مانگا جاتا ہے اسے **مفتی** کہتے ہیں۔ اور مسئلے کا

حل پوچھنا خواہ وہ زبانی ہو یا تحریری، اسے **استفتاء** کہتے ہیں۔ فتوی دراصل مفتی کی اپنی ایک علمی رائے (Opinion) ہے جسے وہ شرعی حکم بتا کر ظاہر کرتا ہے فتویٰ لینے اور دینے کا سلسلہ نزول قرآن اور رسالت مآب ﷺ کے زمانہ سے ہی شروع ہوا۔ چونکہ اس عمل میں خود رسول اکرم ﷺ، صحابہؓ، اور علماء فقہاء امت پیش پیش رہے اس لئے "مفتی" کا منصب فتوی دینے سے زیادہ اہم ہے اس لئے اس میں کچھ ایسے خصائص کا ہونا لازمی ہے جو اس کے منصب اور مقام کو مزید جلا بخشیں۔

مفتی اور اس کی شرائط: مفتی ایک ایسا عالم دین ہو جو احکام شریعت میں بصیرت رکھنے والا، معتدل مزاج اور مسئلہ کی نوعیت و باریکی کو سمجھتے ہوئے دین کی تمام تر آسانیوں اور گنجائشوں کو مدنظر رکھ کر، تعصب و مسلکی عناد و حب شخصیات سے بالاتر ہو کر مسئلہ کا حل شرعی دلائل کی روشنی میں پیش کرے۔ فتوی دینے کا منصب بہت ہی اہم اور ذمہ دارانہ ہے۔ اس منصب کو اللہ رب العزت نے اپنے لئے پسند فرمایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ویستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ۝﴾ لوگ آپ سے فتویٰ مانگتے ہیں۔ آپ کہیے اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔

مزید یہ کہ آپ ﷺ بھی فتوی دیا کرتے تھے۔ علماء اس منصب کو بہت ہی مشکل دقیق اور انتہائی اہم سمجھتے ہیں اس لئے مفتی کو یہ ضرور خیال رکھنا چاہئے کہ وہ کس کی نیابت کر رہا ہے۔ جو بات کہے سچ کہے، غلط تاویلات نہ کرے یا حیلے بہانوں سے اپنی جان نہ بچائے۔ اور اس یقین کے ساتھ فتویٰ دے کہ کل روز قیامت اس سے باز پرس ہونی ہے اور اسے رب ذوالجلال کے حضور کھڑا بھی ہونا ہے۔ احادیث کی روایت جو صحابہ کرامؓ نے کی، یہ کوئی محض ان کا شوق نہیں تھا۔ بلکہ بیشتر روایات، سائل کے سوال کا جواب ہوتی تھیں۔ اور یہی ان کے فتاویٰ تھے۔ ان فتاویٰ میں ان کی کمال احتیاط یہ تھی کہ جواب دیتے وقت انہیں الفاظ پر اکتفاء کیا جو آپ ﷺ نے ارشاد فرمائے یا انہی اعمال کی وضاحت کی جو آپ ﷺ کو کرتے دیکھی۔ اپنی طرف سے شاذ ہی کسی لفظ کو ارشاد رسول میں ڈالنے کی کوشش کی ہو۔ یہی منہج بعد کے اسلاف محدثین وفقہاء کے ہاں رہا۔

مفتی کی خصوصیات

علم وصداقت: علم اور مسئلے کا صحیح حل پیش کرنا مفتی کی اولین خصوصیات میں سے ہے۔ مفتی بننے کا مقام ایک طویل علمی وتحقیقی تجربہ کا متقاضی ہوتا ہے۔ اور وسعت نظری کا بھی۔ وہ شخص مفتی کہلانے کا کبھی مستحق ہی نہیں رہا جو مذہبیت

کا شکار ہو کر صرف اپنے ہی خول میں محدود رہا اور دیگر فقہاء وعلماء کی وقیع آراء کو یا اجتہاد کو کوئی وزن نہ دے سکا۔ اسلاف میں طویل عرصہ کی تدریس اور سالہا سال علماء وفقہاء سے علم حاصل کرنے کے باوجود افتاء کے مقام پر فائز ہونے کا رجحان نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ چند سالہ صحبت علمی اور معمولی درک پالینے سے فتویٰ نویسی یا افتاء کے عادی نہیں تھے۔ اور نہ ہی اس سلسلے میں وہ مخالف کی خبر لینے میں مشتعل نفسیات کے مالک تھے۔ ان کے مقام عالی اور مرتبے کی عظمت کو دیکھ کر لوگ ان کے فتاویٰ کی قدر و قیمت جانتے تھے کہ یہ منصف مزاج ہیں فتوی دینے میں معتدل طبیعت کے مالک ہیں اور مسلکی تعصب کا شکار ہوئے بغیر فتویٰ دیا کرتے ہیں۔

اس لئے جو مفتی شرعی مسئلہ بتانا چاہتا ہے اس کے پاس کم از کم مسئلہ کا صحیح علم ہو اور ساتھ ہی ایمان وسچائی کا مادہ بھی۔ وہ قرآن مجید کی آیات اور صحیح احادیث کے ہوتے ہوئے بزرگوں کے اقوال یا غیر صحیح احادیث سے گریز کرے کیونکہ یہ علم وصداقت نہیں۔ مفتی جو اقتباس بھی بتانا چاہے من وعن بتائے یا اس کی تلخیص کر دے۔ مگر اس میں تحریف یا تغیر نہ کرے۔ روایت اور فتویٰ دونوں کے لئے ایسی وصف کا ہونا بنیادی طور پر مسلم ہے۔ مفتی حق گوئی سے نہ تو دنیوی مصلحتوں کو سامنے رکھے اور نہ ہی دنیوی فتنوں کے خوف سے گھبرائے بلکہ حق بات کو واضح کر دے۔

اخلاق وکردار: مفتی اپنے معاملات میں درستی وراستی اختیار کرے۔ اندر، باہر، کھلے چھپے ہر حال میں دل کو زبان کے مطابق اور ظاہر وباطن کو یکساں رکھنے والا بنے۔ اگر حکومت کا ایک نمائندہ بڑی قدر سے دیکھا جا سکتا ہے اور اسے عزت واکرام کے لائق سمجھا جاتا ہے۔ تو خالق کائنات کا یہ پیغامبر کتنے بلند مرتبہ والا ہونا چاہیے۔ اپنے منصب کی توقیر کرنا مفتی کے لئے فرض ہے۔ وہ اپنے مرتبے کی اچھی طرح دیکھ بھال کرے۔ دینوی مصلحتوں کو سامنے رکھ کر یا دینوی فتنوں سے گھبرا کر حق بات کو غیر واضح بیان نہ کرے اور نہ ہی حق کے بیان سے کبھی ہچکچائے۔

فہم وفراست: صحیح اور سچا فتوی وہی مفتی دے سکتا ہے جو صاحب فراست ہو۔ مسئلہ کو صحیح ادراک کرنا مفتی کی فراست کا امتحان ہوتا ہے۔ اس لئے وہ سب سے پہلے مسئلہ کی تہہ تک پہنچے اور پھر اس کا حکم کتاب اللہ وسنت رسول اللہ میں تلاش کرے۔ پھر اپنے فہم اور حکم کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھے۔ مطابقت ہو تو پھر بیان کرے ورنہ غلط قیاس سے ہر ممکن بچے۔ اگر نصوص (texts) موجود ہیں اور قابل فہم ہیں تو اپنی طرف سے بات کو طول نہ دے۔ بس انہی کو بیان کر دے۔ اگر نصوص (texts) موجود نہیں تو رائے وقیاس۔ میں محمود رائے سے فتویٰ دینے کی اجازت ہے مگر محمود رائے بناتے وقت بھی تمام ائمہ فقہاء کے فتاویٰ واقوال سے اولاً مستفید ہو جائے۔

غیر متعصب ہو: تعصب اگر حق کے لئے ہو تو ایسا تعصب ممدوح ہے ورنہ باطل کا ساتھ دینے کے لئے ہو تو یہ باطل ہے۔حق کا میزان قرآن وصحیح حدیث وسنت ہے یا جو بھی ان کے موافق ہو۔مگر جو ان کے مخالف ہے وہ باطل تعصب ہے۔اس لئے مفتی متعصب وتنگ نظر نہ ہو اور نہ ہی محدود علم وسوچ کا مالک ہو۔وہ صحیح فتوی دیتے وقت تمام ائمہ ہدیٰ کے اجتہادات وفتاویٰ سے مستفید ہو۔پھر جسے بھی قرآن وسنت کے دلائل سے اقرب پائے اس کے مطابق وہ فتویٰ دے دے۔اس کا ذہن تقلیدی نہ ہو اس لئے کہ مقلد مفتی فتوی دینے کا اولا تو استحقاق ہی نہیں رکھتا دوسرا یہ کہ وہ مقلد ہونے کی وجہ سے جانب داری کو ترک نہیں کرسکتا اور یوں وہ درست فتوی دے ہی نہیں سکتا۔اور اگر وہ فتوی دے بھی دے تو ایسے مقلد مفتی کے فتویٰ کی علماء کے ہاں کوئی حیثیت نہیں ہے کیونکہ یہ فتویٰ تو پہلے ہی سے موجود تھا۔اس مفتی کا اس میں کیا کمال ہے کہ اسے مفتی کہا جائے۔

قرآن وحدیث کا عالم ہو: قرآن وحدیث کے خلاف کسی کا قول ہو تو مفتی کو اس کی طرف مائل نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس قول کی وجہ حدیث کا نہ ملنا ہے یا اس سے صحیح وضعیف کی پہچان میں غلطی ہوگئی ہوگی۔یہی اسلاف کی خطاؤں اور غلطیوں کا عذر ہے اور معتدل رائے ہے۔حدیث خواہ حجازی ہو یا کوفی، یمنی ہو یا شامی یا مصری۔اگر وہ صحیح ہو تو مفتی اس کے مطابق ہی فتوے دے۔صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

> وَلَو بَلَغَهُ الْحَدِيثُ فَاعْتَمَدَ۔ فَكَذَالِكَ عَنْ مُحَمَّدٍ لِأَنَّ قَولَ الرَّسُولِ لَايَنْزِلُ عَنْ قَولِ الْمُفْتِيِّ۔ اگر عالم کو حدیث ملے تو اس پر وہ اعتماد کرے۔امام محمد کے نزدیک یہی درست طرز عمل ہے۔کیونکہ فرمودہ رسول مفتی کے قول سے کم تر نہیں ہوسکتا۔

امام شافعیؒ سے پوچھا گیا کہ مفتی کون ہوسکتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا:

> اللہ کے دین میں فتویٰ دینا صرف اسی کے لئے جائز ہے جو کتاب اللہ کا ماہر ہو، احادیث پر بھی اس کی نظر کامل ہو، قرآن و حدیث کی وضاحت کے لئے کام آنے والے دیگر فنون یعنی لغت وشعر کا بھی عالم ہو۔ان فنون کا پھر نہایت انصاف کے ساتھ استعمال کرتا ہو۔لوگوں کے اختلاف پر بھی اس کی نگاہ ہو اور استنباط کا ملکہ بھی رکھتا ہو۔جس شخص میں یہ اوصاف جمع ہوں وہ شریعت پر گفتگو کرنے اور حلال وحرام کے فتوے دینے کا اہل ہوسکتا ہے ورنہ نہیں۔ (اعلام الموقعین۔ص ۴۹)

امام احمدؒ سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

> ''جب کوئی فتویٰ دینے کے عہدے پر آنا چاہتا ہو تو اس کے لئے قرآن، احادیث اور ان کی اسانید۔ کا عالم ہونا ضروری ہے۔ورنہ اس کیلئے فتویٰ دینا جائز نہیں''۔

جو مفتی قرآن وحدیث سے استفتاء کا جواب مزین کرتا ہے اس کا فتوی اس قابل ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ ایسا فتوی جس میں غیر مستند کتب کے حوالے ہوں اور قرآن وسنت سے مستفاد نہ ہوں، ان کی حیثیت ایک رائے کی ہو سکتی ہے جسے مانا بھی جاسکتا ہے اور نہیں بھی بشرطیکہ معاملہ سخت نہ ہو۔ اکثر علماء نے مفتی کیلئے اجتہاد کی شرط ضروری قرار دی ہے یعنی وہ مجتہد ہو۔ اس صورت میں مقلد کے فتوی کو نہ فتوی کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے مفتی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسی شرط درست نہیں کیونکہ افتاء، علم فقہ کی ایک فرع (Branch) ہے۔ یعنی جس میں فقہاء نے جزئی واقعات کے بارے میں فروعی احکام بیان کئے ہیں تاکہ بعد میں آنے والے قوتِ استنباط سے محروم لوگ ان سے مستفید ہوسکیں۔ چونکہ اس میں کسی اجتہادی کاوش کا دخل نہیں اس لئے مقلد بھی مفتی ہوسکتا ہے۔

فتویٰ نویسی کا اسلوب: اسلاف میں فتوی نویسی یا افتاء کا اسلوب بہت سہل، مختصر اور سادہ تھا۔ واضح زبان اور تحریر میں گیرائی وگہرائی کے ساتھ جامعیت ہوتی تھی۔ مخاطب کی رعایت الدین یسر کی روشنی میں کی جاتی تھی۔ اولاً تو کوشش یہی ہوتی کہ صورت مسئولہ کی وضاحت کو قرآن مجید سے تلاش کر کے اسے حدیث رسول سے مزین کر دیا جائے۔ بصورت دیگر احادیث رسول سے سائل کی تشفی کرادی جاتی۔ صحابہ کرامؓ کے فتاوی ہمیں ایسے ہی نظر آتے ہیں۔ اسلاف کے اسی منہج کو سامنے رکھ کر فتویٰ نویسی کے اسلوب کو یوں متعین کیا جاسکتا ہے۔

☆...... جواب با حوالہ ہو۔ یعنی کتاب کا نام، جلد نمبر اور صفحہ نمبر بھی لکھا جائے۔

☆......حوالوں میں قرآن مجید اور احادیث رسول کو ہر صورت میں فوقیت ہو۔ کیونکہ سوال کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں فتوی طلب کیا جائے۔ یہ ناانصافی ہوگی کہ جواب خاص مکتب فکر کا دے دیا جائے۔

☆......احادیثِ رسول میں بھی صحیح احادیث کا انتخاب ہو۔ ضعیف احادیث واقوال علماء وفقہاء سے اجتناب کرنا چاہیے۔

☆......صحیح حدیث اگر مل جائے تو متأخر فقہاء کے تائیدی فتاوٰی بھی نقل ہوسکتے ہیں ورنہ حدیث پر ہی اکتفاء کیا جائے۔

☆......اگر صحیح حدیث نہ ہو تو ضعیف حدیث یا اقوال فقہاء کے مطابق فتویٰ ناگزیر صورت میں دیا جاسکتا ہے۔

فتویٰ نویسی کی ایک مختصر تاریخ: رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اہل اسلام کے لئے ایک ایسا سرچشمہ تھی جس سے وہ ہمہ وقت اپنی دینی ودنیاوی پیاس بجھاتے تھے۔ اچانک پیش آنے والا واقعہ ہو یا عرصہ بیشتر کا، اس کا حل آپ ﷺ سے ہی مانگا کرتے تھے۔ بعض اوقات آپ ؐ فوراً جواب عنایت فرمادیتے۔ اور اگر اس سلسلے میں کوئی ربانی

ہدایت نہ ہوتی تو وحی کا انتظار فرماتے۔ اور وحی کے بعد آپؐ سائل کو جواب دیتے۔ شرعی مسئلہ بتانے میں پیارے رسول ﷺ بھی بڑے محتاط تھے۔ آپؐ کے جوابات (فتاویٰ) وحی الٰہی سے ہی ہوتے تھے۔

رسول اکرم ﷺ کے فتاوی کو اگر بغور دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ ﷺ نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ بہت ہی مختصر الفاظ میں بیشمار احکامات کو سمو دیا ہے۔ یہ الفاظ بڑی گہرائی و گیرائی رکھتے ہیں۔ یہ فتاوی آپ ﷺ کی پیروی کرنے' انہیں فیصلہ کن ماننے' اور اپنے تمام تر جھگڑوں اور اختلافات کو مٹانے وختم کرنے میں قرآن کی مانند ہیں۔ آپؐ کے بعد منصب فتویٰ پر آپؐ کے اصحاب فائز ہوئے جو اسلام کے ستون اور کلام اللہ وسنت رسول اللہ کی عملی تصویر تھے۔ طہارت قلب، وسعت علم، بے تکلفی اور واضح نقطہ نظر رکھنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ دین کے سب سے زیادہ سچے خیر خواہ، خدا ترسی میں یکتا یہ بندگان خدا فتوی دینے میں بھی بہت محتاط تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دین میں وسعت پیدا کرنے اور حد درجہ احتیاط سے قدم اٹھانے کا کام ان سے لیا۔ انکی تعداد ایک سو تیس سے کچھ اوپر تھی جن میں خواتین بھی تھیں۔ إعلام الموقعین میں امام ابن القیمؒ نے ان کا مختصر حال لکھا ہے۔

یہ سب حضرات زبانی اور تحریری دونوں طریقوں سے فتوی جاری کرتے تھے۔ مدینہ سے باہر جہاں بھی رہے لوگ اپنے مسائل انہی کے پاس لاتے۔ مزید برآں سنت رسولؐ سے واقف ہونے کے لئے بھی ان کے حلقوں سے مستفید ہوتے۔ یہ سلسلہ تقریباً حضرت انسؓ بن مالک کی وفات یعنی پہلی صدی ہجری کے آخر تک چلتا رہا۔

تابعین کے دور میں فتویٰ: اسی دوران تابعین کی ایک نسل تیار ہو کے اپنی علم وفضل سے دنیا کو نواز رہی تھی۔ ان میں انہی حضرات صحابہؓ کے شاگردوں میں سعید بن المسیب، عروۃ بن الزبیر و دیگر فقہاء شامل ہیں۔ جنہیں فقہاء سبعہ کہا جاتا ہے۔ جن کو منظوماً کسی نے یوں پیش کیا گیا ہے۔

إِذَا قِيْلَ مَنْ فِي الْعِلْمِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ　　رِوَايَتُهُمْ لَيْسَتْ عَنِ الْعِلْمِ خَارِجَةٌ

فَقُلْ هُمْ عُبَيْدُ اللّٰهِ، عُرْوَةُ، قَاسِمٌ　　سَعِيدٌ، أُبُوبَكْرٍ، سُلَيْمَانُ، خَارِجَةُ

جب تم سے یہ پوچھا جائے کہ علم کے وہ سات سمندر کون ہیں جن کی روایت ہی یقین واذعان بخشتی ہے۔ تو تم کہو وہ حضرات عبیداللہؒ، عروہؒ، قاسمؒ، سعیدؒ، ابوبکرؒ، سلیمانؒ اور خارجہؒ ہیں۔

ان سات فقہاء کے علاوہ دیگر تابعین بھی مفتی تھے۔ جنہوں نے اپنی علمی وسعت وبصیرت کی وجہ سے جگہ جگہ اس خلا کو پر کیا۔ مکہ، بصرہ، کوفہ، شام، مصر اور یمن میں یہ سب لوگ اس منصب پر فائز معاشرے کی دینی واصلاحی راہنمائی

میں مصروف رہے۔ ان تمام کا منہج فتوی وافتاء قرآن وسنت کے بعد صحابہ کرامؓ کے اجماعی فیصلے اور بعد میں انفرادی فتوؤں پر مبنی تھا۔ اپنی بات یا کلام لکھے جانے کو بہت مکروہ سمجھتے تھے۔ اور اس پر بڑی سختی سے قائم تھے۔ یہ مسلک بھی تھا کہ فتوی پایا اور اس کے خلاف صحابہؓ میں سے کسی کا فتوی نہیں ہے۔ تو بس اسی پر قناعت کر لی جائے۔ اور اپنی اجتہادی کوشش سے باز رہا جائے۔

زمانہ خیر کے بعد فتوی: دوسری صدی ہجری میں قرون اولیٰ کے اس منہج میں اہل علم کے درمیان کچھ اصولی اور عقلی بنیادوں پر اختلافات رونما ہوئے۔ اس طرح اصولی نقطہ نظر کی تبدیلی سے فقہاء کے درمیان دو گروہ ہو گئے۔

① وہ گروہ جو استنباط مسائل میں یا افتاء میں احادیث وفتاوی صحابہؓ کی بنیاد پر فتوی دیتا تھا اور مفروضہ مسائل میں شرعی حکم بیان کرنے سے مجتنب تھا۔ یہ محدثین کی جماعت تھی جس میں حجازی علماء وفقہاء کی غالب اکثریت تھی۔

② دوسرے گروہ کے نمائندے فقہاء عراق تھے جن کی غالب اکثریت تھی جنہوں نے بعض قواعد بنائے اور انہی کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل اور مستقبل میں پیش آنے والے مسائل کو مفروضی شکل میں تحریر کر دیا۔ اس کی وجہ غالباً یہی بیان کی جاسکتی ہے کہ اہل عراق کے ان فقہاء کے پاس صحیح احادیث کم تھیں۔ باقی موضوع احادیث کیلئے تو عراق ایک ٹکسال تھا۔ یہ فقہاء کسی بھی حدیث کو قبول کرنے میں محتاط تھے اس لئے ان کے ہاں رائے اور قیاس کا استعمال بکثرت تھا۔ جنہیں بعد میں کتب فقہ میں اور کتب فتاوی میں جگہ دے دی گئی۔

بعد کی نسلوں میں انہی کے متبعین اور مقلدین نے اپنے اپنے مسلک کی توجیہ وتائید میں کتب لکھیں۔ اور یوں دو انتہائیں سامنے آگئیں۔ ایک نصوص میں اتنا منہمک ہوا کہ تفقہ نظر انداز ہو گیا اور دوسرا اصول وفروع میں اتنا گم ہوا کہ نصوص اسے نظر نہ آئیں۔ انہی میں کچھ ایسے مجتہدین بھی ظاہر ہوئے جنہوں نے نصوص اور تفقہ کو باہم ساتھ لیا اور جمود وسابقہ منہج آراء وقیاس سے آزاد ہو کر سلف صالحین کے اس منہج کو اپنایا جو اجتہادی تھا۔ انہوں نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کا علاج کیا اور بخوبی کیا۔ اس طائفہ کے سرخیل شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ تھے۔ ان کے اس طریقہء کار کا اثر مصر وشام اور دیگر بلاد عربیہ پر خاصا ہوا۔ ایسی روشن فکر نے جمود وقیاسات کی دیواریں توڑ دیں اور ہر جگہ نصوص وتفقہ سے استفادہ کا رجحان بڑھا اور بہتر نتیجہ دیکھنے میں آیا۔

خلافت عثمانیہ نے جب ۱۲۸۶ھ میں **مجلة الاحكام العدلية** کی تدوین کی تو پہلی بار مذاہب اربعہ سے ہٹ کر بعض مسائل میں امام ابن شبرمہ کے مسلک پہ فتوی بھی دیا گیا۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۶ء میں مصر نے بھی اسی ڈگر پہ چلنے کی

کوشش کی۔ برصغیر میں بھی بڑے بڑے علماء نے اپنے اپنے مسلک سے ہٹ کر دیگر مسالک پر فتوے دیے۔ اور اس کی تائید میں کتب لکھیں۔ جن میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شامل ہیں اور ان کی اولاد و تلامذہ کی کثیر تعداد شامل ہے۔ پاکستان میں بھی بیشتر عائلی مسائل کا نفاذ انہی اجتہادی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جن میں اکثر مستحسن ہیں اور بعض دین سے جہالت پر مبنی اور خواہشات کا پلندہ ہیں۔

افتاء کی نوعیتیں: اسلاف میں افتاء کی نوعیتیں۔ وقت، زمانہ اور تحقیق کے اعتبار سے بدلتی رہیں۔ کہیں اجتہاد ہوا تو سابقہ مسائل نظر انداز کرنا پڑے۔ یا ان کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ کہیں دلیل ملی تو اپنی سابقہ رائے سے رجوع کرنا پڑا اور کہیں اپنے محترم استاد کی رائے سے بھی مختلف رائے اس معذرت کے ساتھ دینا پڑی کہ اگر آج میرے استاد بھی حیات ہوتے تو اس دلیل اور حجت کو پا کر اپنی رائے سے رجوع کر لیتے۔ یہ سب انداز، کتب فقہ میں اور ہم عصر فقہاء کی کتب فتاویٰ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

مگر ہمارے یہاں فتویٰ کی ایک اور قسم رائج ہو گئی ہے جو یقینی طور پر غیر شرعی ہے۔ کہ فلاں ملک اسلام دشمن ہے یا فلاں شخص فلاں دشمن کا ایجنٹ ہے اس کی مصنوعات کو خریدنا جائز نہیں وغیرہ۔ یہ دوسری قسم کا فتویٰ حقیقتاً فتویٰ نہیں وہ یک طرفہ طور پر ہدایت جاری کرنا ہے اور اس قسم کی ہدایت جاری کرنے کا اختیار ایک قائم شدہ حکومت کو ہے نہ کہ کسی مفتی کو۔

فتویٰ کا دائرہ اور اس کی اہمیت: فتوی کی ہمارے دین میں غیر معمولی اہمیت ہے۔ اس لئے کہ جس فتویٰ کو علم وصداقت سے صادر کیا جائے وہ ایک حجت ہے۔ جس کے بعد آدمی کے پاس کوئی عذر نہیں رہتا۔ مگر اسے قانوناً نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا دائرہ انتہائی محدود ہے۔ اس لئے کہ فتوی شریعت کے جزئی یا غیر منصوص معاملے میں صرف ایک عالم کی رائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کسی بھی حال میں قضاء کا قائم مقام نہیں بن سکتا۔ یہ دراصل دونوں جانب یعنی مفتی اور مستفتی کی خدا خوفی کا معاملہ ہے۔ خدا خوفی نہ ہو تو مفتی، قاضی سے بھی زیادہ گناہ گار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مفتی کو فی الفور جواب دینا پڑتا ہے اور قاضی کو سوچنے اور غور کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ قاضی کی بہ نسبت مفتی زیادہ سلامت رہتا ہے۔ مفتی اپنے فتوے کو لازم و نافذ تو نہیں کرتا صرف وہ سائل کا جواب دیتا ہے۔ جو اگر چاہے تو قبول کر لے یا رد کر دے۔ مگر قاضی کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے اور نافذ بھی۔ مزید یہ کہ قاضی کے حق میں جو وعید آئی ہے وہ مفتی کے حق میں نہیں۔ اس لئے مفتی کو فتوی دیتے وقت قاضی بننے کی جسارت نہیں کرنی

چاہیے۔

مذہبی بنیاد پر دیا جانے والا فتوی جس میں آراء وقیاس یا بزرگوں کی باتیں ہوں۔ ہمیشہ تعصب پر مبنی فتوی ہوتا ہے۔ جسے ایک معتدل آدمی ماننے سے انکاری ہوتا ہے۔ مفتی کو چاہئے کہ وہ فتویٰ دیتے وقت سائل کے مسئلے کو سمجھے اور اپنے مسلکی خول سے باہر آ کر دیگر فقہاء کرامؒ کی آراء سے بھی سائل کو آگاہ کرے۔ اور پھر بعد میں جو حق کے قریب بات ہو اس کی روشنی میں جواب دے۔ ہمارے ایک معاصر دانش ور نے کتنا صاف ستھرا تجزیہ کیا ہے ان کا کہنا ہے:

> یاد رکھئے! فتوی شریعت کی عملی صورت نہیں وہ کسی جزئی معاملہ میں ایک عالم کی رائے تو ہو سکتی ہے جو صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔ شریعت مقدس ہے مگر فتوی مقدس نہیں خواہ وہ کتنے ہی بڑے عالم کا فتوی ہی کیوں نہ ہو۔ نیز ایسے مفتی کو ہمیشہ امام شافعیؒ کا یہ قول یاد رکھنا چاہئے کہ ہماری رائے درست ہے احتمال خطاء کے ساتھ اور دوسروں کی رائے خطا ہے احتمال صحت کے ساتھ۔ مثال کے طور پر امام ابوحنیفہؒ نے فتوی دیا کہ ایک غیر عربی داں ایرانی نومسلم نماز میں سورہ فاتحہ فارسی زبان میں پڑھ سکتا ہے صاحبین (قاضی ابویوسف اور امام محمد) نے اس سے اختلاف کیا بعد کو امام ابوحنیفہؒ نے اپنے قول سے رجوع کر لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فتوی اپنے آخری درجہ تک پہنچ کر بھی صرف ایک انسانی رائے ہے۔ وہ کسی بھی درجہ میں مقدس شریعت کا کوئی لازمی حصہ نہیں۔ شریعت کی حقانیت کو جانچنے کا معیار اللہ و رسول کا کلام ہے۔ کوئی انسانی کلام اس کا معیار نہیں بن سکتا، کیونکہ انسان کا کلام ایک اضافی کلام ہے وہ غلط بھی ہو سکتا ہے اور درست بھی۔

فتاویٰ کی تاریخی اہمیت: گو کتب فتاوی، فقہاء کے ہاں تیسرے درجے کی کتب شمار ہوتی ہیں۔ مگر ان فتاوی کی بلاشبہ اہمیت غیر معمولی ہے۔ مثلاً:

- ماضی کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کے سماجی، سیاسی، تمدنی اور فکری حالات کا علم ہوتا ہے۔
- فتاویٰ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کو کب اور کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور فقہاء وقت کا موقف کیا رہا۔
- ہر زمانہ وعلاقے کے رسم ورواج اور مروجہ بدعات وخرافات کی تصویر بھی ان کتابوں سے نظر آتی ہے۔
- علماء کے فتاویٰ پر عوام کا ردعمل کیا ہوتا تھا۔
- مفتیان کرام کی سلاطین وامراء اور طلبہ وعوام سے تعلقات کیسے تھے۔
- ہر زمانے میں کن علماء کو فتویٰ نویسی یا افتاء کے مناصب ملے یا شہرت نصیب ہوئی۔
- ان کے علم وفہم اور بصیرت کا کیا حال تھا۔

اسی طرح دیگر اہم باتیں جو تذکرہ نگاری اور سوانحی خاکوں کی مددگار ہو سکتی ہیں۔

آج کے فتاویٰ: ہمارے یہاں ہر مسلک کے فتاوی میں مسلکی چھاپ نمایاں ہوتی ہے۔ اور اسی نقطہ نظر کی تائید کیلئے اپنے مسلک کی فقہی کتب سے اقتباسات ماخوذ ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں مسئلے کی مختلف صورتیں اور ان کے مختلف جوابات تحریر کئے جاتے ہیں۔ اور بعض فتاوی میں جواب کی علت بتانے کے لئے قیاس اور عقلی توجیہات کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔ مگر عموماً کتاب وسنت سے نصوص پیش کرنے کا اہتمام کم ہی ہوتا ہے۔ اگر کہیں احادیث کا ذکر ہوتا بھی ہے تو:

اولاً: ان میں صحیح، ضعیف اور مرفوع وموقوف کے درمیان کوئی تمیز نہیں ہوتی۔

ثانیاً: صحیح حدیث اگر ہو بھی سہی تو اس کا استدلال غیر محل میں ہوتا ہے۔

ثالثاً: سارا زور مذہب کے مطابق مسائل کی تخریج یا اپنے مسلک کے مختلف علماء کے متعارض اقوال کے درمیان تطبیق وترجیح میں صرف ہوتا ہے۔ حالانکہ ان اقوال میں باہم اتنا اختلاف ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

رابعاً: دوسرے مذاہب کے علماء کے اقوال دلیل کے بغیر درج کر دیے جاتے ہیں۔ ان پر تسلی تب ہوتی ہے جب ان مآخذ کی طرف رجوع کر لیا جائے۔

ایسے فتوے عموماً مذہبی بنیادوں پر دیے جاتے ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ اپنے مذہب کا آدمی اسے قبول کر لے مگر یہ اپنی افادیت کھو بیٹھتے ہیں۔ تفریق بین المسلمین کا سبب بھی بنتے ہیں۔ مفتی کا رعب ودبدبہ بھی فروعی مسائل میں پڑ کے جاتا رہتا ہے۔ ایسے فتویٰ کی حیثیت کیا باقی رہ جاتی ہے وہ عوام کی توجہ یا عدم توجہ پر یا ردعمل پر مبنی نتیجہ ہوتا ہے۔ جسے مفتی حضرات خود جان لیتے ہیں۔ اس لئے خواہ کسی کی رائے سے بھی ہو، اور اس میں مذہبی عصبیت کا عنصر بھی ہو ایسا فتوی بالکل نہ دیا جائے ورنہ وہ ایک مذموم کوشش ہوگی۔ ہاں مفتی اگر بے بس ہو جائے تو بوقت ضرورت اجتہاد کر کے رائے سے کام نکال لے۔ لیکن کسی کو یہ مت کہے کہ اس کا ماننا لازم ہے اور نہ ہی اس پر عمل ضروری بتائے۔ حضرت عمرؓ نے قاضی شریح کو یہ لکھا:

جب کوئی مسئلہ آپ کتاب اللہ میں پالیں تو اسی کے مطابق فیصلہ دیجئے۔ دوسری طرف توجہ ہی نہ کیجئے۔ پھر سنت کو ٹٹولیے ان دونوں میں نہ ملے تو جہاں صحابہؓ اجماع کریں اس سے فیصلہ کیجئے۔ اور اگر اتفاق سے ایسا مسئلہ سامنے آ جائے جس کا ذکر نہ قرآن میں ہو اور نہ ہی حدیث میں اور نہ ہی آپ سے پہلے کسی نے اس مسئلہ میں گفتگو کی ہو۔ اس صورت میں اگر آپ چاہیں تو اپنی رائے سے اجتہاد کر لیجئے اور اگر توقف کر سکیں تو ضرور کیجئے۔ میرے نزدیک آپ کا

پیچھے ہٹ جانا بہ نسبت آگے بڑھنے اور اجتہاد و رائے دینے کے زیادہ بہتر ہے۔

امام احمدؒ نے امام شافعیؒ سے سوال کیا کہ رائے و قیاس کی بنا پر کچھ کہنا کہاں تک جائز ہے؟۔انہوں نے جواب میں کہا: بوقت ضرورت، بقدر ضرورت، نہ زائد اور نہ ہی اسے شاخ در شاخ لے جانا جائز، نہ اسے پھیلانا جائز اور نہ اسے بڑھانا جائز۔یہی سلف کا طریقہ رہا۔(اعلام الموقعین۔ص ۶۲) سائل کو بھی علماء نے یہ نصیحت کی ہے کہ وہ مفتی سے سوال کرتے وقت کچھ معیارات ضرور قائم کرے۔مثلاً: مسئلہ پوچھنے والا اپنے عالم سے گزارش کرے کہ براہ مہربانی مجھے اس مسئلے کا جواب قرآن وسنت کی رو سے دیا جائے اور دوسرے ائمہ حضرات کی رائے سے بھی مطلع فرمائیں تاکہ میں اپنی سہولت کے مطابق جس کی رائے پر چاہوں عمل کرسکوں۔علماء کو بھی چاہیے کہ وہ دیانتداری سے سب کی آراء پوچھنے والے کو بتادیں۔اس طرح وہ خود بھی خطأ کے احتمال سے محفوظ رہیں گے۔

مفتی بدلتا رہے: شرعی مسائل کی صحیح معلومات کے لئے اور دوسرے علماء وفقہاء کے علم سے مستفید ہونے کے لئے سائل ضرور اپنے مسئلے کے بارے میں دو تین مفتی حضرات کی رائے لے لے۔تاکہ کسی کے محدود علم میں خود محدود نہ ہو جائے۔ پہلے لوگ مفتی کیا مجتہد بھی بدل دیا کرتے تھے۔صحابہ کرامؓ ہوں یا بعد کے اسلاف ان کی اکثریت متفق تھی کہ اگر فقہاء وعلماء موجود ہوں تو کسی سے بھی فتوی لیا جاسکتا ہے۔شرح مسلم الثبوت:۶۳ میں ہے:

> أَجْمَعَ الصَّحَابَةُ عَلَى أَنَّ مَنِ اسْتَفْتَى أَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ أَمِيرَيِ الْمُؤمِنِينَ فَلَهُ أَنْ يَسْتَفْتِيَ أَبَا هُرَيْرَةَ وَمُعَاذَبْنَ جَبَلٍ وَغَيرَهُمَاوَيَعْمَلَ بِقَوْلِهِمْ مِنْ غَيرِ نَكِيرٍ۔ یہ اجماع صحابہ ہے کہ کوئی اگر حضرات ابوبکر وعمر جو اہل ایمان کے امیر ہیں۔ان سے فتوی پوچھے تو وہ حضرت ابوہریرۃ اور حضرت معاذ بن جبل اور ان کے سوا دوسروں سے فتوی پوچھ کر بھی بغیر کسی ملامت کے عمل کرسکتا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں:

> قَالَ ابْنُ الْهُمَامِ فِي آخِرِ التَّحْرِيرِ: كَانُوا يَسْتَفْتُونَ مَرَّةً وَاحِدًا وَمَرَّةً غَيرَهُ، غَيرَ مُلْتَزِمِينَ مُفْتِياًوَاحِداً۔ ابن الہمام۔التحریر۔کے آخر میں لکھتے ہیں: لوگ کبھی کسی سے فتوی پوچھتے تھے اور کبھی کسی سے۔کسی ایک مفتی کا التزام نہیں تھا بلکہ بدلتے رہتے تھے۔

احناف میں بھی قدرے اس پر عمل ہے۔ردالمختار میں لکھا ہے: عبادات میں فتوی ہمیشہ امام ابوحنیفہؒ کے قول پر ہوگا۔ مسائل ذوی الارحام میں امام محمدؒ کے قول پر اور مسائل وقف، قضاء اور شہادات میں امام ابویوسفؒ کے قول پر اور سترہ

مسئلوں میں امام زفرؒ کے قول پر فتویٰ ہوگا۔ مگر امام صباغیؒ حنفی اس کے خلاف ہیں۔ وہ نماز میں امام ابو حنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیا کرتے، باقی مسائل خواہ عبادات ہوں یا غیر عبادات سب میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔ (رد المختار۔ جلد ۱/۵۳، ۱۶۱ جلد ۳/۴۰۵)

غلط فتویٰ کی سنگینی: مفتی۔ فتوی دینے سے قبل جانبین کے حالات کا بھی اچھی طرح جائزہ لے۔ محض سائل کے سوال پر اکتفاء کر کے فتوی دینے کا شوق پورا نہ کرے۔ کیونکہ **شنیدہ کے بود مانند دیدہ** والی بات ہی کچھ اور ہے۔ اس میں مفتی کا بھی شرح صدر ہوتا ہے اور فریق ثانی بھی مفتی کے مقام اور تقدس کا احترام کرتا ہے۔ ورنہ مفتی حضرات کی سادگی فریق ثانی پر جب نمایاں ہوتی ہے تو مقام و احترام تو کجا لوگ دین کو اور اہل دین کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہ اسلام کا طریقہ نہیں کہ کوئی شخص محض کسی کی مخالفت میں ذہن میں کوئی بات لائے۔ اس کو سوال بنائے یا اس قسم کا ایک مضمون استفتاء کیلئے بنائے کہ:

فلاں دار العلوم یا مثلاً الھدیٰ میں پڑھنا، یا ان سے مالی تعاون کرنا جائز ہے یا ناجائز۔ اور پھر مفتی صاحبان اس پر الجواب صحیح کی مہر کے ساتھ تفصیلی جواب دینا شروع کر دیں۔ اور جسے چاہیں چھری سے ذبح کرنا شروع کر دیں۔ عموماً ایسے فتووں میں مصیطر بننے کی کوشش کی جاتی ہے جو انتہائی نامناسب ہے۔ اولاً تو اس قسم کا سوال پوچھنا بھی اسلامی روح کے خلاف ہے اور اس کا جواب دینا بھی اسلامی روح کے خلاف۔ صحابہ و تابعین کی مثال بتاتی ہے کہ وہ حاکمانہ ہدایات کبھی جاری نہیں کرتے تھے۔ اس کی بجائے وہ دعوت و تبلیغ کا کام کرتے تھے مثلاً لوگ اگر سنت رسول کو چھوڑ رہے ہوں یا خواتین کو بے حجاب کیا جا رہا ہو یا انہیں فحاشی میں مبتلا کرنے کی کوشش ہو رہی ہو تو صحابہ و تابعین کی سنت کے مطابق، ایسے لوگوں میں دعوت و تبلیغ کا کام کرنا چاہئے نہ کہ بائیکاٹ کا فتوی صادر کرنا چاہئے۔ نتیجہ کے اعتبار سے اس قسم کا فتوی سراسر لا حاصل ہے۔ انسان کی اصلاح قلب و ذہن کے بدلنے سے ہوتی ہے نہ کہ فتاویٰ جاری کرنے سے۔ اسی طرح دیگر غلط فتوے جو حقائق کو چھپا کر یا تلبیس کے ساتھ دیئے جاتے ہیں ان سے بھی مفتی باز رہے۔ سنن أبی داوٗد میں ہے۔

مَنْ قَالَ عَلَيَّ مَالَمْ أَقُلْهُ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ ﴿ جو شخص میرے نام سے وہ بات کہے جو میں نے کہی نہیں وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔

لاعلمی پر فتویٰ دینا ایک سنگین گناہ ہے۔ علم کے ہوتے ہوئے غلط فتویٰ دینا اس سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اگر کوئی

اپنے مسلمان بھائی کا بھلا کسی اور چیز میں دیکھتا ہے مگر اسے غلط اور الٹا مشورہ دیتا ہے تو یہ بہت بڑی بددیانتی ہے۔ اس لئے جتنا خطرہ مفتی کو اس سلسلے میں ہوتا ہے قاضی کو بھی ہوسکتا ہے۔ مگر مفتی کے فتوی کی سنگینی اس اعتبار سے بڑھ جاتی ہے۔ کہ اس فتوی کا مستفتی۔ اور عوام دونوں پر اثر ہوتا ہے۔ جس پر وہ کسی بھی وقت عمل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا جس طرح صحیح فتوے کا اجراء ثواب میں بہت بڑا اجر رکھتا ہے اسی طرح غلط فتوے کا اجراء گناہ اور برے نتائج میں بھی بڑا گہرا اثر رکھتا ہے۔ فتوؤں میں بغیر علم کے زبان کھولنا قرآنی آیات کی رو سے تمام حرام کاموں میں سب سے بڑھ کر حرام کام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قل انما حرم ربي الفواحش ماظهر منها.....وأن تقولوا على الله مالا تعلمون○﴾
کہہ دیجئے بلاشبہ میرے رب نے تمام ظاہری اور باطنی فحش کو حرام قرار دیا ہے... اور یہ بھی کہ اللہ پر وہ باتیں چھانٹی جائیں جو تم نہیں جانتے۔

اس باب میں حرمتوں کی ترتیب درج ذیل ہے۔

- فحش کام حرام ہیں۔ (سب سے ہلکا گناہ)
- گناہ اور ظلم کرنا۔ (ذرا بڑا گناہ)
- اللہ کے ساتھ شرک کرنا۔ (اس سے بڑا گناہ)
- اللہ کا نام لے کر وہ بات کہنا جس کا علم نہ ہو۔ (سب سے بڑا گناہ)

خواہ وہ بات اللہ کے نام یا صفات سے متعلق ہو یا اس کے کام سے۔ یا اس کے دین اور اس کی شریعت کے کسی بھی معاملے میں وہ بات ہو، سب سے بڑا جرم ہے اور سب کو شامل ہے۔ ایک اور آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿و لا تقولوا لما تصف ألسنتكم الكذب......﴾ اپنی زبان سے جھوٹ موٹ اللہ پر بہتان باندھ کر نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔ یاد رکھو! اللہ پر جھوٹ باندھنے والے نجات سے محروم رہتے ہیں۔

یہ وعید ہے ان حضرات کے لئے جو اللہ کے احکام میں جھوٹ اور غلط بات شامل کر دیتے ہیں۔ یا خود سے غلط تاویلات کر کے اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ آدمی کو اللہ کے حرام وحلال کا علم نہ ہو تو اسے کسی بھی صورت میں کسی چیز کو حلال یا حرام نہیں کہنا چاہئے۔ یہ کلمات کہ: اسے اللہ نے حرام کیا ہے یا یہ شریعت میں حلال ہے۔ وغیرہ۔ کہنے سے حتی الامکان اجتناب کرنا چاہئے ورنہ ایسا آدمی اللہ کی نظر میں جھوٹا اور ظالم ہے۔ چونکہ تقویٰ، احساس ذمہ داری، محتاط گفتگو، عدم تعصب، علم وبصیرت جیسی صفات ہمارے مفتیان اسلاف میں بدرجہ اتم موجود

تھیں۔اس لئے پہلے مفتیان کرام میں اور آج کے مفتیوں میں بڑا فرق ہے۔ جو فضیلت اسلاف کو حاصل تھی اس سے آج کے مفتی محروم ہیں۔اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰهُ۔

اختلاف اقوال اور فتوی: اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کہ مسلم علماء وفقہاء کے ہاں ہر دور میں اجتہاد ہوا ہے۔ ان اجتہادی کوششوں میں آپس میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ بعد کے ادوار میں بھی ایسا ہو رہا ہے۔اس لئے فتویٰ دینے میں فقہاء کے مختلف اقوال واجتہادات مفتی کے سامنے آجائیں تو ایسی صورت میں مفتی کو کیا کرنا چاہئے؟ مولانا عبدالحی لکھنویؒ امام الکلام میں فرماتے ہیں:

﴿مَنْ نَظَرَ بِنَظَرِ الإنْصَافِ وَغَاصَ فِي بِحَارِ الْفِقْهِ وَالأُصولِ مُتَجَنِّباً عَنِ الاعْتِسافِ، يَعلمُ عِلماً يقينيا أن أكثرَ المسائلِ الفرعيةِ والأصليةِ التي اختلَف العلماءُ فيها۔ فَمذهبُ المحدثينَ فِيها أقوىٰ مِن مذاهبِ غيرِهم وإنّي كُلَّمَا أَسِيرُ فِي شُعَبِ الاختلافِ أجدُ قَولَ المحدثين فيهِ قَريباً مِن الانصافِ ، فللّهِ دَرُّهُم عَليه شُكرُهُم۔ كيف لا! وَهُم وَرَثَةُ النبيِّ ﷺ ونُوّابُ شريعتِهِ صِدْقاً، حَشَرَنَا اللّٰهُ فِي زُمْرَتِهِم، وَأَمَاتَنَا عَلَى حُبِّهِمْ وَسِيْرَتِهِمْ﴾ جو نظر انصاف رکھتا ہے اور کتب فقہ واصول کے سمندروں میں غوطہ زن ہوتا ہے وہ یقیناً جان لے گا کہ بیشتر فروعی واصولی مسائل میں علماء کا اختلاف ہے۔ لہٰذا محدثین کرام کا نکتہ نظر ہی اوروں کے نقطۂ نظر سے قوی تر ہوتا ہے۔ میں جب بھی اختلافی مسائل سے گزرتا ہوں تو مجھے محدثین کا فیصلہ ہی انصاف کے قریب ترین نظر آتا ہے۔ بخدا ان کا کیا کہنا، اللہ ہی ان کو جزا دے گا۔ وہ کیوں نہ دے یہی تو سچے وارث نبی ہیں اور شریعت کے کھرے نمائندے۔ اللہ ہمارا حشر ان کے ساتھ کرے اور ان کی محبت وسیرت پر ہی ہمیں دنیا سے اٹھائے۔

☆☆☆☆☆

آخری گذارش

ہمارے علماء ودانشور حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ صراط مستقیم وہی ہے جس پر جناب رسالت مآب ﷺ چلے۔

﴿ وأن هذا صراطي مستقيما فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله، ذلكم وصيكم به لعلكم تتقون﴾۔ (الأنعام:۱۵۳) نیز اس کی یہ بھی ہدایت ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر مت چلو کہیں وہ تمہیں اس کی راہ سے بھٹکا نہ دیں۔

آپ ﷺ ہی اللہ کے پیامبر، اس کے احکام کے شارح، اسی کی شریعت کے حامل اور اس کے محرم راز و مفسر تھے تو کیا یہی کافی نہیں کہ تمام راہوں کو چھوڑ کر آپ ﷺ ہی کا بتایا ہوا صراط مستقیم ہی اپنا لیا جائے جس میں کوئی پیچ و خم نہیں اور جس میں کوئی کمی نہیں جب کہ دوسرے راستے اختیار کرنے سے منع فرمایا جن میں پڑنے سے آدمی بھٹک جاتا ہے، ہدایت گم ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم نے جناب سیدنا علیؓ، امام ابوحنیفہؒ، بریلی اور دیوبند وغیرہ مقامات و شخصیات کے نام سے جو فرقے اور مسلک ایجاد کئے ہیں ان کا جواز کیا ہے؟۔ کون سی ایسی ضرورت پڑ گئی کہ ایسے مسالک کا ایجاد کرنا امت کیلئے ناگزیر ہو گیا؟ آیات و احادیث اور ائمہ کرام کے بے شمار اقوال وغیرہ تو ان فرقوں کی تردید میں مل جاتے ہیں مگر ان کا جواز آخر کہاں سے لیا گیا؟ مزید یہ چند باتیں بھی قابل غور ہیں:

☆...... کیا ہماری اس محبت و عقیدت کا یہ غلو کہیں لوگوں کی نظر میں دیگر غیر معصوموں کو معصوم تو نہ بنا دے گا۔ کہ وہ غیر نبی کو معصوم قرار دے کر اسے بھی نبی بنا لیں یا نبی کا درجہ دے بیٹھیں۔

☆...... کیا ہم نے یہ سوچا کہ ان شخصیات کو معصومیت کا درجہ دے کر کہیں انہیں رسول اکرم ﷺ کے مقابل تو کھڑا نہیں کر دیا؟ اگر انہیں معصومیت کا مقام ہی دینا ہے تو پھر مرزا غلام احمد قادیانی کذاب کے دعوے کو اور اس کے چیلوں کو اور اباحیت و تجدد کی آڑ میں قرآن مجید کی من مانی تاویل کرنے والوں کو اور رسولِ اکرم ﷺ کی احادیثِ پاک کے منکروں کو اور آپؐ کی سیرت سے نفرت کرنے والوں کو ہم کیوں کافر قرار دے رہے ہیں اور انہیں کیا دلائل فراہم کر رہے ہیں؟

☆...... ہم نے غور کیا: کہ ایک فرقہ سے نکلنے والے کئی فرقے، ان کے منتشر افکار اور ایک دوسرے کے خلاف تکفیری فتوے، کیا یہ سب کچھ رحمت ہے یا زحمت؟

☆...... ہم نے سوچا کہ یہ قرآن مجید کا ہمارے لئے پہلا اور زندگی کا آخری درس ہے: کہ

﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝﴾ نہ تم مرو مگر مسلم ہو کر۔ (آل عمران: ۱۰۲)

مگر یہ کہاں کہا ہے کہ:

"ولا تموتن إلا وأنتم حنفيون" نہ تم مرو مگر حنفی بن کر۔

"ولا تموتن إلا وأنتم جعفريون" نہ تم مرو مگر جعفری بن کر۔

"ولا تموتن إلا وأنتم ديوبنديون" نہ تم مرو مگر دیوبندی بن کر۔

"ولا تموتن إلا وأنتم وهابيون" نہ تم مرو مگر وہابی بن کر۔

"ولا تموتن إلا وأنتم بريلويون" نہ تم مرو مگر بریلوی بن کر۔ وغیرہ

ہماری اہل درد سے ہمدردانہ درخواست ہے کہ ان فرقوں اور ناموں کو خیر باد کہنے کی قربانی دیں۔ جس کی اللہ کے نزدیک بہت بڑی قیمت ہے۔ اور یہی وقت ہے قربانی دینے کا، تاکہ تھکی ماندی، اور شکست خوردہ امت کو مزید انتشار سے بچایا جاسکے اور دشمن کا ترنوالہ بننے سے مسلمان محفوظ ہوں۔ اسلئے کہ رب ذوالجلال کی عدالت میں معاملہ بڑا سخت ہے۔ اگر وہاں یہ پوچھ لیا گیا کہ میرے رسول ﷺ نے دین کیا دیا تھا اور اُمتیوں نے اس کے حصے بخرے کر کے اسے کیا بنا دیا۔ آخر کیا جواب ہوگا ہمارے پاس؟

☆۔ نیز قرآن کی اس آیت کو ہم ﴿واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا﴾ کے سیاق (Context) میں ضرور پڑھیں اور سوچیں کہ جو مسلم اتفاق واتحاد کو پارہ پارہ کر کے مختلف گروہوں میں بٹ کر جینا چاہتے ہیں روز قیامت ان کا کیا حشر ہوگا۔ آیئے! غور کریں کہ ایسی صورت میں ہم اللہ کی نظر میں کیا ہیں؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ۝﴾ (آل عمران:۱۰۶) جس دن کچھ چہرے سفید ہونگے اور کچھ کالے۔ رہے وہ جن کے چہرے کالے ہونگے (انہیں کہا جائیگا) کیا تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا تھا۔ لہٰذا اپنے کفر کی پاداش میں اس عذاب کو چکھو۔

سوچیئے کیا عذر ہوگا ہمارے پاس اس کفر کا؟

☆۔ اسی طرح ایک مسلمان جب مرتا ہے تو بمصداق حدیث رسول ﷺ اس سے قبر میں منکر نکیر (دو فرشتے) تین سوالات کرتے ہیں جن میں ایک سوال یہ بھی ہے :

مَا دِيْنُكَ؟ تیرا دین کیا ہے؟

اگر مرنے والے کا جواب "ديني الإسلام" میرا دین اسلام ہے۔ تو اس کی نجات ممکن ہے۔ اور اگر اس کا جواب یہ ہے کہ میرا دین شیعہ ہے، حنفی ہے، وہابی ہے یا دیوبندی، بریلوی واہل حدیث ہے یا نقشبندی، تو تمام ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ اس کی نجات نہیں ہوگی۔

امت کا المیہ: امت کا انتشار جس سے عالم اسلام آج کرہ نار بنا ہوا ہے اس میں دو طرح کی گروہ بندیاں نظر آتی ہیں۔

ایک گروہ کے وہ فرقہ باز ہیں جن میں الحاد گھس آیا ہے اور تجدد کے نام پر قرآنی آیات کی من مانی تاویل اور دینی مسائل کی خود ساختہ تشریح کرتے ہیں۔ اور distortion تحریف بھی۔ رسولِ اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ ایک ماڈل کے طور پر انہیں ایک لحظہ پسند نہیں۔ یہ اسوہ ان کے نزدیک کیا حیثیت رکھتا ہے وہ ان کے حلیوں، باتوں، تحریروں یا مشتعل نفسیات سے بخوبی جانا جاسکتا ہے۔ اہلِ دین کو گالیاں دے کر، انہیں برا بھلا کہہ کے، ان کے مقام ومرتبہ کو گرا کر اور نفرت آمیز تحریریں پیش کر کے یہ اپنا چھوٹا قد اونچا کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف اسلام کا بڑا خیر خواہ، داعی اور بزعمِ خویش بڑا صاحب بصیرت وہمدرد بھی خود کو سمجھتے ہیں اور اپنے نفس کی شرارتوں کو چھپاتے ہیں۔ انہیں پرکھنا ہو تو ان کے حلیوں، باتوں اور عملوں کو سیرتِ رسول کے سامنے رکھ کر پرکھ لیجئے۔ بآسانی معلوم ہو جائے گا کہ یہ کس طبقے کے لوگ ہیں۔ اور کس کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں؟

دوسرا گروہ وہ ہے جو اپنی دھڑے بندیوں اور فقہی مسالک میں منقسم ہے۔ ان میں باعمل، نیک، متقی اور متواضع بزرگوں کی کمی نہیں۔ جو خوفِ خدا بھی رکھتے ہیں۔ اور امتِ رسول کا درد بھی۔ مگر دھڑے بندی کی سب سے بڑی کمزوری کو وہ اپنے لئے سب سے بڑی طاقت وحمایت سمجھتے ہیں۔ ان میں بڑے قد کاٹھ کے علماء بھی شامل ہیں۔

ان مذہبی بزرگوں اور دوسرے آزاد منش طبقے سے ایک عاجزانہ سوال یہ ہے کہ ایک غیر مسلم اگر اسلام قبول کرنا چاہے تو کیا یہ مسالک اور ہماری عصبیتیں و مادر پدر آزادی اس کے اسلام کی قبولیت میں کشش کا باعث بنیں گی یا نفرت کا؟ جب کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ نارتھ امریکہ، جاپان ودیگر غیر مسلم ملکوں میں لوگوں کی اکثریت اسلام قبول کرنے سے اس لئے باز رہی کہ مسلکی عصبیتوں نے وہاں جو رنگ دکھائے وہ ناقابل بیان ہیں۔ اور مسلمانوں کی آزادی و بے راہ روی نے جو انہیں شرمندہ کیا وہ الگ المیہ ہے۔ ہمارے اخلاق ورویے کو دیکھ کر وہ توبہ توبہ کرتے ہوئے یہ سوال کرتے ہیں کہ کون تم میں مسلمان ہے اور کون کافر؟۔ یہ مادر پدر آزادی جو تمہارا اسلام دیتا ہے اور جو آزادی مغرب دے رہا ہے آیا ان دونوں میں کوئی فرق بھی ہے؟ اگر نہیں ہے تو ہم بھلے ہی سہی ورنہ ہمیں تو تمہارے اسلام سے شرم آتی ہے۔ بتایئے آپ کے پاس کون سا اسلام ہے؟ اللہ کا دیا ہوا دین یا اپنا حزبی مذہب؟

☆...... کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ان تمام فرقہ بندیوں کو خدا حافظ کہہ کے قرآن وسنت رسول کی بنیاد پر ہم ایک ہو جائیں؟ اگر حکومت وقت بھی تھوڑی سی مخلصانہ دلچسپی لے تو معتدل مزاج، صاحب مروت، روادار، صحیح معنوں میں عالم اور قدیم وجدید پر گہری نظر رکھنے والے علماء پر مشتمل ایک اعلیٰ اختیاراتی بورڈ بنائے جو مدارس، سکول وکالج اور

یونیورسٹیز کا نصاب مسلکی بنیاد پر نہیں بلکہ دینی اور دنیوی واخروی بہتری کے لئے بنائے تا کہ مستقبل کی نسلیں تعصّبات کی بجائے دینی محبت اور حمیت لے کر اٹھیں۔ اسی طرح یہ بورڈ ہر فقہ سے فائدہ ضرور اٹھائے مگر قرآن وسنت کو زندہ کرے۔ یہ نہ اجتہاد کی دعوت ہے اور نہ مذاہب خمسہ کے خلاف علم بغاوت۔ یوں تقریب بین المذاہب کی کوششیں کامیاب ہوسکتی ہیں اور بتدریج تعصب کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اس بورڈ کو قرآن مجید کا یہ اصول بطور ایک ماٹو کے ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوا دِيْنَهُمْ وَكَانُوا شِيَعاً لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ﴾ (الانعام: ۱۵۹) بے شک جن لوگوں نے اپنے دین میں تفریق کی اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

☆☆☆☆☆

الھدیٰ پبلی کیشنز کی مطبوعات

کتب

- قرآن مجید (اردو لفظی ترجمہ)
- منتخب آیات قرآنیہ
- منتخب سورتیں
- منتخب سورتیں اور آیات
- تعلیم القرآن القراءۃ والکتابۃ
- قرآن کریم اور اس کے چند مباحث
- حدیث رسولؐ ایک تعارف ایک تجزیہ
- حفاظت حدیث کیوں اور کیسے؟
- قال رسول اللہ ﷺ
- رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا
- صدقہ وخیرات
- حسن اخلاق
- فتنوں کے دور میں کیا کرنا چاہیے؟
- محمد رسولؐ اللہ معمولات اور معاملات
- عربی گرامر
- اسلامی عقائد
- فقہ اسلامی ایک تعارف ایک تجزیہ
- میرا جینا میرا مرنا
- آخری سفر کی تیاری
- بیوگی کا سفر
- ابوبکر صدیقؓ
- والدین ہماری جنت
- حصول علم اور خواتین

پمفلٹس

- نماز باجماعت کا طریقہ
- نمازِ فجر کے لیے کیسے بیدار ہوں؟
- جمعہ کا دن مبارک دن
- نماز استسقاء
- درود وسلام۔۔۔ الصلاۃ علی النبی ﷺ
- غسل میت اور کفن پہنانا
- اظہار محبت کیسے؟
- ان حالات میں کیا کریں؟

دعائیں

- قرآنی اور مسنون دعائیں
- وایاک نستعین
- نماز کے بعد کے مسنون اذکار
- نماز تہجد کے لیے دعائے استفتاح
- حصول علم کی دعائیں
- فہم قرآن میں مددگار دعائیں
- استغفر اللہ (کارڈ)
- مقبول دعائیں
- استخارہ کیوں اور کیسے (کارڈ)
- میت کی بخشش کی دعائیں (کارڈ)
- صالح اولاد کے لیے دعائیں (کارڈ)
- حفاظت کی دعائیں (کارڈ)
- دشمن کے شر سے حفاظت کی دعائیں (کارڈ)

اسلامی مہینے

- محرم الحرام
- صفر کا مہینہ اور بدشگونی
- رجب اور شب معراج
- شعبان المعظم (بک لٹ)
- شہر رمضان (کتاب)
- رمضان کی دعائیں (کارڈ)
- روزے کے احکام (پمفلٹ)
- رمضان المبارک اور خواتین (بک لٹ)
- عیدالفطر (پمفلٹ)
- حج بیت اللہ (بک لٹ)
- رہبر حج (کارڈ)
- زادراہ حج وعمرہ کی دعائیں (بک لٹ)
- لبیک عمرہ (پمفلٹ)
- عشرہ ذوالحجہ، عیدالاضحیٰ اور قربانی (پمفلٹ)
- تکبیرات (کارڈ)
- عشرہ ذوالحج میں کرنے کے کام
- عیدکارڈز

پوسٹرز

- نماز فجر کے لیے کیسے بیدار ہوں؟

سنیئے اور سنوایئے

عبادات

- نماز فرض ہے۔
- نماز کیا سکھاتی ہے؟
- نماز میں خشوع کیسے؟
- نماز تہجد قرب الٰہی کا ذریعہ
- آیئے نماز سیکھیے

اللہ میرا رب

- آیۃ الکرسی
- اللہ تیرا شکر
- اللہ کے محبوب بندے
- اللہ ہی کے ہو کر رہو
- اللہ کا رنگ بہترین رنگ
- اللہ کی قدر پہچانو
- انسان اللہ کا محتاج
- شکر گزاری کے طریقے
- دوڑو اپنے رب کی طرف

باہمی تعلقات

- صلہ رحمی
- السلام علیکم
- حقوق العباد
- رشتوں کو جوڑیے
- عدل، احسان، صلہ رحمی
- مسلمان کیسا ہوتا ہے؟
- خوشگوار باہمی تعلقات
- دوستی

پردہ

- لباس وحجاب
- پردہ کیوں کریں؟

اخلاقی خوبیاں

- اچھی نیت اچھا پھل
- اجنبی لوگ
- دل کی باتیں
- جب حیا نہ رہے
- نیکی کیا ہے؟
- نرم مزاجی
- صبر بہت ضروری ہے
- سچے مومن
- سادگی میں آسانی
- توکل علی اللہ
- قوی مومن، کمزور مومن
- ارادے جن کے پختہ ہوں
- رحمان کے بندے

اخلاقی برائیاں

- غیبت، بدگمانی اور تجسس
- فضول باتیں کس کے لیے؟
- غصہ جانے دو
- حسد کی آگ
- حرص وہوس دین کے دشمن
- اتراؤ مت
- خود فریبی
- خود پسندی
- منافق کون؟
- مذاق نہ اڑاؤ
- شہرت کے طالب
- شراب اور جوا

انفاق فی سبیل اللہ

- صدقہ کرنے سے مال کم نہیں ہوتا
- محبوب کے لیے محبوب چیز
- فائدہ مند تجارت

بچوں کی تربیت

- آگ سے بچاؤ خود کو اور گھر والوں کو
- مجھے جینے دو
- بچے کی پرورش پہلا قدم

دعوت وتبلیغ

- آؤ جھک جائیں
- اللہ کے مددگار
- اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں
- برائی کو روکو
- چنے ہوئے لوگ
- امتحان تو ہوگا
- انسان اللہ کی نظر میں
- اتحاد کیسے ممکن ہے؟
- اب بھی نہ جاگے تو

جادو اور جنات

- جادو حقیقت اور علاج
- آسیب، جادو نظر بد کا شرعی علاج
- شیطان کھلا دشمن
- شیطان کے ہتھکنڈے

مالی معاملات

- وراثت کی تقسیم فرض ہے
- سود حرام کیوں؟

آداب

- گفتگو کا سلیقہ
- مہمان نوازی
- سفر کیسے کریں؟
- دعوتیں اور تحفے

نوٹ: ڈاکٹر فرحت ہاشمی کے یہ لیکچرز کیسٹس، سی ڈیز اور ویب سائٹ پر سنے جا سکتے ہیں

مصنف کا تعارف

ملتان کے علمی وتدریسی خانوادے سے ان کا تعلق ہے۔۱۳۹۷ھ میں اپنے والد محترم شیخ الحدیث ابوالطیب شمس الحق مسعود رحمہ اللہ سے درس نظامی مکمل کیا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۹۸۰ء میں ایم۔اے۔عربی کیا۔۱۹۸۳ء میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے کلیہ اصول الدین سے منسلک ہوگئے۔۱۹۸۹ء میں گلاسگو یونیورسٹی سے علم حدیث میں پی۔ایچ۔ڈی کی۔۱۹۹۸ء میں ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ قرآن وحدیث میں آگئے۔۲۰۰۰ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں بطور پروفیسر آف حدیث اور چیئرمین شعبہ حدیث وسیرت کے تقرری ہوئی۔سنہ۲۰۰۲ء میں اپنی دیگر مصروفیات کی بنا پر استعفی دے دیا۔عربی، اردو، انگریزی زبان میں بہت سے آرٹیکلز لکھے۔چند کتب کے مصنف بھی ہیں۔

الھدیٰ پبلی کیشنز

اسلام آباد